آجکل
31 MAY 1947
ہندوستان

ایک تھے شیخ صاحب اور دوسرے تھے خاں صاحب۔ شیخ صاحب نے خاں صاحب کی دعوت کی۔ کھانے پر دونوں بزرگ بیٹھے تو شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ اگر خاں صاحب نے خالی الذہن ہو کر کھانا کھانا شروع کیا تو کھانے کی خیر نہیں۔ چنانچہ شیخ صاحب نے فرمایا، اور کیوں خاں صاحب روہیلوں کی لڑائی میں آپ نے دشمنوں کو کس طرح نیچا دکھایا؟ خاں صاحب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اور آپے سے باہر ہو کر جنگ روہیلہ کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ کھڑے ہو ہو کر پینترے بتاتے، کبھی نعرے لگاتے کبھی خیالی دشمن پر ایسا وار کرتے کہ شیخ صاحب دسترخوان کی ایک طرف دبک جاتے۔ غرض خاں صاحب ابھی دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ہی رہے تھے کہ شیخ صاحب نے کھانے کا ستھراؤ کر دیا۔ خاں صاحب آپے میں آئے تو دیکھا کہ شیخ نے نقشۂ جنگ ہی بدل دیا ہے۔ اور دسترخوان پر نہ کشتے باقی ہیں نہ پشتے اور نہ کہیں مال غنیمت کا نشان۔ ناچار خون کا گھونٹ پی کر بھوکے اٹھ کھڑے ہوئے۔

دوسرے دن خاں صاحب نے شیخ صاحب کی دعوت کی۔ کھانا چنا گیا۔ دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھے کھانا شروع ہوا تو خاں صاحب نے فرمایا۔ کیوں بھئی شیخ صاحب، یوسف زلیخا کی داستان بڑی مشہور ہے۔ میں نے تفصیل سے نہیں سنی۔ ذرا سناؤ تو سہی۔ شیخ نے دسترخوان پر سے توجہ ہٹائے بغیر کہا ارے میاں خاں صاحب کوئی قصہ میں قصہ بھی تو ہو۔ سوا تضیع اوقات کے کچھ بھی تو حاصل نہیں۔ خاں صاحب نے شیخ کی اس بے توجہی یا سرد مہری کو مشتبہ اور کسی قدر مایوسی کی نظر سے دیکھا۔ پھر بولے، یار ہرج ہی کیا ہے۔ یہ قصہ بچپن میں سنا تھا، اب بھول گیا ہوں، کچھ تو سناؤ تفریح ہی رہے گی۔ شیخ صاحب نے پورا کوفتہ منہ میں رکھا اور ایک بھرپور بڑا چمچہ بریانی کا اس کے تعاقب میں روانہ کرتے ہوئے کہا، خاں صاحب بات کچھ نہیں۔ واقعہ صرف اتنا تھا۔

پیرے بود پسرے داشت گم کرد باز یافت!
اللہ اللہ خیر سلا۔ ذرا میٹھے کی قاب بڑھانا!

رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

اردو کے اس مایۂ ناز ادیب اور طنز نگار کی شخصیت اور ادبی حیثیت سے متعلق پروفیسر آلِ احمد سرور کا مقالہ اسی شمارے میں ملاحظہ کیجئے

امن و عافیت کی اپیل

"ہم صد درجہ اظہارِ افسوس کرتے ہیں قانون شکنی اور ہنگامہ پروری کے ان موجودہ حادثات پر جو ہندوستان کی بے داغ پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوئے، نیز بے گناہ اور معصوم لوگوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے، قطع نظر اس سے کہ ان میں ظالم کون تھا اور مظلوم کون۔

ہم سیاسی اغراض کے حصول میں طاقت کے استعمال کو ہر حالت میں برا سمجھتے ہیں۔ اور ہندوستان کے تمام فرقوں سے خواہ وہ کسی عقیدے کے حامی ہوں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہنگامہ پروری اور قانون شکنی کے افعال سے انحراف کریں بلکہ تقریر و تحریر میں ان تمام اشتعال انگیز باتوں سے جو ان افعال کا سبب بن سکتی ہوں، احتراز کریں۔"

محمد علی جناح — ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء — موہن داس کرم چند گاندھی

پروڈیوسر ڈائرکٹر سبطین فضلی کی جدید پیشکش
مہندی
بہترین اداکاروں کا اجتماع
موسیقی: غلام حیدر
گانے اور مکالمے: ساغر نظامی
دوسری جدوجہد: خاتون — گڑیا — اور — آوارہ
جاری کردہ: فضلی فلمز — رتن والا دادر — بمبئی
تقسیم کنندگان
نگار پکچرز دہلی (اینڈ یوپی)
کلکتہ فلم اکسچینج - بمبئی
ایور نیو پکچرز پشاور (پنجاب)
دی دکن فلم اکسچینج - حیدرآباد دکن (جنوبی ہند)

فاسد مادّہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

اس یونانی نظریہ کی تائید میں جب اکٹر پیٹنکوفر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے یہ عملاً ثابت کر لیا کہ فاسد مادے کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انہوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے۔ جو ایک پوری جمعیت کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا۔ مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا؟ صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔

دوا سے جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ صافی ان اصولوں کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

استعمال کیجئے

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

کتابی دُنیا لمیٹڈ۔ دہلی

یہ دارالاشاعت" مشترکہ سرمایہ کی ایک کثیر رقم سے جاری ہوا ہے۔ اس میں ملک کے بہترین اہل قلم، ممتاز مصنفین اور مایہ ناز ماہرین تعلیم شامل ہیں

ڈائرکٹروں کا بورڈ

ڈاکٹر سید عابد حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ڈاکٹر تاراچند شیخ الجامعہ الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد۔ معین الدین حارث صاحب۔ دہلی پریس بمبئی۔ رگھو نندن سرن صاحب پیارے لال اینڈ سنز دہلی۔ راج ہنس بہادر صاحب ہلی کلاتھ مل۔ دہلی۔

ادبی مشیر

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)
ڈاکٹر غلام یزدانی

سر عبدالقادر
خواجہ غلام السیدین
مرزا جعفر علی خاں اثر
پروفیسر مسعود حسن ادیب

ڈاکٹر عابد حسین
ڈاکٹر تاراچند
پروفیسر آل احمد سرور
پروفیسر رضی الدین صدیقی

سر شانتی سروپ بھٹناگر
بشیر احمد ہاشمی صاحب
پروفیسر رشید احمد صدیقی

اس ادارہ کے ماتحت ایک مکتبہ بھی قائم ہے جس میں اپنی مطبوعات کے علاوہ دوسرے ناشرین کی مطبوعات نہایت کاوش سے انتخاب کر کے جمع کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ہر صنف علم کی کتابوں پر مشتمل ہے جو ارباب ذوق کو مناسب قیمت پر مہیا کی جاتی ہیں۔ اس ادارہ کا اصل مقصد علم و ادب اور تعلیم کی خدمت ہے۔

ہماری مطبوعات

مزامیر یعنی انتخاب میر از اثر لکھنوی۔ میر تقی میر۔ اردو کے آسمان شاعری کا مہر منیر ہے جس کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور کے شعراء نے تسلیم کیا ہے۔ کلام میر کا اس سے بہتر انتخاب اب تک شائع نہیں ہوا۔ اثر لکھنوی کے مقدمہ اور ڈاکٹر امر ناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے مقالے نے اس انتخاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

ذاکر صاحب از رشید احمد صدیقی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی شخصیت اور سیرت کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ مبلغ و ممدوح دونوں میں سے کوئی بھی محتاج تعارف نہیں۔ ایک ہندوستان کا مایہ ناز ماہر تعلیم اور دوسرا صف اول کا ادیب۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

گنجہائے گرانمایہ از رشید احمد صدیقی۔ یہ مضامین ملک کی بعض مقتدر ہستیوں اور چند دوستوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ آپ نے ظرافت کے میدان میں تو رشید صاحب کی جودت طبع کی اکثر داد دی ہے، اب ذرا ان کے سنجیدہ طرز نگارش اور انسانی سیرت کے مرقعوں کو بھی دیکھئے۔ یادگار مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے

سازِ ہستی محترمہ صالحہ عابد حسین کا شاہکار۔ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ جس میں اپنی سماجی اور گھریلو زندگی کی سچی اور دردمندانہ تصویر اور پر خلوص تنقید ملتی ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

بات چیت صالحہ عابد حسین کی ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ۔ اس کتاب میں محض بات چیت ہی نہیں بلکہ بلند پایہ ادب بھی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

تنقید کیا ہے از آل احمد سرور (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) اس کتاب میں مصنف نے حالی، شبلی، اقبال، سر رتن ناتھ سرشار کے کارناموں کو تنقید کے جدید اصولوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ جدید ادبی مسائل، ادبی تحریکوں کا تجزیہ کیا ہے اور آخری مضمون میں اصول تنقید کو نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے

عذرا (ناول) از صالحہ عابد حسین۔ ایک سماجی اور معاشرتی ناول جس میں متوسط طبقہ کی زندگی کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ناول کی ہیروئن عذرا کا کردار اس عہد کی خواتین کے ترقی پسند طبقے کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ وہ جہاں عورت کے حقوق کیلئے جد و جہد کرتی ہے۔ وہاں اپنے عزم و استقلال اور ایثار و وفا سے ایک قابل تقلید مثال بھی قائم کرتی ہے۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے

ہلاکِ فریب مترجمہ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ یوپینڈ کے مشہور شاعر سگمنڈ کرانسکی کے ڈرامے "دی ان ڈیوائن کامیڈی" کا سلیس ترجمہ جو اصل ڈرامے کے ساتھ زور کلام اور حسن و خوبی کا حامل ہے۔ اس ڈرامے میں طبقۂ امراء کے ایک نمائندے کے حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے اور انفرادی حکومت اور جمہوریت دونوں کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو غیر جانبداری سے پیش کیا گیا ہے۔ کرانسکی کے نزدیک شخصی اور سیاسی زندگی کی کشمکش کا آخری حل خلوص باہمی اخوت، مفاہمت اور محبت کی بنیادی نیکیوں میں ہے۔ ڈرامے کا ترجمہ تقریباً ہر یورپی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

کتابی دنیا لمیٹڈ۔ فیض بازار۔ دہلی

"نئے اور پرانے چراغ"

نئے اور پرانے چراغ آل احمد سرور کے پندرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا ہر مضمون ایک طویل مفصل اور جامع تنقید ہے۔ ان مضامین میں غالب کے زمانہ سے لیکر موجودہ زمانہ تک کی اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ گویا اردو شاعری کی پوری ایک صدی ان تنقیدی صفحات کا موضوع ہے۔ ایک صدی کے اندر اردو شاعری میں جو مختلف دور آئے، جو تحریکیں برپا ہوئیں، جو تغیرات رونما ہوئے، جن نئے رجحانات نے جنم لیا اور جن قدیم میلانات نے دم توڑا ان سب کا تفصیل اور گہرائی کیساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کے مختلف پہلوؤں کو ہر جگہ سیاسی سماجی اور تمدنی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پر رونق ادبی محفل میں نئے چراغ بھی ہیں اور پرانے چراغ بھی۔ اگر ایک طرف غالب اکبر اقبال، فانی اور انکے معاصرین ہیں تو دوسری طرف جوش سے لیکر آزاد نظم اور نظم معریٰ کے لکھنے والوں تک نئے دور کے ہر اسکول اور ہر رنگ و اسلوب کے شاعر بھی موجود ہیں۔

سرور صاحب کی تنقیدوں کا سب سے دلپذیر پہلو ان کا انشا پردازانہ حسن ہے جس کی جھلکیاں آپکو اس مجموعے کے ہر صفحے پر نظر آئیں گی۔

ہماری دوسری نئی کتابیں

- مجاہد مراکش — از حسن الاعظمی — [illegible]
- ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسائل — مرتبہ سعید انصاری — [illegible]
- تعلیم اور سماج — از 〃 — [illegible]
- نوائے حیات — از یحییٰ اعظمی — للعہ/
- دنیائے تبسم — از شوکت تھانوی — [illegible]
- امریکہ کے بچے — از عزیز احمد — عہ/
- غالب کے لطیفے — از انتظام اللہ شہابی — [illegible]
- ہندوستان کا اتحاد — از جواہر لال نہرو — [illegible]
- افادی ادب — از اختر انصاری — [illegible]
- سیاسی نظریے — مترجمہ نور الحسن ہاشمی — عہ/
- عربی اردو ڈکشنری حصہ اول — از حسن الاعظمی — [illegible]

ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ:- **حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار (اے) دہلی**

اردو کا پندرہ روزہ باتصویر رسالہ

آجکل

سالنامہ ۱۹۴۷ء

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے

جلد ۶ نمبر ۱

قیمت سالنامہ عہ

فہرست

منظومات

مدیر اعلیٰ	نائب مدیر	مدیران
سید وقار عظیم	فضل حق قریشی	سید آفاق حسین آفاق
ایم اے	دہلوی	بی اے

کچھ اپنی باتیں

"آج کل" کا پانچواں سالنامہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ آج اس نے اپنی عمر کے پانچ سال پورے کرکے چھٹے سال میں قدم رکھا ہے۔ اس پانچ سال میں آج کل آپ کی خدمت میں جو کچھ پیش کرتا رہا ہے اسے آپ کی شفقت، محبت اور حوصلہ افزائی نے برابر سراہا ہے اور ناظرین اور معاونین کی یہی شفقت اور حوصلہ افزائی ہے، جس نے آج کل کے ارادوں کو بلندی اور اس کے قدموں کو استقامت بخشی ہے۔ ارادوں میں بلندی اور قدموں میں استقامت ہو تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ "آج کل" نئے زمانہ کے ہر گرم دور میں اپنی خصوصیات کو قائم رکھا ہے ——— اس نے آپ کو اپنے ہمسایہ ملکوں کے متعلق طرح طرح کی علمی اور ادبی، تہذیبی اور تمدنی باتیں بتاکر دلوں کو زیادہ قریب کیا ہے، اب دوسرے دلوں کی دھڑکنیں دور کی آواز معلوم ہونے کے بجائے خود ہمارے دلوں کی پکار بن گئی ہیں، تہذیب و تمدن کے پرانے رشتوں میں اب ایک نیا رنگ اور نکھار پیدا ہو چلا ہے۔ "آج کل" کی تصویریں، اس کی رفتار زمانہ، اس کا نقد و نظر یہ تینوں چیزیں آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی ہمنوائی کرنے والے ادب کی بے لاگ اور بے باک مصوری اور ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ پھر "آج کل" کا ہر پرچہ ہر طرح کا علمی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بوقلموں گلدستہ بن کر آپ کی خدمت میں آیا ہے۔ اور اس گلدستہ کو بوقلمونی اور رنگینی دینے کے لئے ہر طرح کے لکھنے والوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ پچھلے سال کے پرچوں پر ایک نظر ڈالئے تو "آج کل" کی بزم میں آپ کو ہر نوع کے لکھنے والے جلوہ فرما نظر آئیں گے ——— ایسے لکھنے والے جو اب بزم ادب میں چراغ سحری ہیں اور ان کی کہی ہوئی ہر بات ہمارے لئے ایک ادبی تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے، ایسے لکھنے والے جو ادب کی بزم کو نت نئے جلووں سے معمور کرنے کو اپنا منصب جانتے ہیں۔ ادیب، شاعر، فلسفی، تعلیم اور معاشیات کے ماہر جن کی آواز اپنی دنیا میں سب سے اونچی آواز ہے اور جن کی کہی ہوئی بات کو سننے والوں کے لئے دامن میں سمیٹا ہے۔ فخر کی بات ہے کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے "آج کل" کے صفحات کو نہ نوازا ہو۔ ان لکھنے والوں کے علاوہ آپ نے اس بزم میں بہت سے ایسے لکھنے والوں کو بھی شریک دیکھا ہوگا، جن کا نام شاید اس سے پہلے کبھی آپ تک نہیں پہنچا۔ "آج کل" ہمیشہ ایسے لکھنے والوں کا خیر مقدم کرتا رہا ہے اسے اپنی اس خدمت پر فخر بھی ہے ——— ادارۂ آج کل اب بھی ان نئے لکھنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور ان قلمی معاونین کی خدمت میں جو علم و فن، شعر و ادب اور ذکر و فکر میں ہمارے رہنما اور ہماری ذہنی اور اخلاقی زندگی کی کشتی کے ناخدا ہیں، سچے دل سے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔ یقین ہے کہ ہمارے ناظرین بھی اس ہدیۂ تشکر میں ہمارے ہمنوا ہوں گے۔

پچھلے سال بھی کبھی آپ کو "آج کل" سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ وہ وقت سے کچھ بعد حاضر خدمت ہوا۔ ہم اپنی برأت میں کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن اس بات کا ساتھ ہی چونکہ ملک کے بعض ایسے حالات سے ملتا ہے جن کا تصور بھی ذہن اور روح پر ایک بار گراں ہے۔ اس لئے ہم اپنی معذرت اس بے تاب آرزو کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ صلح و آشتی کی جس کرن کی اس وقت زندگی کو تلاش ہے "آج کل" بھی اس کا پیامی بن سکے۔ اس کا سب سے بڑا منصب اسی کرن کی تلاش ہے۔ اگر اس کی یہ آرزو پوری ہو سکے تو پھر آپ کو بھی انشاء اللہ اس شکایت کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ کبھی کبھی آپ کو دیر میں کیوں ملتا ہے۔

اب کچھ اس سالنامہ کے متعلق۔ سالنامہ کے تین الگ الگ حصے ہیں نظم کا حصہ، افسانوں کا حصہ اور مضمونوں کا حصہ۔ ان تینوں حصوں میں آپ کو اپنے محبوب ترین شاعروں، افسانہ نگاروں اور مقالہ نگاروں کے فکر و تخیل کے فرح بخش تصور زا اور سبق آموز نمونے ملیں گے۔ "آج کل" کو اس بات پر صد درجہ شکر و ناز ہے کہ وہ اپنے ملک کے اتنے اصحاب فکر و تخیل کو اس بزم میں شریک کر سکا۔ لفظ ممنونیت کے اس جذبہ کی ترجمانی سے قاصر ہیں، جو محبت اور شفقت کے اس سلوک سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن فخر و مسرت کے اس بے پایاں جذبے میں شرمساری کی ایک کھٹک بھی ہے ——— بہت سے حضرات نے ہماری درخواست پر اپنے قیمتی افسانے اور مقالے ارسال کرنے ہم نے اعلان بھی کیا کہ وہ افسانے اور مقالے سالنامہ میں شامل کئے جا رہے ہیں لیکن صفحوں کی تنگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمیں ان میں سے کئی چیزیں روکنی پڑیں۔ ہم اس کوتاہی کیلئے فاضل مضمون نگاروں کے شرمسار اور محجوب ہیں لیکن ناظرین کو ہم یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ افسانے اور مضمون "آج کل" کے اگلے دو تین پرچوں میں [illegible] ہوں گے اور اس طرح [illegible] گویا سالنامہ کا [illegible]

جون ۱۹۴۶ء سے اب تک موت نے ہمارے خزینۂ ادب سے کئی بیش بہا جواہر ہم سے چھین لئے۔ "آج کل" ان کے غم میں سوگوار رہا ہے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے اور ان کی چھوڑی ہوئی روایتیں زبان و ادب کو ترقی کی نئی شاہراہیں دکھائیں ——— سب سے تازہ غم ملک کے نامور ادیب صاحب طرز انشا پرداز اور مایۂ ناز طنز نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا ہے جنہوں نے ۲۷ اپریل کو حیدرآباد میں جان شیریں جان آفریں کے سپرد کی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

"آج کل" میں عنقریب مرحوم کی شخصیت اور ادبی حیثیت پر مقتدر ارباب قلم کے مقالے پیش کئے جائیں گے۔

تضمین میر حسن بر غزل میر

دل کی فرقت کا الم وہم رہا — ایک دن اس بن نہیں خرم رہا
ساتھ میرے دم کے یہ ماتم رہا — غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

ہیں ترے رخسار نخل قد کے سیب — دیکھ کر ان کو نہ رہتا تھا شکیب
دی تجھے سبزے نے بھی جدا گانہ زیب — حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

شیشہ و ساغر نہ تھا یہ لے فلک — کیا بساط اس کی جو یہ پڑتا چھلک
آنسوؤں کی سی کہاں آمیزش علک — دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

ہونٹھ وہ عیسیٰ ثنا جنکی کہے — پانی پانی قند ہو کر واں بہے
قسمت الٹی دیکھ یہ کچھ دکھ سہے — اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آب حیواں سم رہا

عشق جب دو دل میں آ کرتا ہے راہ — ہوتی ہے معشوق کو عاشق کی چاہ
گر نہ ہوئے یہ تو ہو کیونکر نباہ — خیمہ گو لیلیٰ کے سینے ہیں سیاہ
اس میں مجنوں کا گر ماتم رہا

رقت آگے یہ بہت جس تس میں تھی — دھوم رونے کی ہر اک مجلس میں تھی
لیک یہ تاثیر گریہ کس میں تھی — میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

نیک ظاہر میں ہے باطن میں دغا — گو پھرا اس جبہ سے کعبہ تو کیا
کیا ولایت میں نہیں ہوتا گدھا؟ — جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

تھے حسن کی طرح جو روشن ضمیر — روز روشن اٹھ گئے برنا و پیر
خواب غفلت نے کیا تجھ کو اسیر — صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

مرسلہ: عبد العلیم شیر کوٹی

تبرکات

فصاحت جنگ جلیل (مرحوم)

آخرش بیتابیاں راحت کا ساماں ہو گئیں
اُلجھنیں اتنی بڑھیں زلفِ پریشاں ہو گئیں

طوق کیا زنجیر کیا، جب اُٹھ چلا دستِ جنوں
پھر تو ساری ہستیاں میرا گریباں ہو گئیں

کیا اثر موسم کا ہے، گرگر گھٹا سی باغ میں
بجلیاں گل ہو گئیں گل سے گلستاں ہو گئیں

یہ غلط ہے حسن کو کچھ عشق کی پروا نہیں
آہ کی میں نے تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

میں کوئی گلچیں نہیں لیکن جو آئی فصل گل
پھول سب کھل کر مرے دامن کی کلیاں ہو گئیں

حسن دیکھا ہے بہت لیکن وہ صورت اور ہے
پردہ اٹھا بھی نہیں اور آنکھیں حیراں ہو گئیں

پھول کیا کوئی حسیں کیا جب سے آئی ہے بہار
پیاری پیاری صورتیں سب آفتِ جاں ہو گئیں

حسرتوں کا سلسلہ کب ختم ہوتا ہے جلیلؔ
کھل گئے جب گل تو پیدا اور کلیاں ہو گئیں

دو غزلیں

ثاقب لکھنوی

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لیے
وگرنہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لیے

شبِ فراق کی روداد آفتیں توبہ
یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لیے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا
مکان وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لیے

نہ آنکھ بند کروں میں تو کیا کروں یارب
وہ آ رہے ہیں تماشائے جاں کنی کے لیے

قفس میں آج تماشا ہے غم ہے قابلِ دید
تڑپ رہا ہوں میں صیاد کی خوشی کے لیے

قفس میں چپ نہ رہوں میں تو کیا کروں کہ یہ قید
نہ دوستی کے لیے ہے نہ دشمنی کے لیے

تمام بزم میں چھایا ہوا ہے سناٹا
چھڑا تھا قصۂ دل اک دل لگی کے لیے

فروغِ حسن بڑھا دل کی بے نوائی سے
فقیر ہو گیا شانِ تونگری کے لیے

شکایتِ چمنِ دہر کیا کروں ثاقب
ہوا خلاف ہی لیکن کسی کسی کے لیے

نہ آسمان ہے ساکن نہ دل ٹھہرتا ہے
زمانہ، دامِ گزرنے کا ہی گزرتا ہے

طویل عمر پھر اس پر یہ اشکباریِ دل
نہ ختم ہوتا ہے پانی نہ جام بھرتا ہے

پر آب دیدۂ آئینہ ہو کے پچھتایا
کہ دیکھتا ہے وہی اسکو جو سنورتا ہے

وہ میری جان کا دشمن سہی مگر صیاد
مری کہی ہوئی باتوں پہ کان دھرتا ہے

ہمیں ہیں وہ جو امیدِ وفا پہ جیتے ہیں
زمانہ زندگیِ بے بقا پہ مرتا ہے

ابھی ابھی درِ زنداں پہ کون کہتا تھا
ادھر سے ہٹ کے چلو کوئی نالے کرتا ہے

حریف بزم میں چھیڑا کریں مگر ثاقب
وہ دل جو بیٹھ گیا ہو کہیں ابھرتا ہے

غزل

آرزو لکھنوی

جب چاہا پردہ اٹھوایا جب چاہا پردہ کر بیٹھے
یہ چھیڑ اور اک سودائی ہے معلوم نہیں کیا کر بیٹھے

تسکین نہ دی الزام دیا کیا کرنا تھا کیا کر بیٹھے
اب کون ہے شکل صفائی کی آئینہ تو اندھا کر بیٹھے

دنیا والوں سے نہیں شکوہ غیروں کا سہارا کیوں ڈھونڈھا
جس بزم میں اپنا کوئی نہ تھا اس بزم میں کیوں آ کر بیٹھے

چاہت سے بھری للچائی نظر کیا من لا کے چھپاتی ہے
جب اٹھے جھلا کر اٹھے جب بیٹھے شرما کر بیٹھے

یا اپنی نشانی لے آؤ - یا دل ہی غریب کا دے آؤ
بیٹھا ہے جو چرکا کھائے ہوئے ایسا نہ ہو دعوی کر بیٹھے

اس بزم ناز میں آ تو گیا مار آس لگائے چپ کھڑا
ملتی نہیں جب دل ہی میں جگہ بیٹھے تو کہاں جا کر بیٹھے

موجیں ہیں تو پھر کیا طوفاں ہے تو کیا کشتی کس کی ساحل کیسا
ناچار غریق بحر فنا - دنیا سے کنارا کر بیٹھے

نیرنگ جمال ہوشربا وحدت میں ہے کثرت کا دھوکا
کھل کے کہیں اک وارفتہ - ایسا نہ ہو سجدہ کر بیٹھے

ترسا ہوا چشم عنایت کا چپ ہے تو نہ چھیڑو کرتے ہو کیا
ہے آرزو آج بھرا بیٹھا - ایسا نہ ہو جھگڑا کر بیٹھے

غزل

بیخود دہلوی

نگاہوں تک پہنچی جب کسی کے بیکسی اپنی
بھڑک کر بجھ گئی آخر کو شمع زندگی اپنی

تجھے سمجھے تری قدرت کو سمجھے غیر ممکن ہے
حقیقت تو سمجھ سکتا نہیں ہے آدمی اپنی

تصور میں ہیں سب نیرنگیاں حسن و محبت کی
کبھی تصویر انکی کھینچ لیتا ہوں کبھی اپنی

نہ روئے شمع تو یوں کون روئے اپنی ہستی کو
سمجھتی ہے لگن تک ہے حدود زندگی اپنی

یہ نظریں ہیں کہ چھریاں ہیں یہ غصہ ہے کہ خنجر ہے
ذرا دیکھو تو آئینے میں شانِ برہمی اپنی

برا ہو سوزِ فرقت کا کیا فولاد کو پانی
ترے پیکاں سے برسوں تک رہی دلبستگی اپنی

خدا لیجائے بندے کو یہی وہ راہ ہے سیدھی
عبادت سے زیادہ کام دے گی عاشقی اپنی

نہ حسرت ہے، نہ ارماں ہے فقط چاہت ہی چاہت ہے
سمجھ لیجے محبت ہے تکلف سے بری اپنی

سوالِ وصل پر اس یک نہ شد کو میں نہیں سمجھا
مجھے ہاں ہم غرض ہے رہنے دیجے فارسی اپنی

پسینہ آگیا شرمِ گنہ سے حشر میں ہم کو
غرورِ نفس سے وابستہ نکلی بندگی اپنی

گریباں چاک، آنکھیں سرخ، لگے ہیں دمِ آخر
اٹک کر رہ گئی سینے میں ہچکی آخری اپنی

"پلاتے ہیں وہ خود بیخود کو بیخود خود نہیں پیتا"
گرہ میں باندھ کر رکھیں نصیحت شیخ جی اپنی

غزل

صفی لکھنوی

کیا تم نے وعدہ اور تم شب انتظار آئے
مجھے اعتبار آئے کہ نہ اعتبار آئے

مرے دن پھریں جو ایسی شب انتظار آئے
کہ بیاں بغیر آئے نہ انہیں قرار آئے

ہمہ وقت آمد و شد یہی سلسلہ ہے جاں تک
ابھی بزم دل ستاں سے گئے دو تو چار آئے

اسی انتظار میں ہے پس دفن کشتۂ غم
گل و شمع کاش لیکر کوئی سوگوار آئے

جو اٹھے ہیں مسکراتے ابھی مجلس عزا سے
کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہو سوگوار آئے

فقط اس لئے کہ ان سے نہ بیان کر سکوں کچھ
وہ پئے مزاج پرسی دم احتضار آئے

نہ صدا کہیں سے آئی نہ ترا سراغ پایا
دل گم شدہ بہر سو تجھے ہم پکار آئے

اگر اس طرح ملے بھی تو بتاؤ کیا ملے وہ
کبھی مدتوں نہ آئے کبھی بار بار آئے

جو شکایتیں ہیں باہم انہیں کس طرح گنیں ہم
نہ تمہیں شمار آئے نہ ہمیں شمار آئے

پس موسم جوانی یہ بلائے عہد پیری
وہ خزاں ہے بعد جس کے نہ کبھی بہار آئے

مرے واقعے کو سنکر جو اثر لیا بھی تو کیا
نہ سر جنازہ آئے نہ سر مزار آئے

خم زلف پر شکن میں کششیں ہیں کس بلا کی
جو ذرا کمند کھینچیں ابھی خود شکار آئے

کسے اعتبار ایسے نفس گریز پا کا
جو ہزار بار جائے جو ہزار بار آئے

نہ شرر تھے ہم نہ شبنم مگر اتفاق یہ تھی
کہ اس انجمن میں لیکر دل بیقرار آئے

سر راہ خاک اڑاؤ مگر اک ذرا سمجھکر
کسی دل کے آئینے پر نہ صفی غبار آئے

علم و خبر

سیماب اکبرآبادی

پھولوں سے حجاب اُٹھے سبزہ بھی نکھر آیا
پھر یاد تری آئی، پھر وقتِ سحر آیا

بے راہنما آیا، بے راہ گزر آیا
گو دل میں ترا آنا مشکل تھا، مگر آیا

وہ بانگِ اذاں آئی، وہ پیکِ سحر آیا
پس ماندہ مسافر چل، پیغامِ سفر آیا

میں دیر و کلیسا سے بے سجدہ گزر آیا
سر جھک ہی گیا لیکن جب آپ کا در آیا

وہ پہلے تصور میں، تا حدِ نظر آیا
لی ہنس کے پھر انگڑائی اور دل میں اتر آیا

قربت میں بھی سرشاری دوری میں بھی سرمستی
دیوانہ بہر حالت دیوانہ نظر آیا

یہ دردِ محبت کی کیفیت مجمل ہے
مرنے کا مزہ آیا — اور زندگی بھر آیا

کثرت متحیر ہے اس وحدتِ جلوہ پر
دنیا کو نہیں، تنہا موسیٰ کو نظر آیا

آہ منزلِ الفت میں محروم خرد ہو کر
اب تک جو یہاں آیا، بے علم و خبر آیا

صورت کدۂ دنیا، اور حسنِ نظر میرا
ہر نقش کے پردے میں نقاش نظر آیا

آخر وہ مرے دل میں خندہ بجبیں آئے
رو رو کے دعا مانگی، ہنس ہنس کے اثر آیا

وہ عرش سے دیتے ہیں اب دعوتِ نظارہ
اے ذوقِ نظر وقتِ معراجِ نظر آیا

میرے لئے دنیا بھی میرے لئے عقبےٰ بھی
جس گھر میں غرض آیا، میں اپنے ہی گھر آیا

بے ساختہ یاد آئی بے بال و پری اپنی
جب کوئی مرے آگے ٹوٹا ہوا پر آیا

ہر وقت کا نظارہ، ہر وقت کی محویت!
اک ایسا زمانہ بھی، بے شام و سحر آیا

جلوہ گہہ جاناں کو ہم لوٹ کے لے آئے
لوٹی جو نظر، جلوہ ہمراہ نظر آیا

ہر قطرۂ خوں میرا تحلیل ہوا لیکن
تصویرِ محبت میں اک رنگ تو بھر آیا

اللہ رے بے دردی، دستورِ محبت کی
الزامِ وفا آخر سیماب ہی پر آیا

غزل

جگر مرادآبادی

ہر وہ حلقہ، جو تری کاکلِ شبگیر میں ہے
گوشۂ امن، بلاخانۂ زنجیر میں ہے

شاہدِ روح کہاں - جلوہ گہِ ناز کہاں
خاک مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

کون قاصد یہ سمجھتا ہے دمِ رخصتِ شوق
ربطِ محکم، اسی بے ربطیِ تحریر میں ہے

دل بھی ہے جلوہ گہِ دوست مگر اے واعظ
عیدِ نظارہ، ہلالِ خمِ شمشیر میں ہے

دیکھنا جبرِ مشیّت، کہ یہ قیدِ زنداں
پا تو زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

اپنے سر آپ نہ لیں دلشکنی کا الزام
مجھ کو معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

خود کھچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے
کوئی تو وجہ کشش نالۂ زنجیر میں ہے

چھپ کے پھر دل اسے او دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

غزل

نوح ناروی

آماج گاہِ تیرِ ستم کون ہم کہ آپ
پھر پوچھتے ہیں آپ سے ہم کون ہم کہ آپ

راہِ وفا میں سیکڑوں جھیلیں مصیبتیں
پامالِ مثلِ نقشِ قدم کون ہم کہ آپ

ممکن نہیں بغیر توجہ نکل سکے
کھوتا ہے آرزو کا بھرم کون ہم کہ آپ

دل حسن پر نثار تو کر دوں بجا درست
جھیلے گا اس کے بعد ستم کون ہم کہ آپ

یہ شرط دوستی کی جو ٹھیری تو دیکھئے
دیتا ہے پہلے دل ہی رقم کون ہم کہ آپ

رستے بھی ڈھونڈھئیے یہ تناسخ کا مسئلہ
لے گا دوبارہ پھر سے جنم کون ہم کہ آپ

ایمان میں جو آئے تو سچ سچ بتائیے
بے درد ہے خدا کی قسم کون ہم کہ آپ

سب دل لگی کو پہلے سمجھتے تھے دل لگی
دل دے کے اب اٹھائے الم کون ہم کہ آپ

دنیا سے اٹھ چکا تھا محبت کا اعتبار
قائم کئے ہوئے ہے بھرم کون ہم کہ آپ

دونوں نے اتحاد کی کوشش ضرور کی
لیکن رہا نباہ میں کم کون ہم کہ آپ

اہلِ زمیں بتا نہ سکیں یا بتا سکیں
زیرِ فلک ہے موردِ غم کون ہم کہ آپ

راہِ وفا ہے سامنے لیکن خبر نہیں
پہلے بڑھائے اپنا قدم کون ہم کہ آپ

اسرارِ حسن و عشق سمجھ میں نہ آ سکے
ہم سے ہیں آپ آپ سے ہم کون ہم کہ آپ

بازارِ ذوق و شوق میں اپنے کو جا سمجھئے
چلتی ہوئی وفا کی رقم کون ہم کہ آپ

اب دیکھنا یہ ہے کہ دکھائے جہان کو
لطفِ نیاز و ناز بہم کون ہم کہ آپ

روزِ جزا جو داد طلب ہوں گے دادخواہ
اُس دن کریگا عذرِ ستم کون ہم کہ آپ

کیا لطفِ بندگی جو پرستار ہی نہ ہوں
رونق فزائے دیر و حرم کون ہم کہ آپ

دل کے معاملات پر انصاف کیجئے
دیتا ہے دم بدم اُسے دم کون ہم کہ آپ

عشق و وفا میں فرد ہے کون آپ ہیں کہ ہم
ہے کاملِ جفا و ستم کون ہم کہ آپ

طوفانِ اشکِ نوح کا رکنا محال ہے
انجام دے یہ کارِ اہم کون ہم کہ آپ

غزل

رضا علی وحشت

خرمن ہوس کا موردِ برقِ بلا ہوا — گزرا کوئی کسی کی طرف دیکھتا ہوا

صرفِ وفا ہوا کہ شہیدِ جفا ہوا — اے دل نتیجہ ایک ہے ہونا جو تھا ہوا

میں خاک میں ملا تو ضرر اس میں کیا ہوا — یہ تو ہوا کہ حقِ محبت ادا ہوا

ہر چند اس نے رسمِ تغافل کو راہ دی — شوقِ جنوں مزاج نہ واقف ذرا ہوا

وہ ابتدا کی چشمِ کرم بھولتی نہیں — گو بعد اسکے مجھپہ ستم بار ہا ہوا

شرمندہ ہوگئے گلہ مندانِ بے ادب — اک شرمگیں نگہ سے جو عذرِ جفا ہوا

عبرت کی داستاں ہے بس اے ہمنشیں نہ پوچھ — انجام کاروبارِ تمنا کا کیا ہوا

مجھکو جو اک جہان سے بیگانہ کردیا — یہ کیا اشارہ اے نگہِ آشنا ہوا

آزادیاں نثار اسیری کے لطف پر — گو حلقہ حلقہ زلف کا دامِ بلا ہوا

انکی زبان سے نہ کسی نے کبھی سنا — اک میرا مبتلا تھا خدا جانے کیا ہوا

خود عشق ہی میں مجھکو ملا مدعائے عشق — جو دل کا درد تھا وہی دل کی دوا ہوا

امید ہی نہیں تو تمنا سے کام کیا
وحشت کسی کے در پہ ہے تو کیوں پڑا ہوا

وقت سے پکار

جوش ملیح آبادی

مُہُوٹ پیا وقت ہے آفاق کو بیدار کریں
آؤ پھر تذکرہ کاکُل و رخسار کریں

آؤ پھر سینۂ تمکیں کو تلاطم بخشیں
آؤ پھر قطرۂ شبنم کو شرربار کریں

حلقۂ گُم کہنۂ افکار کے صیدِ نو کو
آؤ پھر کاکُلِ افسوں میں گرفتار کریں

ناظرِ دفترِ پیرانِ خردِ دشمن کو
آؤ پھر لشکرِ خوباں کا علم دار کریں

رہ روِ راہِ تجسّس کو بہ فیضِ باطن
آؤ پھر قافلۂ شوق کا سالار کریں

آؤ پھر معتکفِ بارگہِ حکمت کو
وحشتِ بادیہ پیمائی پہ طیار کریں

آؤ پھر حسن کے پرچم کو فضا پر لہرائیں
آؤ پھر عشق کو رسوا سرِ بازار کریں

مرشدِ سلسلۂ صاعقہ پیمائی کو
آؤ پھر معتقدِ شوخیٔ رفتار کریں

آؤ آزردہ جوانی کو منا کر لے آئیں
آؤ پھر مردِ فگن وقت سے پیکار کریں

آؤ پھر شوق کو دیں گرمیٔ دورِ پیشیں
آؤ پھر شعلۂ خوابیدہ کو بیدار کریں

آؤ پھر مرتبۂ عشق پہ ایماں لے آئیں
آؤ پھر منزلتِ عقل کا انکار کریں

آؤ انفاس کو پھر نکہتِ بستاں بخشیں
آؤ تخئیل کو پھر مصر کا بازار کریں

آؤ پھر کفر کو دیں عشوہ گری کا فرمان
آؤ ایمان کو پھر نقش بہ دیوار کریں

آؤ اس گنبدِ زنگار کے سناٹے کو
پھر کسی شوخ کی پازیب کی جھنکار کریں

سرنگوں ہے قمر، ڈوب رہے ہیں تارے
چشمِ خوں بستہ کو پھر آؤ گہربار کریں

آؤ پھر شوق کو آہنگِ تکلّم دے کر
ذرّے ذرّے کو پھر آمادۂ گفتار کریں

آؤ پھر لیلیٔ احساس و مشامِ جاں کو
عنبر و عود کی لپٹوں کا خریدار کریں

ہو چکی ہے مرضِ عشق سے جس کو صحت
اُس شگفتہ کو پھر خیر سے بیمار کریں

آؤ پھر ولولۂ رفتہ کو دیں دعوتِ رقص
آؤ پھر سطحِ مہ و سال کو ہموار کریں

آؤ اس دام شکن جوشؔ کے دانا دل کو
پھر کسی گیسوئے شبگوں میں گرفتار کریں

آخری سلام

آنند نرائن مُلّا

عاشق سماج سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ لاکر محبوبہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، محبوبہ اسے خط لکھتی ہے

رخصت اے روحِ تمنا! الوداع اے جان شوق
بھولنے والے مرے دے کر مجھے پیمان شوق
میں تمہیں جانے سے روکوں کون ہوں؟ کوئی نہیں

جا رہے ہو کرکے ویراں تم مرا ایوان شوق
بے وفائی کا گلہ لیکن نہیں ایمان شوق
جاؤ، جاؤ شوق سے میرا تو حق کچھ بھی نہیں

میں کسی ماں باپ کی بیچی ہوئی لڑکی نہیں
اندھے گونگے دیوتاؤں کی گواہی لی نہیں
جس کو اپنا میں نے سمجھا اس کو اپنا کر لیا

میں نے عہد عشق میں کوئی تجارت کی نہیں
تم کو سب کچھ دے دیا قیمت کوئی مانگی نہیں
دو دلوں کا مل کے چار آنکھوں نے سودا کر لیا

دل کو سینے میں نہ رکھا میں نے تربت کی طرح
اس سیہ خانہ میں بھی معصوم فطرت کی طرح
یہ مٹاتی ہے انہیں کو عشق جن کا کیش ہے

آرزو کی قدر کی زندہ حقیقت کی طرح
تم سے کی میں نے محبت اور محبت کی طرح
ہائے دنیا کس قدر ناعاقبت اندیش ہے

یوں مگر اڑ جائیں جو سینوں سے تصویریں نہیں
یک بہ یک گر جائیں جو الفت کی تعمیریں نہیں
خود بہ خود دو روز کے تم اک یاد میں کھو جاؤ گے

مٹنے والی دفعتاً سینوں کی تحریریں نہیں
ایک جھٹکے میں جو ٹوٹیں دل کی زنجیریں نہیں
اور اپنی دیر کو تم پھر مرے ہو جاؤ گے

رفتہ رفتہ زندگی اپنا بناتی جائے گی
عقل جاگے گی تو دل کو نیند آتی جائے گی
تم بھی ہو جاؤ گے اک دن کامیاب زندگی

خون میں پانی کی آمیزش بڑھاتی جائے گی
ایک جھوٹی مصلحت ہر شے پہ چھاتی جائے گی
عشق کو سمجھو گے دیوانوں کا خواب زندگی

مرد کو سو مشغلے ہیں دل لگانے کے لئے
دفتر و بازار قسمت آزمانے کے لئے
پھر بسا کر دل کو اپنے خانہ ویراں دیکھنا

رزم و بزم زندگی جوہر دکھانے کیلئے
لیکن اک عورت کرے کیا غم بھلانے کیلئے
جاگنا اور پھر وہی خواب پریشاں دیکھنا

یہ تو ممکن ہے کہ کم ہو جائے جوش اضطراب
پھر نظر آئے کسی صورت میں امیدوں کا خواب
طبع لیکن سوچ کر یہ بھی سکوں پاتی نہیں

آرزو پیدا کرے دنیائے دل میں انقلاب
زندگی پھر زندگی ہے اور شباب آخر شباب
صبح کے خوابوں سے شب کی تیرگی جاتی نہیں

تم گئے اچھا کیا مجھکو اب اس کا غم نہیں
ہاں میں خوش ہوں میری بزم زیست میں ماتم نہیں
روشنائی پھیلی پھیلی سی جو خط میں ہے نہیں

یادِ عہدِ عشق عہدِ عشق سے کچھ کم نہیں
آہ ہونٹوں پر نہیں آنکھیں مری پرنم نہیں
یہ عرق کی بوندیں ٹپکی ہیں مرے آنسو نہیں

تیرگی میں زیست کی دو دل نبوت کر چکے
لب مرے جو کچھ بھی کرنا تھا شکایت کر چکے
بھیجتی ہوں اپنی مینا کا یہ جام آخری

نام الفت لینے والے ترک الفت کر چکے
ختم افسانہ ہوا، ہم تم محبت کر چکے
جانے والے جا تجھے دل کا سلام آخری

دو غزلیں

فراق گورکھپوری

کب خوش ہوں کب رنجیدہ محفل والے کیا جانیں
جیسی اب وہ نگاہ کہے ہم دل والے کیا جانیں

کتنے پانی میں ہے حسن عشق ہے کتنے پانی میں
ڈوبنے والے کیا جانیں ساحل والے کیا جانیں

ہوا چلی اور بند ہوئی خاک اڑی اور بیٹھ گئی
منزل ان کو کہاں لائی منزل والے کیا جانیں

رنج و نشاط کی کیفیت سب کو نصیب ہوئی لیکن
جو محفل پر گذری ہے محفل والے کیا جانیں

مشکل کی آسانی کو پوچھ نہ سہل پسندوں سے
آسانی کی مشکل کو مشکل والے کیا جانیں

حسن و عشق کے معرکہ میں اپنے بھی بیگانے ہیں
قاتل والے کیا جانیں بسمل والے کیا جانیں

حسن کی باتیں حسن کی گھاتیں حسن سے پوچھ فراقِ ناداں
ہم دل والے کیا سمجھیں ہم دل والے کیا جانیں

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو کچھ راتوں کو
دل ہی بیٹھا جاتا ہے آگ لگے برساتوں کو

شام جوانی کی غفلت سے کھلتے کھلتے کھل گئی آنکھ
کون ٹھوکے دیتا ہے کچی نیند کے ماتوں کو

آپس کے الزاموں سے کوئی نتیجہ نکلا ہے ؟
ملے رہیں کہ بچھڑ جائیں ؟ جانے دو ان باتوں کو

آج نگاہ کا کیا کہنا غصہ بھی ہے لگاوٹ بھی
جانے دے ایسی باتوں کو رہنے دے ایسی گھاتوں کو

ہر امکانی کوشش ہے، ہر تدبیر، مگر دیکھو
شاید حسن بنا پائے عشق کی بگڑی باتوں کو

جگمگ جگمگ چہرے پر جھلمل جھلمل کالی زلفیں
گھٹتے بڑھتے دن میں دیکھ گھٹتی بڑھتی راتوں کو

جور و کرم کی شرط نہیں ہجر و وصال کی بات نہیں
دن کو دن کر دے اے دوست آئیں کر دی راتوں کو

وہ دل امڈے ہیں کہ فراق الٹی گنگا بہتی ہے
سیدھی راہ لگائے کون ان کافر برساتوں کو

غزل — آل رضا لکھنوی

شوق امید فنا، ذوق محبت باقی
رہ گئی دور مجازی میں حقیقت باقی

انقلابات بہت آئے بہت آئیں گے
دل اگر دل ہے تو ہے درد محبت باقی

بیوفا مان کے بھی ان کی طرف جب دیکھا
نہ تو شکوہ کی سند تھی، نہ شکایت باقی

ہائے وہ عہد کہ جس عہد کی پرچھائیں سی
چلتی پھرتی ہوئی تصویر کی صورت باقی

دل کی ہر آن یہی جان یہی شان یہی
گھر لٹے جائے، رہے درد کی دولت باقی

شوق دیدار بہر حال، کمی کیا جانے
جتنا دیکھو انھیں اتنی ہی ضرورت باقی

عشق مخصوص ہوا اب کہ محروم ہوا
عشق کی ہر کس و ناکس پہ ہے تہمت باقی

یہ بھی اک وقت ہے ہوتی نہیں دل سے باتیں
پھر بھی یار جو زندہ ہے تو صحبت باقی

روز اک حشر سا محسوس ہوا کرتا ہے
پھر بھی سنتے ہیں کہ ہے روز قیامت باقی

یادگار اپنی نہ کہئے تو رضا کیا کہئے
اور سب ختم ہے عنوان طبیعت باقی

غزل — قدیر لکھنوی

نیاز عشق کی حد تک ہم آہ جا نہ سکے
نظر نظر سے ملی۔ دل سے دل ملا نہ سکے

خزاں کے خوف سے لطف بہار اٹھا نہ سکے
کلی کھلی بھی جو دل کی تو مسکرا نہ سکے

یہ حسن و عشق کے پہلو سمجھ میں آ نہ سکے
کوئی تو دل سے بھلا دے کوئی بھلا نہ سکے

نہ جانے اس کا محبت میں حشر کیا ہوگا
جو دل میں آگ لگا لے مگر بجھا نہ سکے

وہ باغ حسن کی ہرگز کرے نہ گلچینی
جو کھا کے زخم کلیجے پہ مسکرا نہ سکے

یہی تو حسن و محبت میں فرق نازک ہے
ہم ان کے ہو گئے اپنا انھیں بنا نہ سکے

مری نظر کو تمنا ہے اس کے جلووں کی
حد خیال و تصور میں بھی جو آ نہ سکے

چمن چمن تجھے ڈھونڈھا کلی کلی دیکھی
نظر کی پیاس کسی شکل سے بجھا نہ سکے

یہ حسن و عشق کی تصویر کے ہیں رخ دونوں
ہمیں وہ بھول گئے ہم انھیں بھلا نہ سکے

ہمارے دل کی ہوئی عشق میں یہی صورت
چمن میں جیسے کلی کھل کے مسکرا نہ سکے

قدیر ہجر میں رونے سے کیا ہوا حاصل
جو دل میں آگ لگی تھی اسے بجھا نہ سکے

اوس

شانتی سروپ بھٹناگر

یہ اوس تارِ نظر میں گہر پروتی ہے
کہ آفتاب کے ماتم میں رات روتی ہے

گلوئے سبزہ میں موتی کے زیورات ہیں کیا
یہ قطرے اشکِ غمِ چشمِ کائنات ہیں کیا

یہ اوس بادۂ جامِ جہاں نما تو نہیں
فسردگیٔ گل و لالہ کی دوا تو نہیں

ہر ایک چیز پہ روحِ گلاب چھڑکی ہے
یہ کس نے کھیلی ہے ہولی شراب چھڑکی ہے

برس پڑا ہے جبینِ سحر سے آبِ حیات
کہ بزمِ گل میں ہے بکھری ہوئی شرابِ حیات

فضا نے سیکھے ہیں اسلوب سحر خوانی کے
رُخِ حیات پہ چھینٹے دئے ہیں پانی کے

یہ قطرے ٹوٹے ہوئے گوہرِ قبا تو نہیں
سرِ چمن کسی رہرو کے نقشِ پا تو نہیں

اُفق پہ پھولوں کے جامِ شراب روشن ہیں
یہ قطرے ہیں کہ ہزار آفتاب روشن ہیں

یہ قطرے وہ ہیں جو ذروں کو گلفشانی دیں
رگوں میں برگِ فسردہ کی خون رواں کر دیں

لرز رہے ہیں جو گل پہ بصورتِ شبنم
ہیں اس کے سینۂ صد چاک کیلئے مرہم

یہ قطرے رحمتِ باراں کا فیض باقی ہیں
دراصل لالہ و گل کے لئے یہ ساقی ہیں

اُڑا کے لے گئیں کرنیں جنہیں قرینے سے
برس پڑے ہیں وہ قطرے فضا کے سینے سے

یہ زورِ طبع تھا جو کیمیا سے مات ہوا
تمام قصۂ آب اور انجرات ہوا

اندیشۂ جنوں!

مجید ملک

(۱)

میں اپنی طبع کی آوارگی سے خائف ہوں
کہ مجھکو پھر یہ ہوائے ہوس میں ڈال نہ دے

تری نظر نے مجھے جو کمال بخشا ہے
یہ اس کمال کو خمیازۂ زوال نہ دے

مرے لہو کو یہ وحشت سے ملتہب نہ کرے
سکونِ قلب کو ترغیب اشتعال نہ دے

مرے لئے یہ کہیں وجہ خسم نہ بن جائے
مجھے کہیں قلقِ شرم وانفعال نہ دے

خدا کرے کہ مجھے فصلِ گل کی رعنائی
تخیلات ملوث بہ ابتذال نہ دے

مبادا اپنا مقام بلند کھو بیٹھوں
مری ہوس مجھے فردوس سے نکال نہ دے

(۲)

میں تیرا ہو کے بھی تیرا نہیں نہیں، نہ سہی!
نہ کر خدا کے لئے اسقدر ملال نہ کر

اگر میں آگ میں گرتا ہوں مجھکو گرنے دے
دعائیں پیش خداوند ذوالجلال نہ کر

مرے گنہ ترے اشکوں سے دھل نہیں سکتے
مری خطاؤں پہ اظہارِ انفعال نہ کر

پریدہ رنگ، پریشاں نگاہ، پژمردہ
تو میرے حال کی مانند اپنا حال نہ کر

خدا کے واسطے چھلکا نہ آبگینوں کو
ہتھیلیوں سے تو آنکھوں کو لال نہ کر

ہر ایک سمت اندھیرا سا چھائے جاتا ہے
دفورِ غم سے پریشاں تو اپنے بال نہ کر

ستارے ہنستے ہیں، خورشید و ماہ ہنستے ہیں
خدا کے سامنے رو رو کے [illegible] حال نہ کر

میں تیرے پاؤں پہ گرتا ہوں مجھکو ٹھکرا دے
یہ اک حقیر سی خواہش [illegible] پامال نہ کر

میں تیرے واسطے چن چن کے پھول لایا ہوں
جواہرات سے کمتر انہیں خیال نہ کر

فکر و پیام — ماہر القادری

یہ ٹھوکریں یہ کبھی تجھے تلخئ کرم آمیز
نہیں نہیں ہیں ترے حوصلے زمانہ ستیز

تمام تر ہیں یہ تاریخ کے سیاہ ورق
شکوہِ ہلاکو و چنگیز، عشرتِ پرویز

ہم صبح یہ کہتی ہوئی گذر ہی گئی
سمندِ شوق کو موجِ نفس بھی ہے مہمیز

گھٹائیں چشمِ عنایت ادھر نہ فرمائیں
نہیں ہیں باغ یہ انگور کے ہیں بے نا لبریز

چلے ہیں غم کے مٹانے کو سوئے میخانہ
خود کشی کے ارادے ہیں زندگی سے گریز

بہت دنوں سے ہے ویران بزمِ وجد و سماع
نہ قونیہ کا وہ عالم نہ رونق تبریز

ابھی تو عمرِ رواں ساتھ دے رہی ہے ترا
قدم بڑھائے چلا جا ابھی کچھ اور بھی تیز

صدائیں آج بھی آتی ہیں طاقِ کسریٰ سے
ورق ورق ہے مری زندگی کا عبرت خیز

... ہے دل کی دھڑکنوں کا علاج
... یہی نغمہ ہائے دل آویز

تری نگاہ نے کچھ سوز کر دیا پیدا
مرا فسانۂ الفت نہ تھا اثر انگیز

... فقر ... شہنشاہ، خانقاہ کہ قصر
... کے آپڑے خونیں مریز

غزل — رابعہ پنہاں

پھر نئے اپنے زمین و آسماں پیدا کریں
ماورائے لامکاں اپنا جہاں پیدا کریں
خشک کانٹوں سے بہارِ بوستاں پیدا کریں
اوس کے قطروں سے بحرِ بیکراں پیدا کریں
نغمۂ بلبل سے ہو تخلیقِ گلہائے چمن !!!
قمریوں کے سوز سے سروِ رواں پیدا کریں
ہو جبیں محرابِ گردوں کی نگوں بہرِ سجود
پستیوں میں رفعتِ ہفت آسماں پیدا کریں
منقلب ہو جائے نظمِ کارزارِ کائنات
آسماں اک اور بھی آسماں پیدا کریں
کائناتِ حسن میں آجائے جس سے زلزلہ
سازِ دل سے وہ نوائے خونچکاں پیدا کریں
شامِ غم پھر دل نے چھیڑا پردۂ سازِ جنوں
سننے والے ضبط کی تاب و تواں پیدا کریں
پھونک ڈالے جو حوادث کے خس و خاشاک کو
آہِ آتش ریز سے وہ بجلیاں پیدا کریں
کھیلتے ہو سِ شکستہ ساز کے تاروں سے کیا
دل کے ٹکڑے لب نوائے داستاں پیدا کریں
جگمگا جائے حریمِ ناز کی رنگیں فضا !!!
اشکِ خونیں اس قدر تابانیاں پیدا کریں
کارگر ہو جائے گا پنہاں کبھی جذبِ دروں
نالۂ شبگیر سوزِ جاوداں پیدا کریں !!

تضحیک

کائنات ایک پہیلی کا دھندلکا بن کر
میرے آئینۂ احساس پہ چھا جاتی ہے
چھپ جاتے ہیں کچھ اس طرح تصور کے خطوط
زندگی آنکھ اٹھاتے ہوئے گھبراتی ہے

عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں
ایک دل، اور یہ افکار کی گھنگھور گھٹا
سٹپٹاتا ہوں، لپکتا ہوں، ٹھٹک جاتا ہوں
چار جانب سے یہ آتی ہے صدا۔ کیا ہوگا؟

جو بھی ہوگا مجھے منظور ہے۔ جی لینے دو
وسوسو، آرزوؤ، کشمکشو، اندیشو!
تم عبارت ہو مری زیست سے، تسلیم، مگر
جو مرے ذہن پہ بیتی ہے وہ تم کیا جانو

چاند کے ساتھ ستارے تو ہیں، لیکن کیوں ہیں؟
تتلیاں پھول پہ کیوں آتی ہیں، کیا پاتی ہیں؟
پھول کے رنگ میں خوشبو کا رچاؤ کیا ہے!
روحیں قالب سے نکلتے ہی کہاں جاتی ہیں؟

آسماں حدِ نظر ہے، تو زمیں کیا شے ہے؟
یہ بھی اندازِ نظر ہے، تو خدا کیا ہوگا!
وہ بھی تخئیل کی جنت ہے، تو عالم بدہن
عاقبت کیا ہے۔ وہاں جلوہ نما کیا ہوگا!

گہری کہروں سے ہے معمور خیالوں کی خلا
دھندلی راہیں ہیں سمٹتی ہوئی چکراتی ہوئی
ایسے موڑ آتے ہیں جو روح لرز اٹھتی ہے
لڑکھڑاتے ہی اچٹ جاتی ہے نیند آتی ہوئی

آنکھ کھلتے ہی امڈ آتی ہے گھنگھور گھٹا
عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں
یوں بپھر جاتے ہیں ماحول و مقدر کے نقیب
جیسے فطرت کا کھلونا ہوں میں انسان نہیں

احمد ندیم قاسمی

خوابِ محبت

فسونِ خوابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
تلاشِ حسن جو حسنِ نظر کا حاصل ہو
فسونِ بے اثری جو اثر کا حاصل ہو
وہ راہزن جو ہر اک رہگذر کا حاصل ہو
فسونِ خوابِ محبت کی داستاں یہ ہے

شروعِ بابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
فریبِ شوق کی وہ ہوش ربائیاں توبہ
جمالِ حسن کی خوش دل ربائیاں توبہ
تصورات کی وہ فراوانیاں توبہ
شروعِ بابِ محبت کی داستاں یہ ہے

حسیں شبابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
خزاں میں ذوقِ نظر سے بہار تابندہ
حیاتِ مردہ میں رقصِ شرار تابندہ
فرازِ شوق سے لیل و نہار تابندہ
حسیں شبابِ محبت کی داستاں یہ ہے

شرابِ نابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
ہر ایک گام پہ اک کیفِ بےخودی طاری
خمِ خرام پہ اک روحِ سرخوشی ساری
کسی کے نام پہ اک کیفِ بےہشی طاری
شرابِ نابِ محبت کی داستاں یہ ہے

مگر سرابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
نہ کوئی حق کا یہاں اعتراف کرتا ہے
زمانہ عشق سے اکثر مصاف کرتا ہے
وہ بے گناہ ہو تب کو معاف کرتا ہے
مگر سرابِ محبت کی داستاں یہ ہے

کسی خرابِ محبت کی داستاں مت پوچھ
نہ پوچھ قیصرِ غمگیں کا عالمِ سرشار
خوشی کے دھندلے تصور بھی ہیں نہیں بیدار
جنوں فسونِ محبت کی داستاں بیزار
اب اس خرابِ محبت کی داستاں یہ ہے
فسونِ خوابِ محبت کی داستاں یہ ہے

قیصر زیدی

غزل

بہزاد لکھنوی

کبھی اشکِ پیہم بھی بے خیانی کبھی تھام کر دل کو فریاد کرنا
کبھی لب پہ نالے کبھی لب پہ آہیں کبھی چپکے چپکے انہیں یاد کرنا

یہ راز ایک رہبر نے ہمکو بتایا یہی رمزِ راہِ طلب کا تھا بابا
جو منزل ہو اسکو نہ منزل سمجھنا جو منزل نہ ہو اسکو آباد کرنا

کسی کا یہ عالم بھی دیکھا ہے ہمنے ہمالے سے ٹکر شب بقرار ی
کبھی کچھ تفکر کبھی کچھ تغیر کبھی بھول جانا کبھی یاد کرنا

طبیعت ہو خود دیکھو سکائے محبت ذرا بڑھ کے بڑھ کر دو چار جگہ
دلِ مبتلا کیوں نہ قربان جائے انہیں آ گیا دل کو برباد کرنا

محبت نے اک طرز انکو سکھایا ملا ایک عالم کو اک رنگ دیگر
اسے یاد کرنا جسے بھول جانا جسے بھول جانا اسے یاد کرنا

مرے کفر پر میرے ذوقِ الم پر مری زندگی کو دلِ مبتلا کو
نہ تم مہر کرنا نہ بیداد کرنا نہ آباد کرنا نہ برباد کرنا

سجودِ محبت سجودِ اطاعت سجودِ عقیدت سجودِ صداقت
کسی سنگ در پر کسی آستاں پر یہ کرنا تو کیا کام بہزاد کرنا

بہزاد لکھنوی

آغازِ محبت

خواب ہوا افسانۂ الفت، ہائے مرا آغازِ محبت
یاد ہے اک بھولی سی حکایت ہائے مرا آغازِ محبت

شوقِ فراواں کی وادی میں منزلِ انوارِ تمنا
جیسے طلوعِ صبح لطافت ہائے مرا آغازِ محبت

ہوش و خرد کو حسرتِ لغزش، خودی بہکنا بی کی کوشش
ہلکا ہلکا نشۂ الفت، ہائے مرا آغازِ محبت

خاموشی، ہم رنگِ ترنم [illegible] آنکھوں میں لب پہ تبسم
سوز میں [illegible] ہائے مرا آغازِ محبت

عشرتِ بے پایاں کے جھونکے، آہ وہ شاداں شاداں لمحے،
اک دنیا اور [illegible] ہائے مرا آغازِ محبت

[illegible] شب عالم وابستہ
خواب تھا ہر [illegible] ہائے مرا آغازِ محبت

رنگ عزو پہ شوقِ گل افشاں [illegible] آپ ہی نازاں
ہر دم ان سے تازہ شکایت، ہائے مرا آغازِ محبت

حسن تصور، خوابِ نوازش آہ وہ [illegible] تعافل
شغلِ تمنا، دہرے فرصت، ہائے مرا آغازِ محبت

بہ وہ آپ ہی چپ چپ رہنا دل کا دردکسی سے نہ کہنا
ضبط کی شدت، غم کی نزاکت، ہائے مرا آغازِ محبت

ہائے تمنا میں [illegible] ان کو بھلانے کی تدبیریں
عشق کی وہ معصوم بغاوت، ہائے مرا آغازِ محبت

لاکھ بہانوں سے وہ بھلاتا، لاکھ طرح ان کا یاد آنا
اپنی شکست پہ خود ہی مسرت، ہائے مرا آغازِ محبت

شوق ادھر مانوسِ لطف نوا، ضبط ادھر بیزارِ تمنا
لاکھ طرح اظہارِ محبت، ہائے مرا آغازِ محبت

عقل کی بات کہاں بنتی ہے، بات عشق کہاں چھپتی ہے
مجھ سے زیادہ ان کی حالت، ہائے مرا آغازِ محبت

آہ روش یوں رسوا ہونا، کیا یہ کہوں ہے کیا کیا ہونا
کل کا راز ہے آج حکایت، ہائے مرا آغازِ محبت

روشؔ صدیقی

غزل

پگھلا ہوا جو ہر تھا جو تجھکو نظر آیا
واعظ تری آنکھوں میں کیوں خون اتر آیا

گلشن میں بہار آئی کب جوشِ نمو لیکر
ہر زخم ہوا تازہ ہر داغ ابھر آیا

اب اپنی جفاؤں پر کچھ کچھ وہ پشیماں ہیں
صد شکر کہ آہوں میں اتنا تو اثر آیا

کیا جلوہ نمائی ہے کیا پردہ نشینی ہے
آنکھوں میں سماتے ہی وہ دل میں اتر آیا

خالی نہ رہا کوئی شوریدۂ الفت سے
اک خاک بسر نکلا اک خاک بسر آیا

دنیا سے ملی رخصت ہر غم سے ہوئی فرصت
پیغامِ سکوں لے کر پیغامِ سفر آیا

ہنستوں پہ یہ روتا ہے روتوں پہ یہ ہنستا ہے
ہر طور زمانے کا بے طور نظر آیا

حیراں ہیں چمن والے اس ذوقِ اسیری پر
میں نغمہ سرا ہو کر صیاد کے گھر آیا

جس تیر سے پانی ہو پتھر کا کلیجا بھی
دل اس کے نشانے پر بے خوف و خطر آیا

اے جوشؔ جو آپہنچا میخانۂ دنیا میں
ہر چشمِ بصیرت کو بے ہوش نظر آیا

جوشؔ ملسیانی

غزل

لفظ تم کے غایت اعجاز کی باتیں کرو
اس جمالِ صوت و خوش آواز کی باتیں کرو!

تم خدا کے مرتبے سے گر نہ جاؤ اور بس،
اے بتو جو چاہو کبر و ناز کی باتیں کرو

اُن سے عرض رازِ دل پر دل نے یوں مجھ سے کہا
غیر سے یوں تو نہ اک دمساز کی باتیں کرو!

پُر بیاں ہوتے ہیں کیا کیا ہر طرف اہلِ نیاز
بزم میں جب اس سکوتِ ناز کی باتیں کرو

یہ قفس اور دام ہیں سب اعتبارات شکست
اے اسیرو عالمِ پرواز کی باتیں کرو

عشق ہی ہے سادہ دل یا حسن ہی ہے پُرفریب
ناصحو اک طرح اک انداز کی باتیں کرو

خوف سے صیاد کے اے زیبؔ مثلِ بوئے گل
پردے پردے میں پرِ پرواز کی باتیں کرو

زیبؔ عثمانیہ

پس پردہ

یوسف ظفر

یہ استعارہ و تشبیہ و نادرہ کاری
مرے لباس مرے خد و خال میں تو نہیں
مرا خیال ترے سن و سال میں تو نہیں
مجھے بچشمِ تحیّر نہ دیکھ آئنہ سال
جمالِ فن مرے اپنے جمال میں تو نہیں
نہیں کہ میں نے چھپایا ہے عرضِ حال کا جال
کچھ اور بھی مرے پیشِ نظر ہے اس کے سوا
مری نہیں یہ یہ کچھ سوچتی ہوئی نظریں
مری اُداس نگاہی کی حسرتِ پیدا
مجھے اجازتِ اظہارِ غم نہیں دیتی
مرے فسانے کو رنگِ الم نہیں دیتی

۲

نہ دیکھ یوں مرے چہرے کی مردہ رنگینی
مرے خیال کی رعنائیاں تماشا کر
تری نظر کو حسین تتلیوں سے سہلا کر
نئی فضائے بہاراں میں لے چلوں گا تجھے
تراش کر ترے سینے میں آرزوئے وصال
حضورِ دوست گلستاں میں لے چلوں گا تجھے
دکھاؤں گا تجھے کرنوں کا رقص، چاند کا رقص
شفق کا حسن پلاؤں گا تیرے گالوں کو
رگوں میں خون کی لہروں کو زیر و بم دے کر
چھپاؤں گا تری آنکھوں سے ان سوالوں کو

۳

یہ اشتہارِ مسرت کہ دیکھتا ہے تو
مرے عزیز! یہ ہے میرا خوابِ بیداری
یہ استعارہ و تشبیہ و نادرہ کاری

۴

نہ جھانک یوں مری آنکھوں کے ان جھروکوں سے
یہاں دفینے ہیں اشکوں کی خشک سالی کے
نہ دیکھ میری نگاہوں کا کھوکھلا پہلو
یہاں فسانے ہیں میری شکستہ حالی کے
چھپا رہا ہوں برنگِ بہارِ دردِ خزاں
اگرچہ رخ پہ تقاضے ہیں پائمالی کے

ثمرات

نہال سیوہاروی

دھوم کہتے ہیں یہ عالم جسے طوفانوں کی
ایک ہلکی سی تڑپ ہے مرے ارمانوں کی

عشق جس گوشۂ دامن پہ لہو رو یا ہے
آنکھ اس سمت ہے دنیا کے گلستانوں کی

یہی ہے لوث محبت، یہی غمخواریٔ خلق
اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی

بزم رنداں میں ہوا غلغلۂ حشر بلند
وائے غفلت ہے وہی نیند تن آسانوں کی

آج کچھ لوگ وہاں جمع تھے باچشم پُر آب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

کس قدر عام ہے اس دہر میں احساس ثبات
رگ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

نام ہی کیا ابھی ہنگامے کا آغاز شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

جس قدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعت فکر
عقل رکھتی ہے بنا ایسے نئے زندانوں کی

اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں
کہ نگاہیں طرف شمع ہیں پروانوں کی

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

پھر جان بہاراں نے کیا وعدۂ لطف
دیکھنا جنت رنگیں مرے ارمانوں کی

ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی

تاڑ ہی جاتے ہیں ارباب نظر تجھکو نہال
شکل چھپتی ہی نہیں حسن کے دیوانوں کی

...... سے خطاب

مضمر رضویہ

جمال شعر! تو تصویر فکر و یاس ہے کیوں؟
بتا خدا کے لئے اس قدر اداس ہے کیوں؟

یہ آشنائے تبسم لبوں پہ حسرت و غم
یہ مسکراتی نگاہوں میں درد و یاس ہے کیوں؟

شباب شعر و جمال و ضیا کی معبود
ہلو ہے کیا تجھے اس درجہ غم شناس ہے کیوں؟

نشان پہلی سی باقی ہے شعر گوئی کی
بتا ادیبۂ جادو بیاں، اداس ہے کیوں؟

تخیلات کی ملکہ! یہ خامشی کیسی؟
شباب عیش و طرب! درد و غم کے پاس ہے کیوں؟

ترا وجود ہے سرمایۂ بہاریں!!!
نگار ہوش ربا! تو الم شناس ہے کیوں؟

یہ کس نے تجھ کو رہین غم و ملال کیا؟
تری حسین جوانی کو پائمال کیا؟

غزل

آفاق دہلوی

آنکھوں میں امنڈ کر مری پلکیں نہ بھگو دے
ایسا نہ ہو غم بحر ندامت میں ڈبو دے

یوں ہیں وہ شکست دل معصوم پہ نادم
نازک سی کلی توڑ کے جیسے کوئی رو دے

جلوہ جو دکھایا ہے تو بنیادوں پہ لرزے
ہے خوف کہ دیوانہ کہیں جان نہ کھو دے

[illegible] شکر ریز پہ رقصاں [illegible]
کوشش ہے کہ بیمار [illegible] طرح [illegible]

ہیں مصلحت ضبط سے معذور [illegible]
ڈر ہے مرا دامن کہیں شبنم نہ بھگو دے

اک قطرۂ باران کرم [illegible]
وہ اشک جو کھوئی ہوئی [illegible]

آفاق یہی اب ہے فضاؤں کا [illegible]
روتا ہو تو اس سے کوئی ہنستا ہو [illegible]

تری یاد

صفیہ شمیم

دمساز و انیس شبِ ہجراں ہے تری یاد
خلوت میں بھی صد جشنِ بہاراں ہے تری یاد

ہر شب کو سناتی ہے حکایاتِ محبت
وابستگیٔ شامِ غریباں ہے تری یاد

اس تیرگیٔ یاس میں اس ظلمتِ غم میں
مانندِ سحر دل میں فروزاں ہے تری یاد

اس گلشنِ پامال میں اس یادِ خزاں میں
پیغامِ نسیمِ سحرِ بہاراں ہے تری یاد

ہر شب کو جلا دیتی ہے قندیلِ تمنا
تابندگیٔ شامِ غریباں ہے تری یاد

اس معرکۂ زیست کے فریاد و فغاں میں
صد مژدۂ گلبانگِ ہزاراں ہے تری یاد

اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی اے دوست
سرمایۂ دل، باعثِ درماں ہے تری یاد

تابندگیٔ دیدہ و دل جسمِ تصور
پایندگیٔ روحِ پریشاں ہے تری یاد

ہر چند مری زیست خزاں دیدہ ہے پھر بھی
اے دوست بہارِ دلِ ویراں ہے تری یاد

دل پائے جسے بھول گیا سختیٔ فرقت
انعامِ وفا، حاصلِ ارماں ہے تری یاد

مدت ہوئی دہقانِ جنوں کا ہوا مسکن
خاکسترِ دل میں شرر افشاں ہے تری یاد

دل اس طرح ڈوبا کہ ابھرتا ہی نہیں اب
گرداب ہے سیلاب ہے طوفاں ہے تری یاد

میں اور تو

اقبال عظیم

تری نگاہ مجسم شباب و رعنائی
مری نگاہ تمام خمار و صہبائی

ترا مقام تماشا ہیں اک تماشائی
مری طلب ہے مے لیکن یہ بزم آرائی

بصد حجاب تجھے شوق ناز فرمائی
بہر فریب میں آمادۂ جبیں سائی

ترا وجود تجلی، مرا وجود نظر
مرے بغیر نہ جلوہ، نہ جلوہ فرمائی

تری نگاہ سے برہم نظامِ دو عالم
مری نظر سے مرتب مذاقِ سینائی

ترا شعار تغافل، بدور از منزل
مرا شعار تمنا، بہ جادہ پیمائی

تجھے غرورِ تبسم بہر گلِ نرگس
مجھے غرورِ تکلم بہ نالہ فرسائی

تجھے یہ ناز کہ اپنوں سے بھی ہے بیگانہ
مجھے یہ ناز کہ بیگانگی بھی راس آئی

تو مطمئن کہ ستم تیری خو، ترا انداز
میں خوش کہ میرے مقدر میں غم کی پہنائی

ترے مقام کے شایاں ہے اب ترا اقبال
ہو گی اس کی عقیدت سے تیری رسوائی

غزل

مہندر سنگھ سحر

حسن پابندِ وفا ہو مجھے منظور نہیں
عشق آزادِ جفا ہو مجھے منظور نہیں

دل نہ شامل ہو تو سجدہ نہ کروں گا ہرگز
کوئی بت ہو کہ خدا ہو مجھے منظور نہیں

چارہ گر تیری توجہ تو عنایت ہے مگر
درد محتاجِ دوا ہو مجھے منظور نہیں

ضبط مشکل ہے فغاں سہل مگر دشمنِ جاں
جس میں تیرا بھی گلا ہو مجھے منظور نہیں

میں خوشامد کروں زردار کی مفلس کا گلا
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

جذب کامل ہو تو مقدر بھی بدل سکتا ہے
عشق راضی برضا ہو مجھے منظور نہیں

منزلِ عشق میں کیا کام خرد کا ہے سحر
راہزن راہنما ہو مجھے منظور نہیں

غزل

لطفی رضوانی

آنکھوں میں سرشکِ غم بھی نہیں لب پر بھی کوئی فریاد نہیں
اور یہ بھی نہیں کہ دل اپنا ناشاد نہیں برباد نہیں

اک برقِ تجلی چمکی تھی وہ سامنے میرے آئے تھے
ہاں یاد جو مجھ کو ہے تو یہ ہے بس اسکے سوا کچھ یاد نہیں

پوچھو نہ خدارا ہمنفسو مجھ سے مری خانہ ویرانی
وہ کون غم ہے جس غم کی آنکھوں میں مری روداد نہیں

گلشن کی بہاریں اس کی ہیں وہ لائقِ بزمِ گلشن ہے
صیاد کی جسکو فکر نہیں اندیشۂ برق و باد نہیں

انکار کریں تو کیسے کریں اس مصحفِ رخ کی عظمت سے
کیا شرعِ جوانی میں واعظ یہ کفر نہیں الحاد نہیں

سو بار گھٹا اٹھی تو کیا سو بار بہار آئی تو کیا
جب جی ہی کسی کا ٹھیک نہیں جب دل ہی کسی کا شاد نہیں

کیوں شکوہ کریں تنہائی کا کیوں شامِ الم سے گھبرائیں
لطفی ہے کوئی سانس ایسی بھی جس سانس میں انکی یاد نہیں

غزل

مخفی لکھنوی

شوخیِ چشمِ پُر خمار نہ پوچھ
توبہ ٹوٹی ہے کتنی بار نہ پوچھ

روزِ محشر کا منتظر کیوں ہوں
اپنے وعدہ کا اعتبار نہ پوچھ

اب نہ آنے کی کر رہا ہوں دعا
لذتِ ذوقِ انتظار نہ پوچھ

بعد از وقت پوچھنے والے
کیسی گذری تہِ مزار نہ پوچھ

بکھری ہر سو پڑی ہیں زنجیریں
جوشِ رنگینیٔ بہار نہ پوچھ

مہربانی ستم نہ بن جائے
حسرتِ قلبِ بے قرار نہ پوچھ

اپنی رحمت پہ کر نظر خالق
جرمِ مخفیٔ شرمسار نہ پوچھ

چہرے

فکر تونسوی

مجھے مت سناؤ یہ رودادِ شمشیر و خنجر —— !
مجھے مت دکھاؤ، کہ تم تو قرنہا قرن سے،
اسی رہگذر کے غبارِ دمن دلو میں ڈوبے رہے ہو۔!!
مجھے اس سے کیا تم عرب سے چلے یا ہمالہ سے اترے
مہا بھارتوں کے، صلیبوں کے خونیں فسانوں کے ہیرو
مجھے تم سے نفرت نہیں ہے
کہ تم تو بساطِ روایاتِ آبا کے مہرے رہے ہو
تمہیں طعنۂ جرمِ آدم کشی بھی نہ دوں گا
کہ دامانِ ماضی تو اکثر لہو کی بہاروں سے گلگوں رہا ہے

تمہاری نگاہوں سے بہتی ہوئی آتشیں رنگ نغموں کی دھارا
لبوں پر پھپھڑکتا ہوا نسل و رنگت کا پارا
چھپاتے ہیں مجھ سے کسی رازِ کہنہ کا پرتو
جو صدیوں کی پابستگی نے،
جو تم سے بڑے ایک آدم کی گلگونی تیغ و خنجر نے ——
بخشا تھا تم کو،
تمہارے نہاں خانۂ ذہن و دل کو،
—— اور اب جو تمہاری نگاہوں نے پیہم سے آخر
بڑی اجنبی آمریت کا دامن ہوا پارہ پارہ

تمہاری تمنا ہے کہتہ اٹھی ہے لہو کی بہاروں کا دامن سنبھالے
لبوں پہ لئے حیلۂ نسل و رنگت
نگاہوں میں عذرِ دمن دلو کا دھندلا سہارا
کہ تم کو بھی مل جائے پابستگیٔ مسلسل کا ثمرہ
فضاؤں میں گونجے یہ نعرہ
"مہاراج کی جے! —" شہنشاہ کا بخت قائم!!

—— مگر تم کہاں آگئے ہو؟
تمہیں سیلِ وقت نے اب کہاں لا کے پھینکا؟
زمانہ، غبارِ دمن، دھندلکوں کی حیلہ گہوں سے ابھر کر
کھلی وسعتوں کو بڑھا جا رہا ہے
مہاراج کی جے، شہنشاہ کا بخت۔ تاریکیوں میں کہیں کھو چکے ہیں
—— تمہاری نگاہوں کے شعلے مسلّم
مگر ان میں وہ موجِ تاباں کہاں ہے
جھلکتی ہے جو آج ہر ابنِ آدم کے تاریک و مہجور سینے میں پیہم
جو شاید کبھی سیلِ انوار بن کر،
جو گلگونی تیغ و خنجر پہ چھا کر،
عرب کے، ہمالہ کے مہرے اٹھا کر،
بساطِ روایاتِ آبا الٹ دے —— !؟

پیشگوئی

قتیل شفائی

سونے کی انگوٹھی میں یہ ہیرے کا نگینہ؟
تحفہ ترا لیتے ہوئے دل کانپ رہا ہے
آغاز میں انجام کی باتیں مرے محبوب؟
احساس کی رگ رگ میں لہو ہانپ رہا ہے

وہ خواب جو میں نے تری آنکھوں سے نچوڑا
افسوس کہ اس خواب کی تعبیر غلط ہے
میں نے تو نہ چاہا تھا یہ سونے کا دریچہ
شاید ترے فردوس کی تعمیر غلط ہے

اے وائے تری مصلحت اندیش محبت
دل سے نہیں سونے سے مجھے تول رہی ہے
لیکن مرے محبوب اسے کون چھپائے
وہ راز جو ہیرے کی کنی کھول رہی ہے

ڈھل جائینگے جس وقت شفق زار لبوں سے
جب حسن کے شاداب نظارے نہ رہیں گے
جب چاند سے ماتھے پہ نہ پھوٹے گا اجالا
جب رات سی آنکھوں میں ستارے نہ رہینگے

ہو جائیگا عریاں تری فطرت کا تلوّن
ہیرے سے اتر جائیگا سونے کا لبادہ
اس وقت کہ جس وقت میں رہ جاؤنگی تنہا
ہیرا مرے کام آئیگا سونے سے زیادہ

ڈانٹے اور بیٹرس

دوسری — اور آخری ملاقات پر

ڈانٹے:- تری نگاہ کی محشر طرازیاں افزوں
رہی نہ اب دلِ وحشی کو آرزوئے سکوں
نظر کے سامنے آئی ہے آج بارِ دگر
ہزار بار تمناؤں کا بہا کے خوں
کبھی خیال میں آیا بھی آج تک ظالم
کہ زیرِ دام تڑپتا ہے کوئی صیدِ زبوں

بیٹرس:- مرا نصیب کہ ہوں مرکزِ نگاہ تری
نظر میں ہیچ ہوئی آج رفعتِ گردوں
ملیگا کیا تجھے لیکن صلۂ محبت کا
بجز ہجومِ غم و رنجہائے گوناگوں
قدم تو رکھنے لگا راہِ عشق میں غافل
غموں کے توڑ بھی پائیگا صد ہزار ستوں؟

ڈانٹے:- عجیب شے ہے میسر ہو گر جراحتِ غم
ہزار لطف و مسرت ایک سوزِ دروں
بغیر اسکے تہی دامنِ علومِ جہاں
یہ ہو نصیب تو ناچیز دولتِ قاروں
بقیدِ شوق، نظر پر عیاں رموزِ حیات
شعور و عقل کی معراج انتہائے جنوں

بیٹرس:- رہینِ سلاکِ رسوم و قیود بھی ہے مگر
ہے آج زینتِ آغوش جو دُرِ مکنوں!

ڈانٹے:- نہ آسکے گی کوئی اس سے بڑھ کے ساعتِ خواب
جو ٹوٹ جائے تو بہتر ہے زندگی کا فسوں

عبدالعلیم شیر کوٹی

پروازِ خیال

عبدالمجید بھٹی

چال اٹھلائی ملیں تم سے نگاہیں، جھک گئیں
گونج اٹھے فطرت کے پُرفن قہقہے
اپنے ماضی اور مستقبل کی آویزش میں گم
میں کھڑی تھی زندگی کے موڑ پر

مجلسی تہذیب میری گرہِ گفتار ہے
خوبئے اطوار میری زیبِ رفتار ہے
پُروقار انداز فکر اور دلنشیں میرا بیاں
ذوق میں بھی ہے نفاست
اور فراست بھی تو ہے
پھر جھجک سی کیوں ہے ؟ اور نظریں جھکی جاتی ہیں کیوں؟

چند تصویریں جو ابھریں میں نے پھر دیکھا تمہیں
ساتھ ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے ہم
کٹ گئے تم دیکھ کر اکثر مجھے
اپنے پیڑوں کی سیاہی دیکھ کر

میں حریفانہ چلی کاندھے سے کاندھا جوڑ کر
ولولوں کے ساتھ ساتھ
اپنے مستقبل کے پختہ عزائم کو لئے
ہر قدم پہ ہر ادا میری تمہاری تھی شکست
اک نئی دنیا بسانا تھی مجھے
قدر و قیمت اپنی ہستی کی دکھانا تھی مجھے

دیکھتی تھی میں تمہیں اور سوچتی رہتی تھی یہ
سامنے میرے تمہاری کیوں نہیں چلتی زباں ؟
کیوں پڑھائی میں بھی تم کمزور ہو ؟
جب کہ اس کے ساتھ گھرداری بھی میں نے سیکھ لی
آگیا سینا پرونا بھی مجھے
میں نے دیکھا ہے تمہیں ہر حال میں
سامنے آتے ہی تم کترا گئے
لیکن اب مجھ پر جھجک طاری ہے کیوں ؟
جب کہ ہوں میں بھی وہی تم بھی وہی

قرب ہے لیکن جو ہم دو پتے بن کر رہ گئے
کچھ ذمہ داری آگئی
آسماں کی وسعتیں اب ہیں تمہارے سامنے
اور میری پروازِ خیال ؟
بچہ گاڑی کی خرید اور جھنجھنے کا رنگ ہے

سامنے میرے تمہاری چل نہیں سکتی زباں ؟
ہاں مجھے تم ناقص العقل اب کہو۔ بے شک کہو

پکار — الطاف مشہدی

پچھم نے پورب کے اندھے سورج کو بخشا اُجیارا
ڈگمگ ڈگمگ کرتی نیّا کو سونپا مضبوط کنارا
دیکھتے دیکھتے کو اک رنگے سہ رنگے پرچم جوش میں آئے
گرددھ کیت کے خونیں طوفاں تبدیلی کے ہوش میں آئے
تسبیحوں اور مالاؤں کی دنیاؤں میں بھونچال آیا
مندر سے مسجد ٹکرائی مسجد سے مندر ٹکرایا
اکتا کی ارتھی کو لے کر کاندھوں پر نکلے ہمسائے
اپنوں نے اپنوں کی لاشوں سے جنگل میں شہر بسائے
من میں لیکر گردھ کی اگنی ہونٹوں پر زہریلی بولی
انسانوں نے مل کر کھیلی انسانوں کے خون سے ہولی
سندر اور شرمیلی دھرتی کے ہونٹوں پر چیخیں کانپیں
لالچ کی بیاکل دوڑوں میں پیت لتائیں تھک کر کانپیں
مذہب کی اندھیاری اُٹھی شعلوں کی مالائیں لے کر
شہروں کو شمشان بنانے کی من میں آشائیں لیکر
کل دیویوں نے توڑ کے رکھدی سندرتا کی سندر تھالی
بھیڑوں کی سب گھوالوں نے بھیڑیئے بنکر کی رکھوالی
لاشوں کی سیڑھی سے ہوکر اونچائی کی گود میں پہنچے
اونچے ہونے والے گویا گہرائی کی گود میں پہنچے
آشاؤں کے سورج راہوں میں اُجیارا بنکر پھیلے
ظلم کے بادل لیکن دھرتی پر اندھیارا بن کر پھیلے
یورپ کے بیٹوں نے جیون کی دیوی کو پتھر مارے
اب میں مانا پچھم والو! پچھم جیتا اور ہم ہارے

پریم کے بدرا آؤ — سائل دہلوی

"پریم کے بدرا آؤ"

جیون ساگر سوکھ چلا ہے پریم کے بدرا آؤ
مجھ ابلا جیتا مادی کو دیر تک نہ یوں ترپاؤ
چھا جاؤ جو آئے ہو اب بن برسے مت جاؤ
برس برس کے میرے سوکھے ساگر کو بھر جاؤ

"پریم کے بدرا آؤ"

من اُپون میں پت جھڑ لاگی، اپنا رنگ جماؤ
سوکھی آشاؤں کی کلیاں تشنہ ترت بجھاؤ
چھاؤ چھاؤ چھا۔ چھاؤ چھاؤ چھاؤ چھاؤ
گھر گھر کے آؤ جلدی امرت جل برساؤ

"پریم کے بدرا آؤ"

دکھ سہتی ہوں میں نسدن مجھ دکھیا کو بہلاؤ
رم جھم رم جھم تار چھیڑ کے پریم کی تان اُٹھاؤ
ارمانوں میں خوشی کی لہریں بجلی سی دوڑاؤ
ٹھمک ٹھمک نرت کریں آشائیں دھمے گاؤ

"پریم کے بدرا آؤ"

پریم سمبھ کے شیتل کومل نرمل جھونکے آئیں
من اُپون کی کیاری کیاری میں گھومیں اٹھلائیں
جیون بگیا کی مرجھائی کلیاں پھر مسکائیں
آشاؤں کے برجھ کی سوکھی ٹہنی کو لہراؤ

"پریم کے بدرا آؤ"

جسکے نین رسیلے جسکے روپ کے سب متوالے
کالی گھٹا سے کالے جسکے گیسو ہیں گھونگھر والے
اسکے بیوگ میں پڑ گئے میرے من میں لاکھوں چھالے
ان چھالوں کی بوند بوند میں امرت رس بھر جاؤ

"پریم کے بدرا آؤ"

۵۱ :۔ تغزل ۵۲ :۔ باغیچہ ۵۳ :۔ پیاس ۵۴ :۔ جلدی ۵۵ :۔ سنا ہیں ۔ ۵۶ :۔ پہاڑ ۔ ۵۷ :۔ فراق۔

ٹوٹا ہوا تارا

میکش اکبرآبادی

وہ شرم سے پھیلی ہوئی گالوں پہ شفق سی | آنکھوں میں چمکتا ہوا شوخی کا ستارا
ہلکا سا وہ دزدیدہ نگاہوں میں تبسم | جیسے شبِ مہتاب میں ٹوٹا ہوا تارا
بے آنکھ ملائے ہوئے وہ چشمِ عنایت | پلکوں پہ مچلتا ہوا مجبور نظارا
ماتھے پہ شکن اور اداؤں میں لگاوٹ | اعراض کے پردے میں توجہ کا اشارا
پلکوں پہ ہے دل کی حرکت چال میں لغزش | رعنائی سنبھالے ہوئے ساری کا کنارا

جاتی ہے تو دے جاتی ہے پیغامِ محبت
آتی ہے تو کرتی ہے محبت سے کنارا

غزل

جاں نثار اختر

ہر دفعہ بخش دے نہ میرا قصور | یہ محبت مجھے نہیں منظور
کوئی نزدیک ہے تو کوئی دور | تیری محفل کا یہ نہ تھا دستور
تیرے ہاتھوں شکست ساز ہے آج | کتنے نغمے ہوئے ہیں چکنا چور
میری راتیں جو ہیں سیاہ تو ہوں | چاند تاروں سے چھین لوں کیوں نور
حوصلہ زندگی کا تھا کس میں | تو نے جینے پہ کر دیا مجبور
خود کو کھویا ہے تیری غیبت میں | خود کو پایا ہے میں نے تیرے حضور
ذرے ذرے میں پا رہا ہوں نظر! | وہ نظر جس میں حل ہیں سوز و سرور
آج جھٹلا رہا ہوں وہ قصے | جن کو میں نے کیا تھا خود مشہور
جانے کس نے گرا دیئے پردے | ہر نظر جا کے رہ گئی کچھ دور
میری بے ربطیٔ فغاں پہ نہ جا | کوئی نغمہ مگر ہے تحتِ شعور

غم بھی اک کیف بن گیا اختر
اشک پی پی کے ہو گیا مخمور

جوگن پھرے اُداس

عرش ملسیانی

جوگن پھرے اداس پیا بن
جوگن پھرے اداس

تن پہ بھبوت گلے میں مالا
انگ انگ یوون متوالا
لوگ کریں اُپہاس پیا بن
جوگن پھرے اداس

نرمل من ہے سندر مکھڑا
آج سنائے اپنا دکھڑا
جا کر کس کے پاس پیا بن
جوگن پھرے اداس

من کا بھید چھپاتی جائے
آنسو پی کر گاتی جائے
بجھے نہ من کی پیاس پیا بن
جوگن پھرے اداس

مدماتی خاموش نگاہیں
سوز گلے میں ٹھنڈی آہیں
جلتے جلتے سواس پیا بن
جوگن پھرے اداس

پھولوں کی بوباس ہے اس میں
کھِلنے کو اُلّاس ہے اس میں
چھوٹا ہے اُلّاس پیا بن
جوگن پھرے اداس

میری خوشیاں

مسعود حسن

بھاگ گئیں جو میری خوشیاں!

بادل کے سینے میں جھمکیں
تاروں کی آنکھوں سے چمکیں
چاند کے ماتھے پر وہ دمکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں

کلیوں کے ہونٹوں پہ جھلکیں
یا اُن کی آنکھوں سے چھلکیں
پلکوں پہ ناچیں، پھر ڈھلکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں

چنچل لہروں میں وہ لہکیں
پھولوں کے گالوں سے مہکیں
بن ننھی چڑیاں وہ چہکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں!

آنریری یا اناڑی

(افسانہ)

سلطان حیدر جوش

زیبں دوز، بامونز اختصار الدولہ مختصر الملک صرف ۴ فٹ اور ۱۰ انچ والے تیغ بہادر (جو عموماً T.B. پکارے جاتے تھے) نظم تہنیت علی بہادر صاحب کو سنا رہے تھے۔ دعوتِ ولیمہ کے مہمان، مزہ دار کھانا کھا چکنے پر تحسینِ ناشناس کے نعرے رہ رہ کر لگا رہے تھے۔ اور نظر کیہ و نازک اندام دولہا میاں (علی بہادر کے خط گلزار والے دستخط)، اسالہ موچھوں کی خفیف سی نمود کے باوجود، ریشمیں لباس اور برقی روشنی میں سکہ حسن کا ایرانی زر بدل نظر آرہے تھے!

زمینداری، خان بہادری اور آنریری مجسٹریٹی درجہ اوّل کے ذو اضعاف اقل (LOWEST COMMON MULTIPLE) بہادر عالی پور، مسافر نواز، سرلنک نرم باز جیسا سمدھی ہاتھ آجانے پر بہو کے سامنے سے اور بلک جی بھی جو ایک ریاست کے مدار المہام ہو کر جاہ و دولت کے خطاب و عزت، اور قامت و قیامت کے مقسوم علیہ اعظم (HIGHEST COMMON FACTOR) تھے مطمئن دکھائی دے رہے۔

اس لیے تھے کہ ان کی چہیتی بیوی کی اکلوتی صاحبزادی، ناگوار دستور رسم ہو بسبب کی بنا پر ۲۶ ویں سال تک مناسب جفت تلاشی میں مالائے طاق رہ کر اب نکیلے سچے شوہر سے منسلک ہو چکی تھیں۔

نظم تہنیت نے بعض لطیف الفاظ، دولہا اور دلہن کے تفاوت عمر کی بنا پر طنز تیغ کے غلاف میں لپیٹے ہوئے نشتر بھی تھے اور ریش بابا سے بازی کرنے کے ماہر ٹی بی سے مربا خوری کے ساتھ مرلی کشی بعید نہ تھی۔ یہ ذات عجائب صفات آنریری عدالت کے ریڈر، خان بہادر صاحب سے نیز اور بالائی آمدنی کے باہر ہونے کی معجون مرکب تھی۔ یہی معجون جو بھینس کے انڈے سے کم سہی، مگر امرت دھارا سے زیادہ ہمہ گیر تھی۔ فریقین مقدمات سے دست غیب اور ملزمان کے جرمانوں کا بہتوں داخل جیب رہنا تو ان کا معمولی شعار تھا ہی البتہ علمی استفراغ اور عزت سوز ہجو بھی کبھی کبھار ان کی غیر معمولی آمدنی کے ذرائع ثابت ہوتے تھے۔ یعنی تیسرے چوتھے مہینے ادبی بیگار کی ایک چھوٹی سی تالیف یا رسالے کی صورت میں شائع ہوتی تھی۔ یا، جب موقعہ ہاتھ آیا تو کسی نام آور ہستی کی ہاجیانہ ہجو اپنے یا اپنے کسی چیلے کے نام سے طبع ہوتی تھی، اور یہ دو چار آنوں کی لاگت والی مطبوعات کھرے کھرے عدالتی حاجت مندوں کے طبقے میں ایک دو روپے فی جلد کے حساب سے فروخت ہو جاتی تھیں۔ اس طرح اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی برابر اچھلتی رہتی تھی۔ خان بہادر صاحب کی والدۂ محترمہ کے انتقال پر ان کا پورا رسالہ ماتمی نمبر کے نام سے خارج ہوا تھا جس کے ایک نوحہ کا شعر تھا۔

موت نے آج یہ قیامت کی
توڑ ڈالی کمر عدالت کی

خان بہادر صاحب کی قانونی معلومات دلی سے شاہدرہ تک ہی ہو، مگر تعزیرات ہند کو سر ہری سنگھ گوڑ کے لک بھگ سمجھ سکے یا مغالطہ ان کو اکثر ہوتا تھا اور ڈپٹی کی چاپلوسی پر ہوتا تھا۔ غالباً انیسویں صدی والے اردو ہیچ نے آنریری مجسٹریٹ کا ترجمہ اناڑی مجسٹریٹ پہلے ہی کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس اناڑی گروہ کا نقش اول انیسویں صدی میں لیٹن کی کے اشتہار کو اپنے اختیارات کو بروانہ سمجھ سکا ہو، مگر بیسویں صدی میں اس کا امکان مفقود ہو گیا تھا۔ یہ آنریری طبقہ گورے حکمران اور کالے حکم رسان کی سرپرستی میں کالے اور ابلق بچے دیتا رہا۔ کہتے ہیں، اس کا پہلا جھول آنریری منصف۔ یا۔ آنریری اسسٹنٹ کلکٹر تھا، کچھ بھی ہو، یہ آنریری نسل بھارت ورش میں نت نئے روپ دھارتی رہی اور یہ مرض سماج کے مختلف طبقوں میں متعدی ہوتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، آنریری چیرمین، آنریری سکرٹری، آنریری کاونسلر اور آنریری کیا نہ جانے کیا، وجود میں آگئے۔ ادبی دنیا کے قلمی و تخمی معاون تو ہمیشہ سے آنریری بکواس میں اکثر مبتلا تھے ہی، مگر اب آنریری اڈیٹر یا اعزازی مدیر بھی برآمد ہوگئے۔ مانا کہ اس اعزازی نوع کا ارتقا رحیم تخلص سے بن مانس۔ یا۔ بھلے مانس تک ہوا ہو لیکن اس کی ایک خصوصیت ہمیشہ باقی رہی یعنی اس کے افراد یا تو محض نام کے ہوتے یا بعض اوقات کام کے بھی! لیکن جب کبھی کام کے ہوئے تو سہاگن سے اچھی پڑ رہنے والی رانڈ کی طرح، مشاہرہ و تنخواہ پانے والوں سے ہمیشہ اچھے ہی پڑتے رہے!

مختصراً۔ علی بہادر کی نسل میں ملک جی کا پیوند، آئندہ چل کر تخمی آم کو بنارسی لنگڑا بنا دینے کا پیش خیمہ تھا۔ ایک قلم کے بادشاہ تھے تو دوسرے قلم کے غلام۔ مگر تضاد دونوں کو حکم کلا زی سے تعلق یا پھر تیغ بہادر نظم تہنیت میں کیوں نہ فرماتے کہ:۔

مبارک یہ جلسہ۔ مبارک یہ شادی!
دو طرفہ مسرت نے محفل رچا دی۔

"کیا کہتے ہو تم؟" خان بہادر صاحب نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔
"سچ کہتا ہوں حضور!" تیغ بہادر نے جواب دیا۔ شادی کے

مہینہ بھر بعد ـــ اتنے عرصے کے بعد کہ نئے زمانے کی تعلیم یافتہ دولہن نائشی حجاب و تکلّف بہت کچھ چھوڑ چکی ہو اور صبح و شام بنگلے کے صحن چمن پہ اپنے خرام ناز سے مفتنٔ ملتسا دی الشاقین بنانے لگی ہو۔ فتنہ پردازئی بی علی بہادر سے سرگوشی میں مصروف تھے۔

"کہاں سے سنی تم نے یہ افواہ؟"

"ایک جگہ ہو تو بتاؤں سرکار۔ سارے میں ڈونڈی سی پٹ رہی ہے۔"

"میں نے تو کسی سے بھی نہیں سُنا۔"

"بھلا مجال ہے کسی کی جو حضور سے کہہ سکتا،" ٹی بی نے زہر اگلا۔
"میں بھی ایک ہفتے سے حضور کے گوش گذار کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ مگر جرأت نہ ہوسکی اب تک۔ کہنا چاہتا تھا روز مگر کہہ نہ سکا کبھی۔ اب زبانی چہ می گوئی سے تحریری شرارت پر نوبت آگئی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ڈرتے ڈرتے عرض کر بیٹھا۔"

"تحریری شرارت کیسی؟"

"کیا بتاؤں سرکار! دنیا بڑی پاجی ہے،" ٹی بی نے تاسف و حقارت آمیز چشم و ابرو بناتے ہوئے کہا "حضور کی عزّت و اقتدار میں اس رشتے سے اضافہ ہوا تو دشمن جل بھن کر کباب ہوگئے۔ اب زبانی افواہ پھیلی تو ایک پاجی نے فرشتہ اخبار میں ایک مضمون لکھ مارا۔ مضمون کی سرخی ہے "آنریری شوہر" اور چوٹ ہے دولہا میاں پر...."

"یہ ہے تو میں دیکھ لوں گا۔ ہتک عزّت کا قانون تو موجود ہے۔ اچھی طرح سمجھ لوں گا مضمون نگار سے۔ بلکہ اس بیچے اڈیٹر سے بھی۔"

"کیا فرماتے ہیں حضور۔ آپ کہاں اور یہ بچّے کہاں؟ ـــ وہ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ ایسا مقدمہ چل جائے۔ موقعہ مل جائے عدالت میں ٹھٹھری کرنے کا، زن و شوہر کے تعلق پر جرح کرنے اور صوبہ بھر میں بدنام کرنے کا۔...."

"مگر اس کے سوائے اور چارہ ہی کیا ہے۔ بے عزّتی اوڑھ لی جائے کیا؟"

"بے عزّتی کی نوبت آجائے تو ہم نمک خوار کس کام کے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس غلام نے فوراً کھوج لگالیا اور مضمون شائع ہونے سے روک لیا۔ سو روپے کی بات ہی کیا تھی۔ دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔ میں نے اڈیٹر کا منہ بند کر دیا۔"

"مگر یہ آخر کب تک؟"

"یہ کیا فرمایا سرکار نے!" ٹی بی نے مسکراہٹ ہضم کرتے ہوئے کہا "خدا نخواستہ دولہا میاں میں کوئی نقص ہے کیا؟۔ نوعمری اور ناتجربہ کاری ہے فقط۔ اکثر نئے تعلیم یافتہ کبوتر شعار ہوتے ہیں۔ گنوار تو میں نہیں جو مرغ سنجار ہوں۔ آج کے اناڑی کل کے کھلاڑی ہیں۔...."

خان بہادر صاحب سکوت میں ڈوب گئے۔ خیالات کی تہ بہ بیٹھ گئے اور ڈوبتے کی طرح تنکے کا سہارا تلاش کرنے ـــ یہ مادر درسگاہ کے ہونہار پسر، بلکہ پدر درسگاہ کے پرانے منظور نظر، جو انٹرنس کے امتحان میں رہے فرسٹ کلاس فرسٹ، کیا داخلۂ حیات کے جائزے میں رہیں گے چاروں شانے چت؟ ـ "یہ آنریری شوہر ہیں یا صرف اناڑی؟"

کروٹ

افسانہ

فطرت کی نیند ٹوٹتی ہے تو وہ ہنستی ہوئی اٹھتی ہے۔ سورج کی جگمگاہٹ فطرت کی ہنسی ہی تو ہے۔ صبح کا سورج زمین پر بسنے والوں کے لئے خوشی کا پیغام لیکر آتا ہے، ہنسی کا سندیسا لاتا ہے، کہ زندگی کے کاموں کے لئے آدم کی اولاد پھر ایک دفعہ نئی امنگوں سے بھرپور ہو جائے۔ کام کرنے کا ولولہ ہی تو سچی خوشی ہے! پر جب دمکتا ہوا سورج کالا دکھائی دے؟ جب دیکھتی ہوئی آنکھیں اس کی جگمگاہٹ کو نہ دیکھ سکیں؟

سورج نکلا۔ اسی دھوم دھام اور شان و جلال سے نکلا، وہی دھوپ دمیدے کر نکلا کہ فطرت کے بچے کھل کھلا کر ہنس دیں، زندگی کی خوشیوں کے پیچھے دوڑنے لگیں۔ لیکن ایک جھونپڑی کے اندر تو اندھیرا تھا، مایوسی کا اندھیرا! چار جانوں کے لئے سورج کی یہ ہنسی فاقے کی مہیب دعوت ثابت ہوئی تھی۔ چوبیس گھنٹے پورے گزر چکے تھے۔ ایک طرف اندھی بڑھیا ڈھائی برس کی بچی کو تھپک تھپک کر چپ کرنا چاہتی تھی۔ بھوکی بچی کا پیٹ تھپکیوں سے بھر دینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف بڑھیا کا بیٹا بھولا اور اس کی بیوی لچھو چپ تھے۔ ایک کو دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی، ایک دوسرے سے ڈر رہا تھا۔ بھولا ڈر رہا تھا کہ گھروالی ٹوک نہ دے۔ لچھو پوچھ رہی تھی کہ کچھ بھی تو کیا کہے؟ یہ حالات کے مارے ہوئے ایک دوسرے کو حوصلہ بھی نہ دلا سکتے تھے، ہمت بھی نہ بندھا سکتے تھے۔ چپ رہنا مایوس دنیا ہے یا ترآشا موہ کی دیتی ہے، کون بتلائے؟ چپ۔ تجھ تو سچ ہی ہے ہوگی؟ مگر مایوسی نے ان کے سوچنے کی طاقت چھین لی تھی۔ اچانک لچھو کی چمکیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں، ان میں آشا کی چمک پیدا ہوگئی۔ چہرے پر ارادے کا تناؤ آگیا۔ مگر بھولا نے یہ بھی نہ دیکھا۔ وہ اٹھی، کہیں جانے کے ارادے سے کھڑی ہوئی تو بھولا نے پوچھا:-

"کہاں جائے ہے؟"

"جمعدار کے کھیت کٹ رہے ہیں، مجوری مل جائیگی۔"

"پر ——" بھولا اسے دھیان دلانا چاہتا تھا کہ آٹھواں مہینا ہے۔ پر لچھو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"موڑی بھوکی رو رہی ہے!"

بھولا چپ ہو رہا۔ اس جواب کو سنکر تو ایک گیانی کو بھی چپ ہو جانا پڑتا! بھوک کو اور کس طرح ٹالا جا سکتا ہے؟ بھولا ہوگا پینتیس چالیس کے بیچ، ہاتھ پاؤں ٹھاٹرا اور ڈیل ڈول میں بھاری۔ بھری بھری تل چاولی موچھوں نے اسے زیادہ رعب دار بنا دیا تھا اور لالہ لچھمی نرائن نے اس کے رعب داب کی قیمت تیرہ روپے مہینا لگائی اور تسلیں اگانے پر نوکر رکھ لیا تھا۔ بھولا اگر کوئی کام کر سکتا تھا تو وہ تقاضا لگانا تھا اور تقاضے کی دھونس میں اس کی ہوشیاری کو کوئی دخل نہ تھا۔ بھاری بھرکم آدمی اور گرجدار آواز تقاضا کرتی تھی اور اس کا گلی بھر نکلتا ہوا لٹھ وصولی کرتا تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ قرضدار غریب تو خود اس جال سے نکلنا چاہتا ہے مگر ابھی ایک قرضے کی رقم باقی ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی حیلہ دوسرے قرضے پہ مجبور کر دیتا اور لالہ جی "کو" بھولا "کی ضرورت بنی رہتی ہے۔ نہ دینے کی بات۔ دوسری ہے کہ آدمی ادا کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

چار برس ہوئے بھولا کا بیاہ ہوا تھا۔ ایک ڈھائی برس کی بچی تھی۔ اور دوسرے کی تیاری تھی۔ بھولا کی تنخواہ ایک ایک دو دو روپیا کر کے مہینے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ سات آنے روز اور چار جانیں! ایک وقت کی بھی لنگا مارنہ جڑتی تھی۔ یہ تھی وہ جان لیوا ضرورت جس کے سامنے ہر احتیاط نظر نہ آتی اور مجبوری جہد ہو جاتی ہے! انیس برس کی عمر میں ایک بچی کو دودھ پلانا اور ایک کو پیٹ میں اٹھا کر مزدوری کے لئے جانا موت کو بلاوا دینا نہیں تو کیا ہے؟ پر بھوک کا ظالم تقاضا کچھ سوچنے کی مہلت ہی کب دیتا ہے!

لچھو کو کٹائی کرتے اور گٹھے اٹھا کر کھلیان پر ڈالتے آٹھ دن ہوگئے۔ ساڑھے تین آنے روز نے فاقے کو ٹال بھی دیا لیکن محنت اور گرمی نے لچھو کو ادھ مواسی کر دیا۔ نویں روز اس کی طبیعت بگڑنے لگی پر لچھو اسکا دھیان بھی نہ آیا کہ طبیعت کیوں بگڑ رہی ہے۔ ایک جان کار عورت نے اس کو گھر چلنے کو کہا بھی تو لچھو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ:-

"نا بھوجی، پنہری کٹ جائے گی میں کب سے پھر یا لالا نا کر رہی ہوں۔" پیٹ کی ضرورت اس کی نا سمجھی بنگئی۔

لچھو نے گٹھا بھاری باندھا کہ زیادہ پھیرے نہ کرنا پڑیں۔ گٹھا اٹھوایا تو اسے چکر آیا اور لچھو گر پڑی۔ گٹھا اس کے اوپر گرا۔ ساتھ والیاں اکٹھا ہوگئیں بچہ ہوتے دیکھا تو کچھ پردہ سا کر لیا اور جیسے تیسے اسے اٹھا کر برابر والی بگیا میں لے گئیں۔ بچی پیدا ہوئی۔ ایک عورت نے ہلنسے سے نال کاٹ کر کاٹ دی۔ دوسری نے بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹا۔ لچھو کا حال برا تھا۔ اس نے آنکھ کھول کر مرجھائے ہوئے سرخی مائل گیندے کے پھولوں پر نظر ڈالی۔ معلوم نہیں اس نے کیا سوچا۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کھیت پر کام کرنے والیاں دھوبا پوچھ کرتی رہیں۔

کام جلدی ختم کر کے مرد مزدور بھی بگیا میں آکر ذرا فاصلے سے بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے کو گاؤں میں کھٹولا لانے اور لالہ جی کے یہاں سے بھولا کو بلوانے بھیجا۔ اسی سے چار پیسے کا گڑ بھی منگوایا گاؤں کے لوگوں میں، انسانی ہمدردی، پاس پڑوس اور گاؤں گرام کا پاس لحاظ

ل - احمد

کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ انھیں اپنے سماجی فرض اور کرتو کی پہچان زیادہ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی ہمدردی انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے! اور دیہات کے رہنے والے فطرت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے شہر والوں کے مقابلے میں ان کے اندر آپس داری کا احساس اور دھیان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ مرد اور عورتیں جو ہونا چاہئے اور جو ہو سکتا تھا سب کر رہے تھے اور بھولا کو خبر بھی نہ تھی۔ بھولا کسی دوسرے گاؤں میں کام ڈھونڈنے کو گیا تھا۔ لوٹ آیا تو چھو کو بستر ڈال کر گھر پہنچایا گیا۔ گاؤں والوں نے سنا تو کسی کو اس بات پر اچنبھا نہ ہوا کہ بھولا کی استری آٹھ مہینے کا پیٹ لے کر مزدوری پر گئی اور راستہ چلتا ہوا کسی کو یہ احساس نہ ہوا کہ جاپا بگڑ جانے سے ماں اور بچہ دونوں کی جان جا سکتی ہے۔ جسا ن ہندوستان میں بہت سستی چیز ہے۔ سب چیزوں سے زیادہ سستی ہے! ہندوستان کے رہنے والوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جینا ہر آدمی کا حق ہے! یہاں کوئی نہیں جانتا کہ خوراک پیدا کرنا قدرتی حق ہے!

بھولا کے گھر سے اور سب تو چلے گئے مگر وہ عورت رہ گئی جس نے چھو کو گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے لوٹے میں دوپہر کا بچا ہوا تھوڑا مٹھا تھا۔ اور باجرے کی آدھی روٹی تھی۔ اس نے مٹھے میں وہ روٹی مسل کر بھوک سے روتی ہوئی بچی اور بڑھیا کو کھلا دی اور چھو کو گڑ کی ڈلی کھلاتی رہی۔ بھولا گھر میں پہنچا تو وہ نہ سمجھ سکا کہ اسے کوئی خوشی ہے یا رنج ہے۔ اسوقت اس کے احساس سنے جلے یعنی کھچڑی قسم کے تھے۔ اس نے چھو کے ماتھے پر ہات رکھکر بچی کے گال کو انگلی سے چھوا۔ بھولا کو اپنی بیوی سے سچ مچ پیار تھا اور اسوقت وہ اپنی محبت ظاہر کرنا بھی چاہتا تھا، مگر بلا دلا جیون اور لسی کٹی زندگی نے اسے اپنا پیار محبت ظاہر کرنے کی مہلت ہی کب دی تھی؟ غیر عورت کی موجودگی نے اسوقت بھی اسے ایسا نہ کرنے دیا۔

ایک ہریجن کسان نے قسط کے روپیوں کے ساتھ بھولا کو تھوڑا اناج بھی دیا تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا۔ اور اس پر لالہ جی برا بھی نہ مانتے تھے۔ وہ برا تو جب مانتے کہ ان کی قسط وصول نہ ہوتی اور بھولا کو اناج مل جاتا لیکن اسوقت وہ اناج بھی بھولا کے کام کا نہ تھا۔ کون پیسے کوٹے؟ کون لیکے ریندھے؟ وہ عورت بولی:۔

"لا بیرا آٹا ہے تو میں دو روٹی سینک دوں۔"

بھولا نے دیکھا تو آٹے کا ڈولا خالی تھا۔ بھولا نے کچھ نہ کہا وہ عورت سمجھ گئی۔ پھر بولی:۔

"اچھا لا میں چھو کا جے یا کا دلیا بنا دوں!" اس نے مٹھی بھر اناج اُبال دیا اور جو ذرا سا گڑ بچا تھا وہ ملا کر چھو کو پلا دیا۔

یہ عورت اپنے گھر چلی گئی۔ اسے لیٹا ہوا رہنا بھی تھا۔ بچیاں دونوں سو گئی تھیں، اور بڑھیا جاگتی ہوتی تب بھی سوتی برابر تھی۔ بھولا، چھو کی کھٹیا کے پاس بیٹھا اس کے ہات تھپ تھپاتا رہا اور اس کی آتما پر آشا د

نراشا کا آرہ چلتا رہا۔ وہ کبھی تو سوچنے لگتا کہ اسکا بس چلے تو چھو کو رانی بنا دے۔ گہنے پاتے سے لاد دے، گوٹے پٹھے اور ریشم مخمل سے ڈھک دے اور کبھی چھو کی ارتھی کا دھیان کرنے لگتا اور جب تھوڑی دیر یوں کا دھیان آتا تو وہی بھیانک نراشا اپنی صورت دکھاتی۔ بھولا نے ایک لمبی سانس لی اور جہاں بیٹھا تھا وہیں پڑ گیا۔

دوسرے دن وہ عورت مزدوری کرنے نہیں گئی۔ اس کے بدلے میں چھو کی گیوس کرنے آ گئی۔ مٹھا اور باجرے کی روٹی لائی اور اس کے ساتھ گڑ اجوائن بھی۔ بھولا کو اناج پسوانے بھیجا۔ ان کو کھلایا پلایا اور شام ہوتے اپنے گھر گئی۔ شام کے وقت چھو کو بخار ہو گیا اور دو دن نہ اترا۔ دوسرے دن وہ عورت مزدوری کر کے شام ہونے چھو کے پاس پہنچی۔ نہالے کر آئی تھی۔ روٹی پکا کر ان سب کو مٹھے کے ساتھ کھلا دی اور گڑ اجوائن اوٹا کر چھو کو پلایا۔ تیسرے دن چھو کو کھانسنا لگ گیا۔ بھولا اس حالت کو دیکھکر انسان کھو بیٹھا یا کہیئے کہ اس کے پیار محبت کا احساس ابھر آیا۔ وہ عورت آئی اور اس نے چھو کو کھتے بڑتے دیکھا تو بھولا نے پوچھا۔

"بھوجی، یا اچھی تو ہو جائے گی؟"

"رام بھلی کریں۔ جاپے کا دکھ ہے بھیا! اچھی کیوں نہ ہوگی! تو بیرا دید جی کو بلا لا"

بھولا نے سنا۔ وہ اپنے دل سے نراشا کو نکال سکتا تھا ورنہ ذرا کو ٹھٹکتے ٹھٹکتے اس کے مونہہ سے نکلا:۔

"پر وید جی ——" بھولا آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر وہ عورت سمجھ گئی۔

"لالہ جی سے کچھ کھرچ مانگ لیو بیرا" پھر کچھ یاد کر کے "ہاں بھیا چھوری کا بچے یا ڈ ایک دو دھ لیتا آئیو!"

بھولا پہلے لالہ جی کے پاس پہنچا۔ کچھ کہنے سے پہلے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مگر وہ کیا سمجھ کے رو رہا ہے؟ کیا اس خیال سے کہ بیوی بستر مرگ میں پڑی ہے اور بچیاں بھوکی ہیں؟ نہیں! بھوک بیماری کوئی نئی بات نہ تھی۔ آدمی کو مصیبت اٹھانے کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔ بیتا بیتا معلوم نہیں دیتی! تو کیا بھولا یہ سمجھ کے رو رہا کہ سے خرچ مانگنا پڑ رہا ہے؟ مگر یہ بھی اسے ہمیشہ ہی کرنا پڑتا تھا۔ آنسو اس لئے نہ روک سکا کہ اس وقت اگر لالہ جی نے انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گا! اسے اسوقت یہ بیماری کی بھاگ اور پرالبد اگر کوئی چیز ہے تو انسان ہی کے ہات میں ہے۔ ایک انسان کی تقدیر دوسرے انسان کی مرضی اور قبضے میں ہے! وہ اس وقت سمجھا کہ ایک انسان کی بپتا دوسرے انسان کے ٹالے ٹل سکتی ہے! اسوقت اسے لالہ جی کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوا۔ اگر وہ خرچ نہ دینگے تو چھو اور اس کی بچیاں بیماری اور بھوک سے مر سکتے ہیں —— مر جائیں گے! لالہ جی کی یہ قدرت بھولا کو اسوقت پرماتما کی شکتی معلوم ہوئی! منش پرماتما بنا لیتے ہے!

انسان نا ہو سکتا ہے! اس تھوڑی سی دیر میں بھولا کے دل میں لالہ جی کی طرف سے ان کی اس سنگدلی اور قدرت کی نا انصافی پر نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ لالہ جی کو اب جانور سے بھی بدتر کیڑے مکوڑے کی طرح سمجھ رہا تھا!

لالہ جی کے اس سوال پر کہ کیا بات ہے بھولا نے بتایا کہ :-

"چھوری روتی ہے کچھ کھڑاج چاہیئے۔"

لالہ جی بگڑ گئے اور جھلا کر کہنے لگے "آج دس بار مجھ سے اور سات روپیہ لے چکا ہے سامیوں سے، ناج بھی لایا ہے۔ روز روز میں کیا؟" یہ کہتے ہوئے لالہ جی نے جس پر شاہ جی بیٹھے تھے اسکا کونا اٹھایا اور چار چونیاں بھولا کے سامنے ڈالدیں "اب پھر نا مانگیو۔"

بھولا نے یہ باتیں پہلے بھی سنی تھیں۔ پر آج جب اسے پیسوں کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس بات پر اسے غصہ چڑھ آیا۔ یہ غصہ کیا خودداری کا احساس تھا؟ کیونکہ اسکا جی چاہتا تھا کہ ان چونیوں کو اٹھا کر لالہ جی کے منہ پر پھینک مارے۔ مگر جھیتی بچی بیوی اور روتی بلکتی بچیوں کی تصویر نے لالہ جی کی آڑ کر دی۔ اب اس کے سامنے لالہ جی نہ تھے، بلکہ لچھو پڑی کروٹیں بدل رہی تھی، بچیاں پڑی بلک رہی تھیں۔ بھولا نے خون کا سا گھونٹ پیا اور وہ دام اٹھا لئے۔ چپ چاپ وہاں سے چلدیا۔

اور وید جی سے بہو کی حالت کہی۔ وید جی نے چونا تمبا کو مسل کر پھانکا اور دوا کی پڑیا لے کر اسکے ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں بھولا نے بچی کے لئے دودھ خریدا۔

دن چھپ رہا تھا ڈوبتا ہوا سورج اداس تھا اس لئے اداس تھا کہ صبح وہ حسن ولیلے اور خوشی کا پیغام لے کر ہنستا ہوا نکلا تھا۔ آدم کی اولاد نے وہ خوشی اور مسرت ہر انسان تک نہیں پہنچنے دی —— چند لوگوں نے اسے اُچک لیا اور بہت سوں کو محروم مایوس کر دیا! صبح کو ہنستا ہوا نکلنے والا سورج شام کو اسی لئے اداس ہو کر ڈوب جاتا ہے کہ انسان ہی انسان کو سکھی اور خوشحال نہیں ہونے دیتا! اور اس طرح قدرت کا چاہا نہیں ہو پاتا۔

جھونپڑی کے اندر شام کا دھندلکا رہنے والوں کی اداسی کی پرچھائیں ابھرا تھا۔ لچھو غافل پڑی ہوئی گھر والوں کی مایوسی کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عورت لچھو کے پاس بیٹھی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ بہو چل بسی تو دو ننھی جانوں اور اندھی بڈھی کا کیا ہوگا! وید جی نے لچھو کو دیکھا اور حقیقت سنی تو بگڑ کر بھولا سے کہنے لگے :-

"گھر والی کو اس حال میں مجوری کرنے بھیجدیا! یا تو بڑی کمجور ہو رہی ہے۔ اور ان یہ کہ کتنی عمر میں دو جاپے ہو گئے۔ دن بھر دھوپ میں کٹائی کرنا پڑی اور اوپر سے گٹھے ڈھوئے! بس سمے سے پہلے جاپا ہو گیا۔ دوا تو یہ میں لایا ہوں۔ پر میری مانو تو اسکو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔"

وید جی کو یہ معلوم نہ تھا کہ لچھو کو مزدوری کرنے بھولا نے نہیں فاقوں نے دھکیل دھکیل کر بھیجا تھا۔

"وید جی......" اس عورت نے پلوے پیسے کھولتے ہوئے پوچھا پر فقرہ پورا نہ کر سکی۔

وید جی ضلع بورڈ کی طرف سے چالیس روپے مہینا تنخواہ پاتے تھے اور مفت بانٹنے کو دوائیاں ملتی تھیں۔ کہنے لگے :-

"دوا تو بازار سے لانے کی ہے، پر میں تو مفت میں بانٹا کرتا ہوں۔ یہ گریب ہے، جو چاہو دیدو۔"

عورت نے چار اکنیاں وید جی کے ہاتھ پر دھریں اور وید جی رخصت ہو گئے۔ اس عورت نے لچھو کو اٹھا کر گود میں لیا۔ بھولا نے ہاتھ پکڑے اور پڑیا پھانکا کر پانی پلایا۔ پھر اسے لٹا کر اس عورت نے بھولا سے کہا :-

"میرا لالہ جی کے پاس جا! وہ لڑیا دیدیں تو با کو شہر لے جا۔"

بھولا لالہ جی سے لڑیا مانگنے کو چلا تو اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے اڑے جا رہے تھے۔ اسے یقین نہ ہوتا تھا کہ لالہ جی لڑیا دیدینگے اور وہ لچھو کو شہر لے جا کر اسکا علاج کرا سکے گا۔ بھولا کے دل میں کڑواہٹ تو لالہ جی کی طرف سے اسی وقت پیدا ہو گئی تھی جب لالہ جی نے بھیک سے بھی بری طرح سے چار چونیاں دی تھیں۔ اب اس خیال سے کہ وہ لڑیا نہ دینگے، وہ کڑواہٹ غصے میں بدل گئی۔ اور اگر وہ دوسری طرح پر لچھو کو شہر لے جا سکتا تو شاید لالہ جی سے لڑیا مانگتا بھی نہیں۔ مگر مجبوری تو شیر کو بھیڑ بنا دیتی ہے۔ بھولا کو لالہ جی کے پاس لڑیا مانگنے جانا ہی تھا۔ وہ پہنچا تو لالہ جی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اب کیا ہے؟"

"گھر والی کا حال کھراب ہے، برا دھرا ہے۔ وید جی نے شہر کے اسپتال لے جانے کو کہا ہے۔ لڑیا مل جائے تو ——"

"لڑیا ورِیانا ہے۔ لڑیا آج ڈھوئے گی کہ شہر کو جائے گی!" لالہ جی نے سوکھا جواب دیدیا۔ وہ جس آدمی کے بل پر کمائی کرتے تھے، اس کے ساتھ اتنی رعایت بھی نہ کر سکتے تھے۔ لچھو مر گئی تو بپتا ان پر تھوڑی پڑیگی؟ وہ گئو رکھشا کے لئے چندہ دے سکتے تھے کہ دھرماتما کہلاویں! انسان رکھشا دھرم کب ہے؟

بھولا لالہ جی کے پاس سے نراش پلٹا، مگر اوپری طور پر وہ جتنا چپ تھا اس کی آتما میں اتنا ہی طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ اس وقت لالہ جی کو ایک موذی کیڑا جان رہا تھا جسے مار دینا ہی بھلائی ہے! بھولا سمجھ رہا تھا کہ دنیا کی بپتا پیسے کی لائی ہوئی ہے۔ اس کے بانی پیسے والے ہوتے ہیں۔ پیسے والے جن کے بل پر کمائی کرتے ہیں ان کو بھوکا ننگا رکھتے ہیں۔ انھیں سوچوں میں غصہ اور مجبوری کے بیچ میں اس کی آتما پسی جا رہی تھی۔ وہ گھر پہنچا اور اس عورت کو بتایا کہ لالہ جی

لڑیا کے لئے نٹ گئے۔"

عورت نے لالہ جی کے انکار کو کوئی انوکھی بات نہ سمجھا۔ آڑے وقت میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا! اگر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے وہ خود جو کرسکتی ہے کر رہی ہے! ایک شخص کا دھرم یہی ہے! لیکن انسان نہیں! لالہ جی پیسے والے ہیں، انسان ہوتے تو لالہ جی کیسے ہوتے؟ لیکن ہی ہوتے جیسی وہ خود ہے، جیسا اس کا گھر والا ہے، بھولا۔!

چھو بکے جا رہی تھی۔ اس عورت نے کپڑے کی پکاری سے چھوٹی بچی کو دودھ پلایا۔ پھر اپنے گھر کا بھی کھانا پکانا کرنا تھا۔ یہاں وہ کچھ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ جانے لگی تو بھولا نے اس کو ویدجی والے دام دینا چاہے وہ بولی:-

"چھو اچھی ہو جائے تو دیکھو بیرا ؟ ابھی رکھئے!" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی بھولا بھی چپ رہا۔ مگر ان دونوں کی چپ ایک سی نہ تھی۔

وہ عورت چلی گئی۔ بھولا اسی طرح چپ سوچتا رہا۔ چھو کو شہر کیسے لے کر آ جائے؟ گاؤں کا ایک دلال روپے کم کیا لے گا؟ اس کے پاس تو پورا روپیہ بھی نہیں ہے! شہر میں بھی کچھ خرچ ہوگا؟ اسی سوچ میں بھولا کا غصہ بڑھتا رہا۔ اس کے دل کی کڑواہٹ بڑھتی رہی۔ زندگی کی بے رحم حقیقت آنکھیں کھا رہی تھی! بھولا کا دل بول رہا تھا کہ چھو شہر کے اسپتال نہ گئی تو مر جائے گی۔ اسے لالہ جی کا دھیان تھا اور ان کی طرف سے انتہائی نفرت اور غصہ تھا۔ چھو بچ نہ سکیگی۔ اس خیال کے دل میں آتے ہی بھولا نے چھو کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بے تاب ہو کر پوچھنے لگا:-

"چنی کی ماں میں ہوں بھولا — تو کونا چینے ہے ؟" مگر چھو بکے جا رہی تھی۔ وہ کسی کو نہ پہچان سکتی تھی۔ اس وقت بھولا کے دل میں ایک تیر سا پھر گیا۔ اس کے دکھ اور غصے کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پیار محبت کی باتیں بھوک کا تو علاج ہو ہی نہیں سکیں موت کو کیسے روک دیتیں؟ اس وقت چھو کو ضرورت تھی کہ کسی اچھے ڈاکٹر حکیم کا علاج ہو اور سرمایہ داری دنیا میں حکیم ڈاکٹر پیسہ چاہتے ہیں، دوائیں بھی پیسے کے بغیر نہیں ملتیں! بھولا کو دھیان آیا کہ چھو کی طرح جانے کتنے انسان دکھ بیماری میں دوا نہ کر پاتے ہوں گے! دنیا میں زیادہ گنتی تو روز کنواں کھودنے اور پانی پینے والوں کی ہے بھولا کو یہ بھی دھیان ہوا کہ لالہ جی تسلیں بانٹتے ہیں اور وہ اگا کر لاتا ہے۔ وہ اگر محنت نہ کرے تو لالہ جی کی آدھی رقمیں تو ڈوب ہی جائیں۔ اس کے پاس بانٹنے کو روپے ہوتے تو ساری کمائی اس کے پاس رہتی۔ جن کے پاس پیسا ہے وہ کمائی کے رستوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور دوسروں سے محنت کرا کے خود موٹے ہوتے اور انھیں بھوکا مارتے رہتے ہیں۔ اسی قسم کے واہی تباہی سوتح بچار میں بھولا بڑی دیر تک پھنسا رہا اور پھر کی سی آنکھوں سے بے چین چھو کو دیکھتا رہا۔ اچانک چھو کا بکنا بند ہو گیا اور وہ پکارنے لگی:-

"گیندو! میری گیندو کو لاؤ!" بھولا کے بدن میں جیسے جان پڑ گئی ہو۔ اس نے خوش ہو کر بچی کو چھو کی بغل میں لٹا دیا۔ چھو پھر کہنے لگی:-

"گیندے کی کیاری میں ہونی — گیندو سندر تو ہے! یہ کہہ کر وہ پھر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی اور بھولا نے بچی کو اس کے پاس سے اٹھا کر دوسری جگہ سلا دیا۔ چھو غافل ہو کر پڑ گئی۔

بھولا فکر اور چنتا کی آگ میں جل رہا تھا۔ مگر نیند تو سولی پر آ جاتی ہے چھو نے پھر بکنا شروع کیا تو وہ جاگ پڑا۔

"ارے کوکرا رو رہے ہے!" چھو نے دہائی سی دی "مارو رے کوکرا کو مارو! کوکرا رو رہے ہے!"

"کوڈا ہے۔ وانو دور بھونکت ہے! سو جا!" بھولا نے کہا اور چھو کے ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ پھر چیخی۔ تو بھولا بولا:-

"مارے آؤں ہوں تو سو جا!" یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اس کے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے تھے۔ اور اس کا بس نہ تھا ورنہ ساری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ باہر بالکل اندھیرا تھا: بھولا کے دل اور دماغ کی طرح کالی رات تھی! نہ رات کا اندھیرا تھا! اندھیرا تھا اور سناٹا — موت کا سناٹا! بھولا پلٹ آیا۔

"ارے میں ناسمجھ گئی — کوکوا رو رہے ہے با کوکرا کو مارو! نکالو! کوکرا آنکھیں دکھا رہے ہے، پکڑو یا کو! ارے یا کی آنکھیں تو یا سی جلیں ہیں!" بکتے بکتے چھو اچانک اٹھ بیٹھی اور بات اس طرح، شانے جیسے کتے کو مار رہی ہو، اور بکتی ہوئی پڑ گئی۔

اس حالت میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ بھولا کی چنتا اور غصے کی حد نہ تھی۔ پو پھٹنے لگی تو چھو نے کروٹ لی اور چپ ہو کر پڑ گئی۔ فکر اور مجبوری کا پتلا بھولا اس کی چارپائی سے لگا بیٹھا اور چھو کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اس وقت کوئی اس کی جان کا خریدار ملتا تو بھولا پوری لاری کرایہ کر کے اسے شہر کے اسپتال پہنچاتا۔ مگر اس ہندوستان میں جان لیوا تو بہت ہیں پر ایسے موقعے پر کوئی جان کا خریدار بھی نہیں ہوتا۔ بچی جاگ پڑی تھی۔ اور بھوک سے رو رہی تھی دودھ کے لئے رو رہی تھی۔ بائی سکل والے دودھ لئے گھنٹے ہوئے شہر کو جا رہے تھے۔ بھولا گھر سے نکلا اور چاہا کہ ایک کو ٹھیرا کر چار پیسے کا دودھ لے۔ مگر وہ بائی سکل والا سنتا ہوا چلا گیا۔ بھولا کی بچی دودھ کے لئے رو رہی تھی اور یہ دودھ والا پیسے لے کر بھی اسے دودھ نہیں دینا چاہتا۔ ہوں ں! یہ دودھ شہر جلدی پہنچنا چاہئے، پیسے والوں کے بچوں کو دودھ جلدی ملنا چاہئے اور بھی بائی سکلیں دودھ لادے گزریں۔ مگر بھولا نے کسی کو نہ روکا۔ یہ دودھ شہر میں جا کر بکے گا۔ پیسے والے جتنا چاہے خرید لیں گے۔ اس میں کچھ پھینک پھینکا بھی جائے گا۔ پر اس میں بھولا کی بچی کا حصہ نہیں ہے! کیوں؟ کیوں نہیں ہے؟ یہ سوال بھولا کی آنکھ رہی اور بار بار کر رہی تھی اور بھولا کے دل میں

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

رابیل کے چند پھول

(افسانہ)

حجاب امتیاز علی

رابیل کے پھولوں کا گچھا ہاتھ میں لیا تو مہرو کے آنسو نکل پڑے اور اسکا دل ڈوبنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہال سے اوپر کی منزل میں چلی گئی۔

بیمار چھوٹی بہن کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں خشک کیں اور اک مصنوعی مسکراہٹ کی کوشش کرتے ہوئے وہ اندر چلی گئی۔

مریضہ آنکھیں بند کئے دیوار کی طرف کروٹ لئے یوں پڑی تھی، جیسے اس دنیا سے منہ موڑنے پر تل گئی ہو۔

مہرو چپ چاپ اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پر اس نے اپنے آپ کو بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"لیلیٰ"

"تم ہو آپا؟ ——" خفیف آواز میں مریضہ نے کہا۔

"ہاں لیلیٰ۔ یہ دیکھو۔ رابیل کے چند پھول میں تمہارے سرہانے گلدان میں سجانے لائی ہوں۔ یہ —— یہ زاہد نے بھیجے ہیں"

"سچ کہتی ہو آپا؟"

"ہاں"

"ان کے ساتھ انہوں نے کوئی خط نہیں دیا؟"

"نہیں"

"نہیں ——؟ بعض وقت عجیب خیالات میرے ذہن میں گھومنے لگتے ہیں۔ جیسے میں ناخواندہ مہمان ہوں۔ —— جیسے سب مجھ سے —— میری بیماری سے بیزار ہو چکے ہیں۔ سچ بھی ہے جو مریض تین مہینوں سے بستر پر پڑا ہو، اس کی تیمارداری کہاں تک کی جائے؟"

مہرو نے نظریں بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "کاش تم ایسی باتیں نہ کریں! تمہیں یہ خیال بھی کیسے گذرا؟ دیکھو، امی نے سترہ راتیں اور سترہ دن تمہاری خدمت کی، تمہاری پٹی سے لگی رہیں —— اور"

لیلیٰ نے جملہ ختم کیا: "اور پھر آپا؟ —— میرا زہر امی کو بھی لگ گیا۔ آہ بیچاری امی۔ انہیں بھی ٹائی فائیڈ ہو گیا اور وہ مجھے چھوڑ گئیں!"

مہرو چونک پڑی: "چھوڑ گئیں کیوں کہتی ہو؟ وہ ہسپتال میں داخل کر دی گئیں"

"مجھے سب معلوم ہے آپا —— اور ڈیڑھ مہینے پہلے جب میں نے ان کے متعلق پوچھا تھا تو تم نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ گھر واپس آ گئی ہیں"

"ہاں"

"مگر تو وہ مجھے دیکھنے اوپر نہیں آئیں۔ آہ میری امی —— ڈاکٹر نے انہیں نیچے کی منزل میں رہنے کی تاکید کی ہے۔ اسی لئے نا؟"

"ہاں! اس لئے کہ وہ کمزور ہیں" مہرو نے ضبط کر کے کہا۔

لیلیٰ کہنے لگی: "ان کے اچانک غائب ہو جانے سے میلاول زندگی ہی سے اچاٹ ہو گیا تھا کہ فرشتہ رحمت کی طرح میرا زاہد مجھے دیکھنے آ پہنچا۔ وہ دن رات میری چارپائی کے پاس بیٹھ کر میرا دل بہلایا کرتا، رابیل کے پھول گلدانوں میں سجاتا، اور اک بھینی بھینی نکہت اس ہمارے کمرے کے گوشے گوشے میں گھومتی پھرتی، اس طرح امی کے جانے کا غم اور اپنی علالت کی تکالیف اور بے قراریاں ہلکی ہو گئی تھیں۔ مگر پھر ——؟ میرے زہر نے زاہد کو بھی متاثر کر دیا۔ وہ بھی بیمار پڑ گیا۔ مگر اپنی علالت کے دوران میں بھی وہ نیچے کی منزل سے ہر روز تمہارے ہاتھ میرے نام محبت نامے بھیجتا رہا اور رابیل کے پھول —— اب تین دن سے زاہد نے بھی اچانک خط لکھنا بند کر دیا!"

مہرو کی آنکھوں میں آنسو بے اختیار ہو گئے اور وہ بت کی طرح چپ چاپ بیمار کے سرہانے کھڑی رہی۔

لیلیٰ نے نحیف نظروں سے دیکھ کر کہا: "آپا! تم رو رہی ہو کیوں؟"

مہرو نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا: "محض اس لئے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا لیلیٰ"

"اعتبار ہے آپا۔ ہمارا دن ہوئے جب زاہد کا آخری محبت نامہ تم نیچے سے لائی تو میں ان کی تحریر پہچان نہ سکی تھی ——"

"کیوں؟"

"... وہ بہت بگڑ گئی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ مرض نے اپنے زہریلے دانتوں کے نشتر انہیں بھی چبھو دئے ....

...... پھر دوسرے دن ان کا خط نہ آیا۔ حتیٰ کہ آج تین دن گذر گئے۔ کیا وہ بہت بیمار ہیں؟"

"... بیمار؟ نہیں۔ اب تو نہیں"

لیلیٰ چونک پڑی: "تمہارا مطلب ہے اب وہ بیمار نہیں رہے"

مہرو نے جبراً اپنے حلق سے آواز نکالی: "انہیں آرام کی اشد ضرورت ہے"

"آرام؟ ہر انکی سب سے بڑی راحت تو مجھے خط لکھنا تھی وہ آرام کس قسم کا کر رہے ہیں؟"

"لیلیٰ! خدا کے لئے مجھ سے سوال پر سوال نہ کئے جاؤ"

"بہت اچھا آپا۔ اب کوئی سوال

ذکر نہ کی گی۔

دو پہر ڈھلی ڈھلی اور اداس ہری المناک دوپہر تھی۔ فاختاؤں کے منہ سے بے اختیار مسلسل چیخیں نکلے جا رہی تھیں شاہ بلوط کے لمبے لمبے سائے رہ رہ کر یوں کانپ اٹھتے تھے جیسے کوئی جان بلب مریض آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔ کبھی کبھی کسی تناور درخت سے کوئی خزاں رسیدہ خشک پتا زمین کی طرف آہستہ سے اترتا۔ دور دور تک خاموشی اور ویرانی مسلط تھی۔

کیا یہ سچ نہیں ہے، کہ دل کی اندرونی ویرانیاں، بیرونی دنیا کے ہنگاموں کو بھی مردہ کر دیتی ہیں؟ انسان ہمیشہ اپنے اندرونی جذبات کو باہر کی چیزوں میں منعکس ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

یک لخت مہر نے چونک کر کہا: "تم چپ ہو گئیں لیلیٰ۔ خدانخواستہ پھر غنودگی تو طاری نہیں ہو رہی؟ کیا سوچ رہی ہو پیاری؟"

"میں گاؤں کی پن چکی کی کوکو سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ دنیا معروف ہے اور میں؟ بیمار اور معذور، بخار میں تپی جا رہی ہوں۔ جب بخار کی غنودگی کم ہوتی ہے تو میں اس دریچے سے باہر دیکھتی رہتی ہوں آپا۔"

"کیا دیکھتی رہتی ہو لیلیٰ؟"

لیلیٰ کہنے لگی: "وہ پہاڑی نظر آ رہی ہے آپ، جنہیں سینے ہوئے اس دور کی پہاڑی پر برف یوں جگمگایا کرتی تھی جیسے الماس۔ میں تب بھی بیمار تھی۔ امی میرے پاس ہوا کرتی تھیں۔ وہ موسم گذر گیا۔ پھر بہار آئی جنگل کا سبزی اور نارنجی پھولوں سے مہک اٹھا، کوئلیں چلانے لگیں میں تب بھی بیمار تھی۔ مگر زاہد میرے پاس ہوا کرتے تھے۔ وہ موسم بھی گذر گیا اور اب؟ خزاں آگئی ہے۔ دن بھر خزاں کے گرم جھونکے آپس میں جھگڑتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ میں اب بھی بیمار ہوں میرے پاس صرف یہ چند رابیل کے پھول رہ گئے۔ نہ امی رہیں نہ زاہد۔ ادھر لاؤ آپا۔ ان پھولوں کو بکھیر ڈال دو۔"

مہر نے کانپ کر کہا: "پھول ادھر تھوڑے ہی ڈالے جاتے ہیں؟ کیوں ایسی باتیں کرتی ہو؟"

"...... غلطی ہوئی آپا۔ اچھی بات سنبھال کر رکھدو۔ دریچے سے باہر دیکھتی ہو؟"

"کیا؟"

"آواز کیسی ہے؟"

"خزاں کے سوکھے پتے زمین پر اتر رہے ہیں۔"

"یعنی! خزاں نے ان میں سے زندگی کا عطر نچوڑ لیا اور وہ لاش کی طرح زمین پر گر رہے ہیں۔ حرارت زندگی ان میں باقی نہ رہی .... آپا میرا درجۂ حرارت کتنا رہتا ہے؟ (بہن کو خاموش دیکھکر) دیکھو تم نے مجھ سے کہا تھا کوئی سوال نہ کرو۔ میں بھول گئی۔"

"اب تمہارا بخار کچھ کم رہنے لگا ہے لیلیٰ۔"

"ہاں۔ اک دفعہ تمہارے جانے کے بعد میں نے ہاتھ بڑھا کر چوری سے تھرمامیٹر اٹھا کر دیکھ لیا تھا۔ ۱۰۳ درجہ پر تھا۔ میرا بخار اس سے نیچے کیوں نہیں اترتا آپا؟ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں اس بخار کی حرارت سے کہیں بھاپ بنکر نہ اڑ جاؤں۔"

"اڑ جاؤں؟"

"ہاں۔ وہاں۔ جہاں رابیل کے پھول کھلتے ہیں۔"

"لیلیٰ"

"ہاں کیوں آپا؟ تم ایسی سہمی سہمی کیوں ہو؟ اور گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ کوئی آواز نہیں ——— کسی کے قدم کی آہٹ نہیں ——— کوئی ملنا پھرنا کیوں نہیں؟ کائنات میں ایسی اداس اور المناک دوپہریں شاید پھر کبھی نہ آئیں گی۔ تین دن سے کیا ہو گیا ہے آپا؟"

"لیلیٰ آج تم باتیں بہت کر رہی ہو۔ مجھے ڈر ہے تھک نہ جاؤ۔"

"تو کیا ہو جائے گا۔ تھک جاؤنگی تو سو رہونگی۔ جی چاہتا ہے کچھ دیر باتیں کرلوں۔ پھر آخر سونا ہی ہے۔ گذشتہ چھ دن میں بخار کی شدت سے لاش کی طرح ساکت پڑی رہی اور نہ جانے ان تین مہینوں میں کتنے دن ایسے آئے جب میں خاموش اور ساکت پڑی رہی مگر آج ——— رابیل کے ان چند پھولوں نے مجھپر حقیقت کھولدی اور مجھے بولنا پڑا۔"

"کیسی حقیقت لیلیٰ؟" بے چین ہو کر مہر نے پوچھا۔

"زندگی اور موت کی۔"

"پھر تم نے وہی باتیں شروع کر دیں۔"

"میرا مطلب ہے یہ رابیل کے زندہ پھول ——— ایک ہی رات کے مہمان ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھکر تمہیں موت کا خیال نہیں آتا آپا؟"

"نہیں" مہر نے لرز کر کہا۔

"مجھے آتا ہے پہلے جب زاہد خط کے ساتھ پھول میرے پاس اوپر بھیجتے تھے تو مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ننھے ننھے پھول محبت کا اک طویل جملہ ہیں۔ مگر اب؟"

"اب خیال کیوں بدل گیا؟"

"اس لئے کہ پھولوں کے ساتھ کوئی دستی خط نہیں آیا۔ (یک لخت) آپا! کیا تم مجھے نیچے کی منزل میں لے چلوگی؟ خیال تو کرو تین مہینوں سے میں اوپر ہوں، مجھے نیچے لے چلو۔"

مہر گھبرا سی گئی: "نہیں نہیں لیلیٰ۔ تم نیچے نہیں جا سکتیں۔"

"کیوں نہیں آپا ——— ؟ میری آپا۔ مجھے گود میں اٹھا لو۔ بیماری نے مجھے ہلکا کر دیا ہے۔ تم آسانی سے زینے طے کر لوگی۔ میں نیچے باغ میں

اس درخت کو دیکھنا چاہتی ہوں جس کی ٹہنی پر چیل نے گھونسلا بنایا تھا اور جس کے نیچے تم اور میں ٹہلا کرتی تھیں اور اسی سخن کاری میں مصروف ہوا کرتی تھیں۔ وہ تندرستی کا زمانہ تھا۔ وہ مہندی کے سائے ——— وہ باغ کی شکستہ دیوار۔ جس پر چڑھ کر کھیل ہاریں ہم نے بیر توڑے تھے۔ ——— پھر میں نیچے کے کمرے دیکھنا چاہتی ہوں جہاں زندگی کے خوشگوار دن گزرے۔ جن دیواروں کے سائے تلے بچپن گذرا، آپا ——— ایک بار ——— مجھے نیچے لے چلو۔"

نیرو بے ضبط ہوگئی "یہ تمہاری ضد تھی۔ کسی دن یہ سامنے والی لمبی ٹہنیوں والا پیڑ جسے میں مسلسل تین مہینوں سے دیکھ رہی ہوں، ایسی کوئی شاخ اتنی لمبی کر دے گا کہ وہ کمرے میں پہنچ کر مجھے باہر اٹھائے جائیگی اور میرا بستر خالی ہو جائے گا (یکلخت چیخ کر) آپا ——— "

نیرو کے ہوش اڑ گئے "کیا ہے لیلی؟"

"آہ وہ دیکھو"

"کیا؟"

"وہ رابیل کے پھول" لیلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھکر کہا۔

"گلدان میں رکھے تو ہیں؟"

"نہیں کیا ہوا؟ ——— انہیں کیا ہو رہا ہے آپا؟ ———

——— دیکھنا ——— وہ کمہلا رہے ہیں"

کانپ کر نیرو نے کہا "تمہارا خیال ہے لیلی"

"نہیں نہیں میں نے تمہاری ساری باتوں کا یقین کر لیا۔ اب تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔ وہ کمہلا رہے ہیں۔ وہ ——— وہ ——— ہائے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں، غائب ہو رہے ہیں"

"لیلی لیلی تمہیں کیا ہو گیا؟"

"خدا کے لئے انھیں اپنے ہاتھ میں لے لو آپا۔ ورنہ وہ بھی ہم سے جدا ہو جائینگے ——— وہ دیکھو وہ تمہارا گلدان خالی کر گئے۔ اب اس میں رابیل کا ایک پھول بھی باقی نہ رہا۔ گلدان خالی ہو گیا ——— نیچے بھاگ کر جاؤ آپا اور دیکھ آؤ ——— امی اور زاہد کی چارپائیاں تو خالی نہیں ——— ؟ وہ خالی چارپائیاں ——— وہ خالی گلدان ——— وہ رابیل کے چند پھول اور ———"

اور وہ خود رابیل کے پھولوں کی ہوشربا نکہتوں کے تعاقب میں نہ جانے کس نامعلوم دنیا کی طرف پرواز کر گئی!

کروٹ ——— بقیہ صفحہ ۷۶

کڑواہٹ گھر کر رہی تھی۔

بھولا گانوں میں سے چار پیسے کا دودھ لایا اور بچی کے منہ میں چوانے کی کوشش کرنے لگا۔ دودھ نہیں پیتا تھا اور دس گرتا تھا۔ اتنے میں وہ عورت آ گئی۔ اور پہلے بچی کو دودھ پلانے بیٹھ گئی۔ بھولا نے اسے بتایا کہ صبح ہوتے چھبو کو نیند آگئی ہے۔ بچی کو دودھ پلا چکی تو اس عورت نے چھبو کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ماتھا ٹھنڈا برف ہو رہا تھا۔ بھولا بولا:-

"بھوجی، ابھی سو دن دے ———"

"ہاں، بیٹا، لمبی نیند! چھبو تو سدھار گئی!"

ان لفظوں میں کس بلا کا طوفان بند تھا جو بھولا کی آتما کے اندر برپا ہو گیا! بھولا پل بھر میں دوسرا ہی آدمی بن گیا۔ وہ گھنٹہ بھر پہلے کا انسان نہ تھا کہ بائی سکل پر دودھ والا نکلا چلا گیا اور بھولا کے روکنے سے نہ رکا۔ اس وقت اگر کوئی بائی سکل والا اس کے روکے نہ رکتا تو وہ اسے چلا نہ جانے دیتا۔ اس وقت وہ نہ دودھ کو رہنے دیتا نہ دودھ والے کو۔ بھولا خود بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دوسرا ہی انسان ہے! دوسرے پاؤں تک غصہ تھا۔ اسپر یہ بات رس گئی تھی کہ چھبو کی موت لالہ جی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اسے اپنے صدمے کا احساس نہ تھا۔ بیوی کے مرجانے کا غم نہ تھا، وہ بس سوچ رہا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ ہیں اور لالہ جی کی گردن! بھولا کے پاؤں خود بخود لالہ جی کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔

لالہ جی کا تخت خالی تھا۔ وہ گھر میں تھے۔ سامنے چھپر میں کٹی کی ہوئی پڑی تھی اور پاس ہی گنڈاسا پڑا تھا۔ بھولا کی نظر گنڈاسے کی چمکتی دھار پر پڑی تو اس کا جی کھل گیا۔ چھبو کی موت کا علاج یہ ہے! لالہ جی نے لڑیا نہیں دی۔ لالہ جی نے چھبو کو مارا۔ لالہ جی کیوں جئیں! چھبو کی طرح دوسروں کو مارنے کے لئے لالہ جی نہیں جی سکتے! بھولا گنڈاسا اٹھا کر پلٹا تو دروازے میں سے لالہ جی باہر آئے۔ بھولا نے یہ کہتے ہوئے کہ "چھبو مرگئی، تم بھی نا جیو گے!" ایک ہاتھ مارا۔ یہ لالہ جی کے کندھے پر پڑا۔ لالہ جی گرے تو دوسرا ہاتھ گردن پر پڑا۔ اس کے بعد بھولا نے لالہ جی کے منہ پر تھوکا اور گنڈاسا وہیں ڈال کر بڑے اطمینان سے تھانے کی طرف ہو لیا۔ راستے میں جن دو چار آدمیوں نے دیکھا ان میں سے کون خیال کر سکتا تھا کہ بھولا لالہ جی کا خون کر آیا ہے۔ تھانے میں پہنچکر بھولا نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

معاصرین سے درخواست ہے کہ جب آج کل کا کوئی مضمون اپنے اخبار یا رسالہ میں نقل کریں تو اس کا حوالہ ضرور دیں اور اس پرچہ کی ایک کاپی دفتر آجکل میں ارسال فرما دیں۔ ——— ادارہ

——— خط و کتابت ———

کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ۔ (ادارہ)

قلوپطرہ کی ایک رات

ایک فرانسیسی افسانے کا ترجمہ

اثر لکھنوی

میامن غیر معمولی اطوار کا نوجوان تھا۔ وہ باتیں جن سے فانی انسان اثر لیتے ہیں اس کی لوح دل کو سادہ چھوڑ جاتی تھیں۔ وہ ایک بلند تر نسل سے معلوم ہوتا تھا شاید کسی دیوتا کے پوشیدہ و ناجائز معاشقہ کا ثمر تھا۔ اس کی نہ جھپکنے والی آنکھیں بازوں کی طرح سکون اور دل کے پار ہونے والی طاقت تھی۔ شفاف پیشانی سے متانت جلوہ گر تھی، گویا سنگ مرمر کے تخت پر متمکن ہے۔ اور پھر کے ہونٹ ہیں خفیف سا خم تحکم و عالی حوصلگی کا ترجمان تھا۔ نتھنے آتش مزاج گھوڑے کے نتھنوں کی طرح پھولتے اور پھڑکتے تھے۔ اس کی خوبصورتی میں نوجوان لڑکیوں کی نزاکت تھی اور زنانے دیوتا ڈائیونیسس کا سینہ بھی اس قدر گول اور چمکیلا نہ ہوگا۔ تاہم اس کے نرم جسم میں فولادی پٹھے اور ہرکلیس کی طاقت مخفی تھی۔ عورت کے حسن اور مردانی قوت کا امتزاج وہ نادر عطیہ ہے جو بعض قدیم ہستیوں میں پایا جاتا تھا۔

رنگ کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے معیار سرخ و سپید کے خلاف نارنگی کی طرح زردی مائل تھا۔ لیکن اس وجہ سے اس کی انتہائی دلکشی میں خلل واقع نہیں ہوا، بلکہ سرخ نسل اور قوم اور رنگ کی عورتیں اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں۔

باوصف ان تمام خوبیوں کے میامن خواہشات نفس کا بندہ نہ تھا۔ غالباً عہد پاستاں کے پراہم کی خاکستر اور پہاڑوں کی برف بھی اسقدر بے حس اور خنک نہ ہوگی۔ وہ نوجوان زاہد جو سبد مبوس میں بارگاہ آئسس میں باریابی کے لئے ریاضت کر رہا ہو اتنی پاکیزہ زندگی بسر نہ کرتا ہوگا۔ وہ کمسن دوشیزہ جو اپنی ماں کی ملامت آمیز نگاہ سے کانپ اٹھتی ہے ایسی پاکدامن نہ ہوگی جیسا کہ یہ نوجوان تھا۔

میامن شرمیلا اور تنہائی پسند تھا مگر اس کے مشاغل تفریح عجیب و غریب تھے۔ گینڈے کی کھال کی چھوٹی سی ڈھال، خمدار خنجر، مثلث نما کمان اور سانپ کی پوست کا ترکش جس میں تین بھال کے تیر ہوتے لے کر گھر سے چپ چاپ منہ اندھیرے نکل جاتا اور صحرا کی سیدھ باندھتا، وہاں اپنے مرکب کو جس کی کلائیاں پتلی، تھوتنی چھوٹی اور ایال پریشان تھی جولاں کرتا، یہاں تک کہ مادہ شیر ببر کے پنجوں کے نشان ملتے۔ اس کے لئے سب سے بڑا شکار یہ تھا کہ شیرنی کے بچوں کو اس کے پیٹ تلے سے چھین لے کسی چیز سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی خطرات مقامات سے مقابلے میں۔ دشوار گزار راستے طے کرنے میں اس کو غضب کی مسرت ہوتی۔ دریا کے تیز دھارے کو چیرتے ہوئے پیرنے میں اسے بے حد لطف آتا اور اگر انتخاب کا موقع ملتا تو وہ دریائے نیل میں شاید اس جگہ نہاتا جہاں آبشار کی چادریں گرتی اور پھیلتی ہیں۔ تعرب پایاں ہمیشہ اسے دعوت دیتا تھا

یہ تھا میامن میڈ وشونس کا فرزند۔

کچھ دن سے اسکے شغلے اور زیادہ وحشیانہ ہو گئے تھے۔ کئی کئی مہینے اپنے تئیں سمندر سے مشابہ ریگستانوں میں دفن کر دیتا اور صرف شاذ موقعوں پر شہر میں صورت دکھاتا۔ فکرمند ماں مکان کی چھت سے چشم براہ رہتی۔ شدید و طویل انتظار کے بعد ایک بگولہ افق پر نمودار ہوتا اور رفتہ رفتہ اس کے دامن سے آلودہ گرد میامن ظاہر ہوتا، گھوڑی پر سوار جو بھیڑیے کی طرح لاغر ہوتی جس کی آنکھیں سرخ ہوتیں گویا خون ٹپکنے کو ہے، نتھنے پھڑکتے ہوئے اور پہلو نگاہ جو مہمیز کے نشان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ گھر پہنچکر شیر یا لگڑ بھگے کی کھال اپنے کمرے میں لٹکاتا اور پھر غائب ہو جاتا۔

تاہم میامن چاہتا تو اس سے زیادہ کوئی شخص مسرور و شادکام نہ ہوتا کیونکہ مہنت تومونس کی لڑکی نفتی اس سے محبت کرتی تھی ایسی قبول صورت دوشیزہ دور دور نہیں تھی۔ ایک میامن ہی تھا جسکو اسکی جادو بھری آنکھوں کا علم نہ تھا حالانکہ ان کے جھوکوں سے مستانہ کرشمے جھانکتے تھے، اس کا تبسم رنگین لعل شب تاب کو شرماتا، دانتوں کی صفا و ضیا گوہر آبدار پر خندہ زن ہوتی۔ بازو لطیف طرز سے گول تھے۔ آئسس کے مجسمہ کے پائے زمردیں بھی ایسے بے ڈھنگ ترشے ہوئے نہیں تھے جیسے اس دوشیزہ کے تھے۔ مصر کے شہر خوبی میں کسی لڑکی کے ہاتھ ایسے چھوٹے اور بال اتنے لمبے نہیں تھے۔ نفتی کی رعنائیوں کو اگر کوئی ماند کر سکتا تھا تو وہ قلوپطرہ کا جمال بے مثال تھا۔ لیکن کس کی مجال تھی کہ قلوپطرہ کے عشق کا خواب دیکھتا؟ جونز کا دلدادہ آکسئن جب اس کو (جونو) کو آغوش میں لینے کیلئے بڑھا تو بجز ابر عرق ناک کچھ نہ پایا اور اب دوزخ میں پہیا گھما رہا ہے۔

وہ! میامن قلوپطرہ پر عاشق تھا۔

ابتداء اس نے کوشش کی کہ اس لایعنی جذبہ کو فنا کر دے اور اس سے دست بدست جنگ کی، مگر محبت شیر نہیں جس کا گلا گھونٹا جاسکتا ہے، بڑے بڑے پہل اسکے مقابلے میں نیچا دیکھتے ہیں۔ زخم پیر پیوست تھا اور میامن اسکو سینے میں چھپائے ہوئے پھرتا تھا۔ قلوپطرہ کی تابناک تصویر جس کے سر پر طلائی کنگروں کا تاج اور شاہی بھنی ملبو زیب بدن تھا میامن پر سوتے جاگتے اپنی سیماب شعاعیں ڈالتی رہتی تھی

اس نا عاقبت اندیش انسان کی طرح جو آفتاب سے آنکھیں لڑائے جس کے بعد ایک گرفت میں نہ آنے والا تابندہ حلقہ ہر لحظہ پیش نظر رہے۔ میامن قلوپطرہ کو دیکھا کرتا تھا۔ عقاب آفتاب کی طرف بغیر خیرہ چشمی دیکھ سکتا ہے، لیکن کون سی ٹھہرائی ہوئی پتلیاں ہیں جو ایک خوبصورت عورت کو بلا خوف سرزنش دیکھ سکیں... ایک حسین ملکہ کو دیکھ سکیں؟

میامن کی زندگی یہ تھی کہ شاہی محلوں کے گرد پھرا کرتا اس لئے کہ وہی ہوا اس کے انفاس میں شامل ہو جسے قلوپطرہ کے جسم سے لمس کا شرف حاصل ہوا ہے، اس کے موہوم نقش پا کو بوسہ دے جو ریگ زار پر رہ گیا ہو۔ افسوس یہ نعمت بھی شاذ ہی میسر آتی تھی۔ مقدس تہواروں اور تبرکوں کے موقع پر جلوس کے ساتھ ہو لیتا کہ شاید اس کی آنکھوں کی ایک جھلک ہی دیکھ لے یا اس کے حسن کی ہرآن بدلنے والی اداؤں میں سے کسی کو بہ نگاہ خیرہ چرا لے۔

بعض اوقات اپنی تشنگی شوق سے جیا آتی اور سپیر و نسکا رہیں زیادہ شوریدگی سے منہمک ہو جاتا۔ اس کی سمی ہوتی کہ خوفناک ندیوں کے التہاب کو قابو میں رکھے اور خواہشوں کو جنون کا راستہ اختیار نہ کرنے دے۔

دوپہر ماتس کے تیرھ کو گیا، ایک موہوم امید تھی کہ ملکہ کو اپنی موسم گرما کی جائے قیام کے مقابل بجرے سے اترتے دیکھ لے گا۔ ڈونگی کھیتا ہوا پہنچا اور تکلیف محسوس نہ ہوتی باوجودیکہ غضبناک آفتاب کی شعاعیں برچھیاں چلا رہی تھیں اور دھوپ اتنی تیز تھی کہ ہانپتی ہوئی اسفنکس کو بھی اپنے آگ کی طرح تپتے ہوئے سنگ سرخ کے اڈے پر پگھلے ہوئے پتھر کی شکل میں پسینا آ جاتا۔

"کسی ملکہ سے محبت کرنا عجیب مناظر پیش کرتا ہے۔ گویا کسی ستارے سے آنکھ لڑ گئی جو ہر شب آسمان پر چمکتا ہے۔ یہ ایک قسم کی بے اسرار جاتے ملاقات ہے۔ معشوق وقت معہودہ پر ملتا ہے اور دیکھنے اور رکھنے سے ناراض نہیں ہوتا، مگر دسترس سے باہر ہے آہ! بد نصیبی! افلاس ہے، گمنامی ہے، ناکسی ہے، نرو بان کے نیچے بیٹھا ہوں، دل ہی ٹے کا گرویدہ ہے جو پاک و سنجیدہ ہے، عظیم ہے، پر تنویر ہے، ایک ایسی عورت سے جس کی ادنیٰ ترین خادمہ بھی مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ بدقسمتی سے دل اس پر آیا جو میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی اور نہ کبھی دیکھے گی، جس کے نزدیک عامتہ الناس کے سمندر میں بھی ایک لہر ہوں۔ میرا اس کا ہزار مرتبہ بھی سامنا ہو تو ہزار مرتبہ نہ پہچانے گی، گفتگو کا موقع بھی آئے تو ایسی احمقانہ جسارت پر نہ ابھارے گی۔ میرے پاس نہ تو شاعر کا دماغ ہے نہ غیر معمولی جودت نہ اور کوئی مافوق الانسان صفت ہے۔ محبت ہے، صرف محبت۔ حسن، شوکت، دبدبہ، صولت اور دوسری عظمتوں کے مقابل جن کا خواب انسان دیکھ سکتا ہے میں کیا پیش کرتا ہوں۔ صرف محبت یا جوانی! گویا یہ بڑی نایاب چیز ہیں ہمیا!"

میامن ان خیالات سے از خود رفتہ ہو گیا۔ ریگ پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور ٹھوڑی ہاتھ پر جما کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلۂ افکار میں کھو گیا۔ سینکڑوں منصوبے باندھے جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ ناقابل عمل تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا مقصد ناممکن الحصول ہے لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ باز آئے ...... دغاباز امید کوئی نہ کوئی جھوٹا وعدہ کان میں پھونک دیتی!

اس نے گہری آواز میں کہا۔ "ہاتھور (قسمت کی دیوی) اے عالیشان دیوی میں نے تیرا کیا قصور کیا ہے جو اس مصیبت میں مبتلا ہوں۔ کیا اس بے اعتنائی کا انتقام لے رہی ہے تیسیر سے پجاری تو ہوتس کی بڑی نفتی سے برتی؟ کیا تیرا یہ منشا تھا کہ یونان کی لامیس کو ٹھکرا دیتا؟ یا روما کی بازاری عورت فلورا کی پذیرائی سے انکار نہ کرتا؟ کیا میری یہ خطا ہے کہ تیری حریف قلوپطرہ کے سوا اور کسی کے حسن و جمال کو خاطر میں نہیں لاتا؟ تو نے میرے دل میں ایک ناممکن محبت کا زہر آلود تیر کیوں لوٹڑ دیا ہے؟ کیسے تحفے اور کس قربانی کی خواہش ہے؟ کیا تیرے واسطے سٹن (مصر کا ایک شہر) سے گلابی سنگ مرمر کا مندر تعمیر کروں جس کے ستونوں پر سنہری تاج ہوں، چھت ایک ہی سنگ زرخیاں کی ہو اور ممفس کے بہترین صناع نقش کندہ کریں؟ جواب دے!"

تمام دیوتاؤں اور دیویوں کی طرح جنہیں انسان پکارتا ہے ہاتھور نے بھی خاموشی اختیار کی۔ میامن نے جان پر کھیل جانے کا عزم کیا۔ ادھر قلوپطرہ نے بھی ہاتھور دیوی کو مخاطب کیا اور کسی نئی خوشی اور نامعلوم تجربہ کی خواہش ظاہر کی۔ کوچ پر کاہلانہ آسائش سے لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ خواصوں کی تعداد کس قدر کم ہے اور بہتر سے بہتر سامان عیش سے طبیعت کتنی جلد اوب جاتی ہے۔ کسی ملکہ کو وقت گزاری میں کیسی کیسی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ غلاموں پر زہر کی آزمائش کرنا، آدمیوں کو درندوں سے لڑانا، یا تیغ زن کو تیغ زن سے، محلول موتی پینا، پورے کا ..... پورا صوبہ ہضم کر جانا سب عامیانہ اور بے مزہ کارنامے ہیں!

اس کی کنیز خاص چارمین کی عقل گم تھی کہ ملکہ کی دلچسپی کا کیا سامان مہیا کرے ...... یکایک سنسناہٹ کی آواز آئی اور ایک تیر دیوار کی چوبی روکار میں پیوست ہو کر لچکنے لگا۔ قریب تھا کہ قلوپطرہ کو مارے دہشت کے غش آ جائے۔ چارمین نے کھڑکی سے سر نکال کے دیکھا لیکن دریا میں ایک جگہ تھوڑے جھاگ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ پاپیرس

(کاغذ) کا ایک ٹکڑا تیر کے سرے میں بندھا ہوا تھا اور اس پر جلی حروف میں یہ عبارت درج تھی: "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

قلوپطرہ کو اس رات صبح سے پیشتر نیند نہ آئی۔ یہ وہ وقت وہ ہوتا ہے کہ خواب پرواز کرتے اور باطنی دانت کے دروازے سے دوبارہ اپنے مسکن میں داخل ہوتے ہیں۔ قلوپطرہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے مختلف چاہنے والے دریا میں تیر ... اور پھر کر دیوار در پر چڑھنے لگے تاکہ اس تک رسائی ہو۔ خواب میں عالم بیداری کی اتنی یاد بھی شامل تھی کہ ایسے تیروں کی بارش ہو رہی ہے جن سے پیمان محبت آویزاں ہیں۔ خواب میں اچھل پڑی۔ ورنھی ننھی ایڑیاں چارمن کے سینے کو ٹھوکرے دیتیں جو پائنتی لیٹی ہوئی تکیہ کا کام دے رہی تھی۔

قلوپطرہ حمام پہنچی۔ ایک باغچہ رمن کے نشانے پر تھا۔ کم سے کم تیس قدم پیدل چلی۔ آلودہ تھی تھکن اور قدر تعب! اس کے رخساروں کی باریک، مگر خواہشات کے سبب سے زرد جلد کی تہ میں گلابی رنگ کی ایک لہر نے تازگی پیدا کر دی تھی۔ کنپٹیوں سے جو عنبر کی طرح سنہری تھیں نیلی رگوں کا جال نمایاں تھا۔ پیشانی ہندمالی پیشانی کی طرح تنگ مگر مدور، ساخت میں مکمل اور تابندہ تھی۔ ایک لاجواب زاویہ نے اسکا اتصال ایسی ناک سے پیدا کیا تھا جو تواں اور بلند تھی۔ گویا پتھر میں خراد دی گئی ہے۔ نتھنے گلابی تھے اور خفیف سے خفیف جذبہ پرستی بھری شیرنی کے نتھنوں کی طرح پھڑکنے لگتے تھے۔ دہانہ چھوٹا، گول اور ناک سے قریب تھا، اوپر کا ہونٹ حمدار جس سے نخوت ٹپکتی تھی لیکن نیچے کے ہونٹ کی تیز سرخی ... تو جھلک بے غل وغش عیش پسندی اور انتہائی انہماک زیست کی غماز تھی۔ آنکھیں تم بادامی بھویں نیلی اور قریب قریب غیر واضح۔ بہت دشوار ہے کہ پورا حلیہ اس طرح بیان ہو کہ تمام رعنائیوں کا صحیح اندراج ہو سکے۔ کبھی شمع فروزاں تھی، کبھی گل پژمردہ۔ ایک چمکیلی رنگینی ٹھہر تی تھی جو خود آئیسس (مصری دیوی) کے لئے مخصوص ... ہر نگاہ ایک شعر تھی ہومر یا مینزلن کے اشعار سے شگفتہ تر۔ زقن سے حکومت و قدرت ظاہر ہوتی تھی اور اس طرح اس دلکش چہرے کی تکمیل ہوئی تھی۔

جب حوض کی پہلی سیڑھی پر تن کر قدم رکھا تو اس کا انداز حسن تمکنت سے لبریز تھا۔ گردن بلند اور قدرے پشت کی جانب کھنچی ہوئی۔ ایک پاؤں ہوا میں معلق گویا کوئی دیوی اپنے استھان سے اٹھی ہے مگر رخ ابتک آسمان کی طرف ہے۔ قبا میں دو ابیلی شکنیں تھیں یا دو موجیں جو سینے کے ابھار سے چشمہ کی صورت میں زمین تک پہنچ گئیں۔ اگر کلیومینیس اس کا ہم عصر ہوتا اور درشن بھی پاتا تو اعتراف عجز و ناکامی میں اپنا طیار کردہ مجسمۂ وینس (زہرہ) توڑ ڈالتا۔

پانی میں داخل ہونے سے پہلے ایک نئی ادا سوجھی۔ چارمن کو حکم ہوا کہ میرکا ریور جو ایک روپہلی جالی تھی بدل کر کنول کے پھولوں کا تاج ریشے سے گندھا ہوا لائے۔ "میں اس وقت پانی کی دیوی ہوں" قلوپطرہ نے ہنس کر کہا۔

چارمن نے تعمیل کی۔ بال قید سے آزاد ہو کر رود ظلمات کی طرح شانوں پر پھیل گئے، کچھ حلقہ حلقہ پختہ خوشہ ہائے انگور کی طرح عارض سیمیں پر لٹکے۔

ململ کی قبا جس کو صرف ایک سنہری گرہ روکے ہوئے تھی شانوں سے ڈھلکائی گئی اور مرمریں جسم سے مس ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ سفید کہ ابر کی طرح پاؤں پر گری جس طرح ہنس لیڈا کے قدموں پر جھکا تھا ... لیکن میامن کہاں ہے؟

آہ قسمت کی ستم پروری! اتنی بے جان چیزیں تو مورد الطاف ہیں، ان میں سے ایک بھی اس غریب عاشق کو نشاط بے اندازہ دے سکتی ہے۔ ہوا معطر سلفہائے زلف سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے یا رشک گلبرگ ترلبوں کو گستاخانہ چومتی ہے۔ پانی ہرچند جذبات محبت سے قطعاً ناآشنا ہے لیکن ایسے جسم کو جو قابل پرستش حد تک نازنین ہے حلقۂ آغوش میں بے تمیزی سے تنگ کھینچتا ہے۔ آئینہ جس میں اتنے دلربا انداز عکس فگن ہوتے ہیں یا پوشش جو کفک نگاریں کو گلے سے لگائے ہے۔ اف کس قدر عیش رائیگاں ہوا!

قلوپطرہ نے اپنی عنابی ایڑی پانی میں ڈبوئی اور دو تین سیڑھیاں نیچے اتری۔ شکن در شکن موج نے اس کے لئے چاندی کی کردھنی اور چوڑیاں طیار کیں اور سینہ و بازو پر موتی نچھاور کئے۔ گویا موتیوں کا مال لوٹ لیا!

خوبصورت لمبے لمبے بال پس پشت سطح آب پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے گویا شاہی لبادہ ہے ...... وہ نہانے میں بھی ملکہ تھی۔

پیرنا اور پانی سے کھیلنا شروع کیا۔ غوطہ لگایا، مٹھی میں سنہری بالو بھر لائی اور ہنس ہنس کر ایک نہ ایک خواص کو نشانہ بنایا۔ حوض کی جگت کے سہارے کھڑی ہوئی اور اپنے حسن کے انمول جواہر کبھی چھپائے کبھی دکھائے۔ کبھی چمکتی ہوئی پیٹھ کبھی پورا جسم پانی سے باہر تھا اور ہر لحظہ رعنائی ایک جلوہ نو دکھاتی تھی۔

یکایک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس سے بھی سخت جو ڈاتنا کے منہ سے ایکٹیئن کو اچانک دیکھنے سے نکلی تھی۔ جھاڑی میں ایک چمکتی اور دمکتی ہوئی آنکھ دکھائی دیتی تھی، زرد اور مشتعل، شیر یا پلنگ کی آنکھ سے ملتی جلتی۔

یہ میامن تھا جو درختوں کے کنج میں دبکا ہوا اس غزال کے مانند کانپ رہا تھا جو گیہوں کے کھیت میں داخل ہو جائے۔ وہ نظارگی کی اس خطرناک شراب سے بدمست تھا جو کسی ملکہ کو حمام میں دیکھنے سے کھنچتی ہے۔

میامن بے پروائی کی حد تک جری تھا لیکن قلوبطرہ کی چیخ اس کے دل سے تلوار کے سرد پھل سے زیادہ ایذا دیتی ہوئی پار ہو گئی۔ موت کا ٹھنڈا پسینا چھوٹنے لگا، کنپٹیوں میں دھمک اور تپک ہونے لگی۔ خطرہ کا فولادی پنجہ گلا گھونٹنے لگا۔

خواجہ سرا نیزوں سے مسلح داخل ہوئے۔ قلوبطرہ نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا، وہاں میامن ہاتھ پاؤں سمیٹے ہوئے لوٹ رہا تھا مقاومت ناممکن تھی اور اس نے کوشش بھی نہیں کی۔ بے تیغ گرفتار ہو جانے دیا۔ خواجہ سراؤں نے اس ظالمانہ طریقے سے جوان کا خاصہ سے قصد کیا کہ وہیں خاتمہ کر دیں لیکن قلوبطرہ نے جو اتنے وقفہ میں اپنا تن ڈھک چکی تھی اشارے سے منع کیا اور قیدی کو سامنے لانے کا حکم دیا۔

میامن سے بجز اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ گھٹنے ٹیک دے اور ہاتھ جوڑے جیسا کہ دیوتاؤں کی قربان گاہ پر دستور ہے۔ قلوبطرہ نے شاہانہ تحکم سے پوچھا "کیا تم کوئی قاتل ہو جسے دشمنوں نے میرے قتل کے واسطے زر دے کر خریدا ہے؟ تم اس مقدس جگہ میں جہاں مرد کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں کس جرم کے ارتکاب کو پوشیدہ رکھے؟"

میامن نے اسی طرح گھٹنے ٹیکے ہوئے جواب دیا۔ "اے ملکہ میری روح میزان آسمانی میں ہلکی ثابت ہو اور میا ئی دختر آفتاب دوستی سزا دے اگر تیری طرف سے کوئی خیال بد میرے دل میں آیا ہو۔"

سچائی اور وفا شعاری کا ایسا غیر مشتبہ طور پر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ قلوبطرہ کو یقین آ گیا اور اس نے نوجوان مصری کو ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں پہلی سی درشتی اور غیظ نہ تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ صورت شکل کا اچھا ہے۔ "پھر ایسی جگہ آنے سے تمہارا کیا مطلب تھا جہاں موت کا سامنا ہو؟" اس نے پوچھا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" اس نے دھیمی مگر صاف آواز میں کہا۔

"اوہو" قلوبطرہ نے یکایک جھک کر کہا اور اس کا بازو پکڑ لیا "تو تمہیں تھے جس نے تیر میں کاغذ باندھ کر پھینکا تھا جہنم کے کتے اوسس کی قسم تم صدی حد تک جری اور بدنصیب ہو۔ اب میں نے تمہیں پہچانا، وہی ہو جو سوگوار سائے کی طرح میرے محلوں کے پاس منڈلاتے ہو۔ آئسس کے جلوس اور ہرمانس کی سوگی میں بھی ساتھ ساتھ تھے۔ شاہی بجرے کا بھی پیچھا کیا! اوہ! بیشک تمہیں ایک ملکہ درکار ہے، تمہارا حوصلہ معمولی نہیں ہے۔ غالباً تمہیں یہ بھی دھن ہو گی کہ محبت کے تبادلہ میں تم سے محبت کی جائے، کیوں نہیں، میں تم سے ضرور محبت کروں گی!"

"ملکہ میری ہنسی نہ اڑاؤ" میامن نے متین اور غمگین لہجے میں کہا "یہ سچ ہے کہ میں دیوانہ ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ میری سزا موت ہے، مجھ پر ترس کھاؤ اور قتل کا حکم دو۔"

"نہیں میں آج رحم پر آمادہ ہوں اور تمہاری جان بخشی کرتی ہوں۔"

"میں زندگی لے کے کیا کروں گا، مجھے تم سے محبت ہے"

"خیر تمہاری یہی خوشی ہے تو قتل ہو گے" قلوبطرہ نے کہا "تم نے ایک عجیب مسرفانہ خواب دیکھا، تمہاری تمنائیں دنیائے تصور پر ایسی چوٹی سے داخل ہوئیں جہاں تمہاری رسائی نہ تھی۔ تم اپنے کو سنبھال نہ سکے، ملکہ سے محبت کی! سرسام کی حالت میں خیال کیا کہ ان اتفاقات کے تابع جو ہزار برس میں ایک دفعہ رونما ہوتے ہیں قلوبطرہ بھی ایک دن تم سے محبت کرے گی۔ جس کو غیر ممکن سمجھتے تھے وہ ہونے کو ہے، میں تمہارے خواب کو حقیقت میں بدلنا چاہتی ہوں۔ اس وقت مجھے یہی دھن ہے کہ تمہاری محبوبانہ آرزو پوری ہو۔ میں تم پر تزک و احتشام کے دروازے اور آفتابی کرنوں اور بجلیوں کے خزانے کھولنے والی ہوں۔ میری مرضی ہے کہ تمہیں اپنی قسمت پر آپ رشک آنے لگے اور چوندھیا جاؤ۔ تم حلقۂ تقدیر کے زیر پا رخ بڑھتے ہیں تمہیں اس کے اوج کمال پر فی الفور اور بغیر درمیانی مدارج طے کئے ہوئے پہنچاؤں گی۔ میں نے تمکو ہیچ و بے حقیقت پایا مگر دیوتاؤں کا ہمسر بنائے دیتی ہوں۔ البتہ اس کے بعد گمنامی کے اسی غار میں گرا دوں گی۔ اس وقت مجھے ظالم نہ کہنا اور رحم کے ملتجی نہ ہونا اور کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا۔ میں مہربان ہوں اور تمہارے خواب میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ مجھے حق تھا کہ فوراً اسی جگہ تمہیں قتل کروا دوں لیکن تم کہتے ہو کہ مجھ سے محبت ہے، لہذا کل مارے جاؤ گے۔ تمہاری جان کی قیمت ایک رات ہے۔ میں سخی ہوں اور مفت لینے کے بجائے خریدتی ہوں۔ قدموں پر سے— قدموں پر کیوں پڑے ہوئے ہو، اٹھو میرے ہاتھ میں ہاتھ دو آؤ محل کا رخ کریں۔"

٭

دعوت کا وسیع کمرہ آراستہ ہے، قلوبطرہ اور میامن داخل ہوتے ہیں۔ میامن ستاروں جڑی خفتان پہنے ہوئے ہے، اور پرشاہی ٹھینی زرعل کہ مشرقی بادشاہوں کی طرح سر کے گرد ایک مرصع حلقہ ہے۔ قلوبطرہ کاہی رنگ کی پوشاک زیب تن کئے ہے جس کے پہلو کھلے ہوئے ہیں اور صرف سنہری مکھیوں سے جیج کر دئے گئے ہیں، برہنہ بازوؤں پر بڑے بڑے موتیوں کی دو لڑیاں ہیں اور سر پر سنہری کنگروں کا تاج ہے۔ ہونٹوں پر ہلکا تبسم مگر پیشانی سے ایک گونہ تفکر کا اظہار ہو رہا ہے اور کبھی کبھی شکن پڑ کر فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ کونسا خیال ہے جو اس عظیم ملکہ کو پریشان کئے ہوئے ہے؟ میامن کے لبوں پر وہ گرم تبسم اور چہرے پر وہ رنگ ہے جو ہنگام وجد بیخودی جلوہ فگن ہوتی ہے۔ پیشانی اور کنپٹیوں سے نورانی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ایک سنہری

رندہ رہی ہیں۔ گہری اور رنگین شادمانی نے چہرے کے نقوش کو ریشن کردیا ہے۔ وہ اپنے پائندار خواب سے ہم بغل تھا اور خواب اتنک مائل پرواز نہ ہوا تھا۔ اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا اب چاہے حیات جاودانی کیوں نہ مل جائے وہ کوئی نیا جذبہ محسوس نہیں کر سکتا نہ کسی وسوسہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی خیالی امید دل کی آخری مرحلے بھی گذر گیا تھا جس کے بعد زندگی کچھ نہیں دے سکتی۔

قلوپطرہ نے اسے اپنے پہلو میں ایک تخت پر بٹھایا جس کے دوررویہ زریں مشتر مرغ تھے۔ تالی بجائی معاً گردشنی کی قطاریں اور ناآتشیں دانہیے دیواروں کے ابھرے ہوئے نقش پر نمودار ہوئے۔ اسفنکس کی آنکھوں سے برق سیاہ تاب چمکی، دوسرے مجسموں کے قوقتن بھی آگ اگلنے لگے۔ ہاتھیوں کے ڈیل سے معطر پانی کی جگہ آگ کے عود نکلے۔ دیواروں سے فولادی ہاتھ شعلیں لئے ہوئے ظاہر ہوئے۔ پتھر میں ترشے ہوئے بلوں کی گود سے جپکیلی کلغیاں پھوٹیں۔ تانبے کے کلسوں سے بحیم شمیم نیلگوں شعلے فروزاں ہوئے۔ عنبریں جھاڑوں کی منتشر روشنیاں مل کر دمکتے ہوئے بخارات بن گئے۔ ہرنے جھل جھل کر رہی تھی۔ قوس قزح کے رنگ کی شعاعیں ہوائیں حلقے اور دائرے بنا رہی تھیں۔ سونے چاندی کے ظروف کی تلکری، سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کے ترشے ہوئے بیل، گلدانوں کے نقش ونگار ہر سے روشنی کی چھوٹ یا شعاع یا چمک پڑتی تھی اور خود بھی ضو دیتی تھی۔ روشنی کی ایک سیل زینے کے نشیب سے درجہ بدرجہ آبشار کی شکل میں بہہ نکلی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہیں آگ لگی ہے اور پانی میں اس کا عکس جھلک رہا ہے۔ ملکہ سبا بھی اس زینے پر چڑھتی تو یہ سمجھ کر پانی بھرا ہے جھجک کر دامن اٹھا لیتی جیسا کہ حضرت سلیمان کے فرش بلوریں پر دھوکا ہوا تھا۔ اس جگمگاتے ہوئے کمرے میں گمان ہوتا تھا کہ عجیب ہیئت کے جانوروں کے مجسمے زندہ ہوگئے۔ سنگ سیاہ کے مینڈھے قہ قہ کرتے اور سینگ مارتے۔ بت اپنے پھولے ہوئے نتھنوں سے خرخر کی آواز نکالتے۔

عیش نقطۂ عروج پر تھا۔ انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، شرابیں لنڈھ رہی تھیں۔ بالائی منزل میں طرح طرح کے ساز بج رہے تھے۔ وہ ہنگامہ تھا کہ شاید بجلی کی کڑک بھی نہ سنائی دیتی۔

میامن کا سر قلوپطرہ کے شانے پر تھا۔ اس کو یقین تھا کہ حواس کھو بیٹھے گا۔ دعوت کا کمرہ ایک عظیم دہیب تعمیری خواب کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اصلی محرابوں اور ہر آمدوں پر نت نئی عمارتوں کا اضافہ ہو رہا تھا اور سب بلند ہو کے ہوتے آسمان میں دفن ہو جاتی تھیں، اگر قلوپطرہ کا نرم اور سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو گمان ہوتا کہ تھلی یا ایران کے کسی جادوگرنے جادو کے زور سے کسی طلسمی محل میں پہنچا دیا ہے۔

کھانا ختم ہونے کے قریب کو زہ پشت بونوں اور نقالوں نے عجیب وغریب مضحک تماشے اور کرتب دکھائے۔ بعد ازاں نوجوان مصری اور یونانی کمسن لڑکیاں آئیں جنہوں نے شادی وغم کے لمحات کو بالمقابلہ تمثیل کی صورت میں پیش کیا اور آئیونیا کے طرز کا مستانہ رقص انتہائے کمال کے ساتھ دکھایا۔

قلوپطرہ خود تخت سے اٹھی، شاہی قبا اتار ڈالی، سر پر منقش تاج کی جگہ پھولوں کا ہار رکھ لیا اور ہاتھوں میں طلائی کرتال لیکر میامن کے سامنے ناچنا شروع کیا۔ وہ انتہائے نشاط سے بے خود ہوگیا۔ قلوپطرہ کے خوبصورت ساعد جو سنگ مرمر کے گلدان کی طرح سڈول تھے سر سے بلند ہوئے اور انہیں اسطرح جنبش ہوئی گویا سیکڑوں قہقہائے نغمہ پاشیدہ ہوگئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرتالوں کے زبان ہے اور باتیں کر رہے ہیں اور گفتگو کی لے لحظہ لحظہ بڑھتی جاتی ہے۔ وہ سرعت سے انگوٹھوں کے بل میامن کی طرف بڑھی اور آہستہ سے اسکی پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر ناچنا شروع کیا اور اسکے گرد رقص کرتی ہوئی گھومی کبھی پشت کی طرف دوہری ہوتی کبھی آگے کیطرف خم ہوتی کبھی گردن کو جنبش دی کبھی آنکھیں نیم وا تھیں اور ساعد مضمحل۔ گویا غش آگیا۔ جوڑا کھل گیا تھا اور بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی چست وچالاک تھی اور برق کی طرح خندہ زن، تتلی کی طرح مرتعش، تھکن سے بیگانہ اور حرکات میں اس زنبور سے مشابہ جسے رس کی تلاش ہو۔.......

شرمیلے ستاروں نے آنکھیں بند کرلیں، یہ منظران کی معصوم نگاہوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جہاں آسمان تھا بجا رات کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ قلوپطرہ ایک مرتبہ پھر میامن کے پہلو میں بیٹھی، رات ختم ہو چلی تھی، آخری ساعت پر داز کو پر تول رہی تھی۔ ایک نیلگوں بجلی بادل ناخواستہ سرخ روشنیوں کے آشوب کی طرف بڑھی گویا چاندی کی کرن دہکتے ہوئے تنور میں گر پڑی، بالائی محرابوں کی تاریکی ہلکے نیلے رنگ میں مبدل ہونے لگی، سپیدۂ سحری نمودار ہونے کو تھا۔

میامن نے سینگ کا وہ ظرف جو ایک کریہہ منظر حبشی غلام نے اس کی طرف بڑھایا لے لیا۔ اس میں وہ سم قاتل تھا کہ کسی دوسرے برتن میں ہوتا تو وہ برتن شق ہو جاتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کو اس آخری نگاہ میں جذب کر دیا جو اپنی محبوبہ پر ڈالی اور موت کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ زہر سنسنا رہا تھا، بلبلے اڑ رہے تھے۔ قلوپطرہ کے منہ پر دھواں اڑنے لگا اور میامن کے بازو پر اسے باز رکھنے کو ہاتھ رکھا، اس کی دلیری سے متاثر ہوئی اور کہنے لگی۔ "مجھ سے محبت کرنے کو زندہ رہو، میری یہی خوشی ہے"......

ناگاہ بگل کی آواز سنائی دی اور چار سوار کمرۂ ضیافت میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے آقا انٹنی سے چند قدم آگے آگے تھے۔ قلوپطرہ نے خاموشی سے میامن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سورج کی ایک کرن قلوپطرہ کی پیشانی سے کھیلنے لگی گویا تاج کا بدل ہے۔

میامن نے کہا "وقت مقررہ آگیا، صبح ہوگئی، یہی وقت ہے جب ایسے حسین خوابوں کے پر لگ جاتے ہیں"

یہ کہکر زہر کا پیالہ ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا اور اس طرح گرا گویا

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

پیچیدہ فطرت

روسی افسانہ

بشیرالدین

فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے مخملی گدے دار صوفہ پر ایک نازک اندام حسینہ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے تھرائے ہوئے ہاتھ میں ایک قیمتی جھالر دار پنکھا ہے۔ اسکی سڈول ناک پر ایک کیل (PINGNEZ) لگی ہوئی ہے جو تھوڑی تھوڑی دیر میں کھسکی پڑتی ہے۔ اس کے سینہ پر چڑھاؤ پن چھپاں ہے جس کا اتار چڑھاؤ موجوں کے تھپیڑوں میں ناؤ کے اتار چڑھاؤ کا کمال کھینچ رہا ہے۔

اس کے بالمقابل صوفہ پر گورنر کا معتمد خاص بیٹھا ہوا ہے۔ معتمد جوان ہے اور ہونہار مصنف ہے۔ اس کے اختیارات میں یہ فرض بھی شامل ہے کہ وہ گورنر کے روزنامچہ میں علمی سوسائٹی کا رنگ و بو پیدا کرے اور من گھڑت قصے بھی بڑھا دے۔

نوجوان حسینہ کے چہرہ کو ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے نظر جمائے تک رہا ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ اس نرالے چہرہ کی ماہیت کو دریافت کرے اور اسے سمجھے۔

"اہا۔ میں نے آپ کو پہچان لیا" افسر نے حسینہ کے ہاتھ کا چوڑیوں تک بوسہ لیتے ہوئے کہا "آپ وجدانی کیفیت اور روحانی الجھنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ایک پرانا تنفر اور غیر طبعی کشمکش ہے۔ پر آپ ہراساں نہ ہوں۔ آپ میں ایک ہیروئن بننے کی صلاحیت موجود ہے" اب افسر نے حسینہ کی نفسیات کو دریافت کر لیا تھا۔

"میرا تجزیہ فرمایئے والڈیمار" حسینہ نے ایک رنج آلود ہنسی ہنسکر کہا "میری زندگی بھرپور ہے۔ درحقیقت میں ایک بدنصیب ہوں۔ میرا شمار دوستیوسکی کی مصیبت زدہ عورتوں میں ہو سکتا ہے۔ آپ کا فرض ہے والڈیمار میرے باطن کو دنیا پر افشا کیجئے۔ میرے بے بس اور بے بس باطن کو۔ آپ علم النفس کے ماہر ہیں درجہ میں بیٹھے ذرا سی دیر بھی نہیں ہوئی کہ آپ نے میری تہ کو پا لیا"

فرمایئے۔ میں ادب کے ساتھ آپ سے التجا کرتا ہوں۔ فرمایئے"

"میری پیدائش ایک ادنیٰ افسر کے گھر ہوئی۔ میرے والد ایک بھلے مانس تھے۔ پر ۔ ۔ ۔ ۔ زمانہ کا اثر، ماحول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ آپ تو خود ہی دانا ہیں۔ مرحوم باپ کی برائی میں نہیں کرنا چاہتی۔ وہ مے نوش تھے جوا کھیلتے تھے، راشی تھے... والدہ بیچاری کیا عرض کروں، وہ غریب ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج۔ اف یہ صدمہ کرنے پر مجبور نہ کیجئے۔ مختصر یہ کہ مجھے دنیا رستہ آپ نکالنا پڑا۔ ناقص تعلیم، بے ہودہ افسانہ بینی، جوانی کی لغزشیں، ابتدائی اور عشق بلی، ماحول کی کشمکش۔ خدا کی پناہ۔ صاحب! ان شبہات نے رنگ بہت اچھا دیا۔ میں اپنے آپ کو بھی نہیں۔ آپ مصنف ہیں۔ ہم عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے میں ایک پیچیدہ فطرت کی حامل ہوں۔ میں خوشی چاہتی تھی۔ میں انسان بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں اپنی شخصیت کی تلاش میں تھی۔ اسی میں مجھے اپنی نجات نظر آتی"

"اف کس قدر حیرت انگیز حقیقت ہے" مصنف نے دبی زبان سے کہا اور پھر چوڑیوں تک حسینہ کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔ "میں آپ کے ہاتھ کا بوسہ نہیں لے رہا۔ میں ایک مصیبت زدہ شخصیت کے ہاتھ کا بوسہ لے رہا ہوں۔ راسکولنیکوف (RASKO_ IKOV) کو یاد کیجئے۔ اس نے بھی اسی طرح بوسہ لیا تھا"

"والڈیمار میں شان و شوکت، شور و شغب اور آب و تاب کی پیاسی تھی۔ کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے۔ میری آرزوئیں غیر معمولی تھیں۔ میں ایک مرد کی متلاشی تھی۔ مجھے مرد ملا پر ایک معمر جرنل۔ ظاہر ہے میرے لئے یہ ایک قربانی تھی، اپنی ہستی کو مٹانا تھا، لیکن میں مجبور تھی۔ میں نے اپنے خاندان کی مدد کی، سیر و سیاحت کی، تجارت میں حصہ لیا، پر کیا بتاؤں مجھ پر کیا گذری۔ کس قدر روح فرسا تھی وہ گھڑی جبکہ میں نے اپنے آپ کو اس معمر جرنل کی آغوش میں پایا۔ یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا لیکن میں نے برداشت کیا۔ مجھے اس خیال سے تقویت ہوا کرتی کہ بڈھا آج نہیں کل ضرور مر جائے گا اور میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گی اور کسی اچھے مرد سے محبت کر کے خوشی حاصل کر لوں گی"

حسینہ اپنے آپ کو زور سے پنکھا جھلنے لگی۔ اس کے چہرہ پر افسردگی کے آثار نمایاں تھے۔

"بزرگ کا انتقال ہو گیا ۔ ۔ ۔ انہوں نے میرے لئے کچھ روپیہ چھوڑا۔ میں اب آزاد تھی۔ ایک چڑیا کی طرح آزاد۔ اب میرے دن رنگ چمکے تھے۔ خوشی گویا جھروکے میں سے جھانک رہی تھی اور اجازت کی منتظر تھی۔ مگر نہیں۔ تم کو خدا کا واسطہ والڈیمار ذرا غور سے سنو۔ اب میں محبت کی پیاسی تھی کسی مرد کی عزیز جان بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ کسی مرد کی مددگار و غمخوار بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں عیش و آرام ڈھونڈ رہی تھی۔ پر کس قدر ذلیل و حقیر ہے دنیا اور

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

نوٹ: چیخوف کا یہ افسانہ براہ راست روسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

گوندہ رہی ہیں۔ گہری اور تسکین شادمانی نے چہرے کے نقوش کو روشن کر دیا ہے۔ وہ اپنے پائدار خواب سے ہم بغل تھا؛ ور خواب انبک مائل بہ زوال نہ ہوا تھا۔ اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا، اب چاہے حیات جاویدی کیوں نہ مل جائے وہ کوئی نیا جذبہ محسوس نہیں کر سکتا نہ کسی وسوسہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی خیالی امیدوں کی آخری سرحد سے بھی گذر گیا تھا جس کے بعد زندگی کچھ نہیں دے سکتی۔

قلوبطرہ نے اسے اپنے پہلو میں ایک تخت پر بٹھایا جیکے دو رویہ زریں شتر مرغ تھے۔ تالی بجائی معاً روشنی کی قطاریں اور آتشیں دائرے درو دیوار کے ابھرے ہوئے نقش پر نمودار ہوئے۔ اسفنکس کی آنکھوں سے برق سیاہ تاب چمکی، دوسرے مجسموں کے تھوتھن بھی آگ اگلنے لگے۔ ہاتھیوں کے ڈبوں سے معطر پانی کی جگہ آگ کے عود نکلے۔ دیواروں سے فولادی ہاتھ مشعلیں لئے ہوئے ظاہر ہوئے۔ پتھر میں ترشے ہوئے پھولوں کی گود سے چمکیلی کلیاں پھوٹیں۔ تانبے کے کلسوں سے بحیم شمیم نیلگوں شعلے فروزاں ہوئے۔ عفریتی جھاڑوں کی منتشر دستیاں مل کر دہکتے ہوئے بخارات بن گئے۔ ہر شئے جھل جھل کر رہی تھی۔ قوس قزح کے رنگ کی شعاعیں ہوا میں حلقے اور محرابیں بنا رہی تھیں۔ سونے چاندی کے ظروف کی تلکردی، سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کے ترشے ہوئے نیل، گلدانوں کے نقش و نگار ہر جگہ روشنی کی چھوٹ یا شعاع یا چمک پڑتی تھی اور خود بھی ضو دیتی تھی۔ روشنی کی ایک سبیل زینے کے نشیب سے درجہ بدرجہ آبشار کی شکل میں بہہ نکلی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہیں آگ لگی ہے اور پانی میں اس کا عکس جھلک رہا ہے۔ ملکۂ سبا بھی اس زینے پر چڑھتی تو یہ سمجھکر کہ پانی بھرا ہے جھجک کر دامن اٹھا لیتی جیسا کہ حضرت سلیمان کے فرش بلوریں پر دھوکا ہوا تھا۔ اس جگمگاتے ہوئے کمرے میں ایسا ہوتا تھا کہ عجیب ہیبت کے جانوروں کے مجسمے زندہ ہو گئے۔ سنگ سیاہ کے مینڈھے قد قد کرتے اور سینگ مارتے۔ بت اپنے پھولے ہوئے نتھنوں سے خرخر کی آواز نکالتے۔

جشن نقطۂ عروج پر تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، شرابیں لنڈھ رہی تھیں۔ بالائی منزل میں طرح طرح کے ساز بج رہے تھے۔ وہ ہنگامہ تھا کہ شاید بجلی کی کڑک بھی نہ سنائی دیتی۔

میامن کا سر قلوبطرہ کے شانے پر تھا۔ اس کو یقین تھا کہ حواس کھو بیٹھے گا۔ دعوت کا کمرہ ایک عظیم و مہیب تعبیری خواب کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اصلی محرابوں اور مینا دوں پر نت نئی عمارتوں کا اضافہ ہو رہا تھا اور سب بلند ہو کر ہوتے آسمان میں دفن ہو جاتی تھیں، اگر قلوبطرہ کا نرم اور سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو گمان ہوتا کہ تھسلی یا ایران کے کسی جادوگر نے جادو کے زور سے کسی طلسمی محل میں پہنچا دیا ہے۔

کھانا ختم ہونے کے قریب کوزہ پشت بونوں اور نقالوں نے عجیب و غریب مضحک تماشے اور کرتب دکھائے، بعد ازاں نوجوان مصری اور یونانی کمسن لڑکیاں آئیں جنہوں نے شادی و غم کے لمحات کو بالمقابلہ تمثیل کی صورت میں پیش کیا اور آئیونیا کے طرز کا مستانہ رقص انتہائے کمال کے ساتھ دکھایا۔

قلوبطرہ خود تخت سے اٹھی، شاہی قبا اتار ڈالی، سر پر منقش تاج کی جگہ پھولوں کا ہار لپیٹا اور ہاتھوں میں طلائی کرتال لیکر میامن کے سامنے ناچنا شروع کیا۔ وہ انتہائے نشاط سے بیخود ہو گیا۔ قلوبطرہ کے خوبصورت ساعد جو سنگ مرمر کے گلدان کی طرح سڈول تھے سر سے بلند ہوئے اور انہیں اس طرح جنبش ہوئی گویا سیکڑوں گم شدہ نغمے پاشیدہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرتالوں کی زبان ہے اور باتیں کر رہے ہیں اور گفتگو کی لے لحظہ بلحظہ بڑھتی جاتی ہے۔ وہ سرعت سے انگوٹھوں کے بل میامن کی طرف بڑھی اور آہستہ سے اسکی پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر ناچنا شروع کیا اور اسکے گرد رقص کرتی ہوئی گھومی کبھی پشت کی طرف دوہری ہوتی کبھی آگے کیطرف خم ہوتی کبھی گردن کو جنبش دی کبھی آنکھیں نیم وا تھیں اور ساعد مضمحل گویا غش آگیا۔ جوڑا کھل گیا تھا اور بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی چست و چالاک تھی اور برق کی طرح خندہ زن، تتلی کی طرح مرتعش، تھکن سے بیگانہ اور حرکات میں اس زنبور سے مشابہ جیسے رس کی تلاش ہو۔ . . . .

شرمیلے ستاروں نے آنکھیں بند کر لیں، یہ منظر ان کی معصوم نگاہوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جہاں آسمان تھا عنا رات کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ قلوبطرہ مرتبہ پھر میامن کے پہلو میں بیٹھی، رات ختم ہو چلی تھی، آخری ساعت پرواز کو پر تول رہی [illegible] ایک نیلگوں تجلی بادل ناخواستہ مرج روشنیوں کے آشوب کی طرف [illegible] کرن دیکھتے ہوئے تنور میں گر پڑی، بالائی محرابوں کی آ[illegible] نکلی ملکے [illegible] لگی، سپیدۂ سحری نمودار ہونے کو تھا۔

میامن نے سینگ کا وہ ظرف جو ایک [illegible] بڑھا یا لے لیا۔ اس میں وہ سم قاتل تھا کہ [illegible] . . . . شق ہو جاتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی [illegible] اپنی محبوبہ پر ڈالی اور موت کا پیالہ ہونٹوں سے [illegible] اٹھا رہے تھے۔ قلوبطرہ کے منہ پر دھواں اڑنے لگا [illegible] باز رکھنے کو ہاتھ رکھا، اس کی دلیری سے متاثر ہوئی [illegible] محبت کرنے کو زندہ رہو، میری یہی خوشی ہے!" . . . .

ناگاہ بگل کی آواز سنائی دی اور چار سوار کمرۂ ضیافت [illegible] وہ اپنے آقا نیں سے چند قدم آگے آگے تھے۔ قلوبطرہ نے خاموشی سے میامن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سورج کی ایک کرن قلوبطرہ کی پیشانی سے کھیلنے لگی گویا تاج کا بدل ہے۔

میامن نے کہا "وقت مقررہ آگیا، صبح ہو گئی، یہی وقت ہے جب حسین خوابوں کے پر ٹک جاتے ہیں!"

یہ کہکر زہر کا پیالہ ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا اور اس طرح گرا گو

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

رہی ہیں۔ گہری اور متین شادمانی نے چہرے کے نقوش کو روشن کر دیا۔ وہ اپنے پائندہ خواب سے ہم بغل تھا اور خواب اب تک مائل پرواز نہ تھا۔ اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا، اب چاہے حیات جاوید ہی مل جائے وہ کوئی نیا جذبہ محسوس نہیں کر سکتا نہ کسی وسوسے سے دوچار ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی خیالی امیدوں کی آخری سرحد سے بھی گذر گیا تھا اس کے بعد زندگی کچھ نہیں دے سکتی۔

قلوبطرہ نے اسے اپنے پہلو میں ایک تخت پر بٹھایا جیسے دو زرّیں مرغ تھے۔ تالی بجائی مشعل روشنی کی قطاریں اور آتشیں دانے دیواروں کے ابھرے ہوئے نقش پر نمودار ہوئے۔ اسفنکس کی آنکھوں میں برق سیاہ تاب چمکی، دوسرے مجسموں کے نقوش میں بھی آگ اگلنے لگے۔ ستونوں کے ڈیں سے معطر پانی کی جگہ آگ کے عود نکلے۔ دیواروں سے فولادی مشعلیں لئے ہوئے ظاہر ہوئے۔ پتھروں میں ترشے ہوئے پھولوں کی گود سے بجلی کلغیاں پھوٹیں۔ تانبے کے کلسوں سے مجسم نیلگوں شعلے فروزاں ہوئے۔ عنبری جھاڑوں کی منتشر روشنیاں مل کر دہکتے ہوئے بخارات بن گئے۔ رنگینی جھل جھل کر رہی تھی۔ قوس قزح کے رنگ کی شعاعیں ہوا میں حلقے اور راہیں بنا رہی تھیں۔ سونے چاندی کے ظروف کی تلکری، سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کے ترشے ہوئے نہل، گلدانوں کے نقش و نگار ہر سے روشنی کی چوٹ یا شعاع یا چمک پڑتی تھی اور خود بھی ضو دیتی تھی۔ روشنی کی ایک بیل زینے کے نشیب سے درجہ بدرجہ آبشار کی شکل میں بہہ نکلی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں آگ لگی ہے اور پانی میں اس کا عکس جھلک رہا ہے۔ ملکۂ سبا بھی اس زینے پر چڑھتی تو یہ سمجھ کر پانی بھرا ہے جھجک کر دامن اٹھا لیتی جیسا کہ حضرت سلیمان کے فرش بلوریں پر دھوکا ہوا تھا۔ اس جگمگاتے ہوئے کمرے میں گمان ہوتا تھا کہ عجیب ہیبت کے جانوروں کے مجسمے زندہ ہو گئے۔ سنگ سیاہ کے مینڈھے قدقد کرتے اور سینگ مارتے۔ بت اپنے پھولے ہوئے نتھنوں سے خرخر کی آواز نکالتے۔

عیش نقطۂ عروج پر تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، شرابیں لنڈھ رہی تھیں۔ بالائی منزل میں طرح طرح کے ساز بج رہے تھے۔ وہ ہنگامہ تھا کہ شاید بجلی کی کڑک بھی نہ سنائی دیتی۔

میامن کا سر قلوبطرہ کے شانے پر تھا۔ اس کو یقین تھا کہ حواس کھو بیٹھے گا۔ دعوت کا کمرہ ایک عظیم و مہیب تعبیری خواب کی طرح گردش کر رہا تھا۔ محلی محرابوں اور معبدوں پر نت نئی عمارتوں کا اضافہ ہو رہا تھا اور سب بلند ہوتے ہوتے آسمان میں دفن ہو جاتی تھیں۔ اگر قلوبطرہ کا نرم اور سرد ہاتھ اس کے ماتھے پر نہ ہوتا تو گمان ہوتا کہ کسی یا ایران کے کسی جادوگر نے جادو کے زور سے کسی طلسمی محل میں پہنچا دیا ہے۔

کھانا ختم ہونے کے قریب کوتہ قامت بونوں اور رقاصوں نے عجیب غریب مضحک تماشے اور کرتب دکھائے۔ بعد ازاں نوجوان مصری اور یونانی کمسن لڑکیاں آئیں جنہوں نے شادی و غم کے لمحات کو بالمقابل تمثیل کی صورت میں پیش کیا اور آئیونیا کے طرز کا متاثر رقص انتہائے کمال کے ساتھ دکھایا۔

قلوبطرہ خود تخت سے اٹھی، شاہی قبا اتار ڈالی، سر پر منقش تاج کی جگہ پھولوں کا ہار رکھ لیا اور ہاتھوں میں طلائی کرتال لیکر میامن کے سامنے ناچنا شروع کیا۔ وہ انتہائے نشاط سے بیخود ہو گیا۔ قلوبطرہ کے خوبصورت ساعد جو سنگ مرمر کے گلدان کی طرح سڈول تھے سر سے بلند ہوئے اور ان میں اسطرح جنبش ہوئی گویا سیکڑوں کھائے نغمے پاشیدہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرتالوں کے زبان ہے اور وہ باتیں کر رہے ہیں اور گفتگو کی لے لحظہ لحظہ بڑھتی جاتی ہے۔ وہ سرعت سے انگوٹھوں کے بل میامن کی طرف بڑھی اور آہستہ سے اسکی پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر ناچنا شروع کیا اور اسکے گرد رقص کرتی ہوئی گھومی۔ کبھی پشت کی طرف دوہری ہوتی کبھی آگے کیطرف خم ہوتی، کبھی گردن کو جنبش دی۔ کبھی آنکھیں نیم وا تھیں اور ساعد مضمحل۔ گویا غش آگیا۔ جوڑا کھل گیا تھا اور بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی چست و چالاک تھی اور برق کی طرح خندہ زن، تتلی کی طرح مرتعش، تھکن سے بیگانہ اور حرکات میں اس زنبور سے مشابہ جسے رس کی تلاش ہو۔......

شرمیلے ستاروں نے آنکھیں بند کر لیں، یہ منظر ان کی معصوم نگاہوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جہاں آسمان تھا بخارات کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ قلوبطرہ ایک مرتبہ پھر میامن کے پہلو میں بیٹھی، رات ختم ہو چلی تھی، آخری ساعت پر واز کو پر تول رہی تھی۔ ایک نیلگوں تجلی بادل ناخواستہ سرخ روشنیوں کے آشوب کی طرف بڑھی۔ گویا چاند کی کرن دہکتے ہوئے تنور میں گر پڑی، بالائی محرابوں کی تاریکی ہلکے نیلے رنگ میں مبدل ہونے لگی، سپیدۂ سحری نمودار ہونے کو تھا۔

میامن نے سینگ کا وہ ظرف جو ایک کریہہ منظر حبشی غلام نے اس کی طرف بڑھایا لے لیا۔ اس میں وہ سم قاتل تھا کہ کسی دوسرے برتن میں ہوتا تو وہ برتن شق ہو جاتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کو اس آخری نگاہ میں جذب کر دیا جو اپنی محبوبہ پر ڈالی اور موت کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔ زہر سنسنا رہا تھا بلبلے اٹھ رہے تھے۔ قلوبطرہ کے منہ پر دھواں اڑنے لگا اور میامن کے بازو پہلے باز رکھنے کو ہاتھ رکھا، اس کی دلیری سے متاثر ہوئی اور کہنے لگی۔ "مجھ سے محبت کرنے کو زندہ رہو، میری یہی خوشی ہے"......

ناگاہ بگل کی آواز سنائی دی اور چار سوار کمرۂ ضیافت میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے آقا یعنی سے چند قدم آگے آگئے تھے۔ قلوبطرہ نے خاموشی سے میامن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سورج کی ایک کرن قلوبطرہ کی پیشانی سے کھیلنے لگی گویا تاج کا بدل ہے۔

میامن نے کہا وقت مقررہ آگیا، صبح ہو گئی، یہی وقت ہے جب ایسے حسین خوابوں کے پر لگ جاتے ہیں"

یہ کہکر زہر کا پیالہ ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا اور اس طرح گر گر گیا

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

پیچیدہ فطرت

روسی افسانہ

فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے مخملی گدے دار صوفہ پر ایک نازک اندام حسینہ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے تھرائے ہوئے ہاتھ میں ایک قیمتی جھالر دار پنکھا ہے۔ اسکی سڈول ناک پر پنگ نیل (PINCNEZ) لگی ہوئی ہے جو تھوڑی تھوڑی دیر میں کھسکی پڑتی ہے۔ اس کے سینہ پر چڑھاؤ ین چپاں ہے جن کا اتار چڑھاؤ موجوں کے تھپیڑوں میں ناؤ کے اتار چڑھاؤ کا کال کھینچ رہا ہے۔

اس کے بالمقابل صوفہ پر گورنر کا معتمد خاص بیٹھا ہوا ہے، معتمد جوان ہے اور ہونہار مصنف ہے۔ اس کے اختیارات میں یہ فرض بھی شامل ہے کہ وہ گورنر کے روزنامچہ میں اعلیٰ سوسائٹی کا رنگ و بو پیدا کرے اور من گھڑت قصے بھی بڑھا دے۔

نوجوان حسینہ کے چہرہ کو ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے نظر جمائے تک رہا ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ اس نرالے چہرہ کی ماہیت کو دریافت کرے اور اسے سمجھے۔

"آہ۔ میں نے آپ کو پہچان لیا" افسر نے حسینہ کے ہاتھ کا چوڑیوں تک بوسہ لیتے ہوئے کہا "آپ وجدانی کیفیت اور روحانی الجھنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ایک پر از خطر اور غیر طبعی کشمکش ہے۔ پر آپ ہراساں نہ ہوں۔ آپ میں ایک ہیروئن بننے کی صلاحیت موجود ہے" اب افسر نے حسینہ کی نفسیات کو دریافت کر لیا تھا۔

"میرا تجزیہ فرمائیے والڈیمار" حسینہ نے ایک رنج آلود ہنسی ہنسکر کہا "میری زندگی بھرپور ہے۔ درحقیقت میں ایک بدنصیب ہوں۔ میرا شمار دوستیوسکی کی مصیبت زدہ عورتوں میں ہو سکتا ہے۔ آپ کا فرض ہے والڈیمار میرے باطن کو دنیا پر افشا کیجئے۔ میرے بے بس اور بے بس باطن کو۔ آپ علم النفس کے ماہر ہیں درجہ میں بیٹھے ذرا سی دیر بھی نہیں ہوئی کہ آپ نے میری شہ کو پا لیا"

فرمائیے۔ میں ادب کے ساتھ آپ سے التجا کرتا ہوں۔ فرمائیے"

"میری پیدائش ایک ادنیٰ افسر کے گھر ہوئی۔ میرے والد ایک بھلے مانس تھے۔ پر ...... زمانہ کا اثر، ماحول ...... وغیرہ وغیرہ آپ تو خود ہی دانا ہیں، مرحوم باپ کی برائی میں نہیں کرنا چاہتی۔ وہ سے نوش تھے جوا کھیلتے تھے، راشی تھے...

والدیمار کیا عرض کروں، روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج۔ اف! اعادہ کرنے پر مجبور نہ کیجئے۔ بہر حال مجھے راستہ آپ نکالنا پڑا۔ ناقص تعلیم، بے ہودہ افسانہ بینی، جوانی کی لغزشیں، ابتدائی اور خام محبت، ماحول کی کشمکش۔ خدا کی پناہ مصائب اور شبہات نے زندگی بہت اجیرن بنا دیا۔ میں اسے آپ کی بھی قائل نہیں ہوں۔ آپ مصنف ہیں۔ ہم عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے میں ایک پیچیدہ فطرت کی مالک ہوں۔ میں خوشی چاہتی تھی۔ میں انسان بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں اپنی شخصیت کی متلاشی تھی۔ اسی میں مجھے اپنی نجات نظر آئی"

"اف کس قدر حیرت انگیز حقیقت ہے" مصنف نے دبی زبان سے کہا اور پھر چوڑیوں تک حسینہ کے ہاتھ کا بوسہ لیا "میں آپ کے ہاتھ کا بوسہ نہیں لے رہا۔ میں ایک مصیبت زدہ شخصیت کے ہاتھ کا بوسہ لے رہا ہوں۔ راسکولنیکوف (RASKOL IKOV) کو یاد کیجئے۔ اس نے بھی اسی طرح بوسہ لیا تھا"

"والڈیمار میں شان و شوکت، شور و شغب اور آب و تاب کی پیاسی تھی۔ کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے۔ میری آرزوئیں غیر معمولی تھیں۔ میں ایک مرد کی متلاشی تھی۔ مجھے مرد ملا پر ایک معمر جرنل۔ ظاہر ہے میرے لئے یہ ایک قربانی تھی، اپنی ہستی کو مٹانا تھا۔ لیکن میں مجبور تھی۔ میں نے اپنے خاندان کی مدد کی، سیر و سیاحت کی، خیرات میں حصہ لیا۔ پر کیا بتاؤں مجھ پر کیا گذری۔ کس قدر روح فرسا تھی وہ گھڑی جبکہ میں نے اپنے آپ کو اس معمر جرنل کی آغوش میں پایا۔ یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا لیکن میں نے برداشت کیا۔ مجھے اس خیال سے تقویت ہوا کرتی کہ بڈھا آج نہیں کل ضرور مر جائے گا اور میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گی اور کسی اور مرد سے محبت کر کے خوشی حاصل کروں گی"

حسینہ اپنے آپ کو زور سے پنکھا جھلنے لگی۔ اس کے چہرہ پر افسردگی کے آثار نمایاں تھے۔

"بزرگ کا انتقال ہو گیا..... انہوں نے میرے لئے کچھ روپیہ چھوڑا۔ میں اب آزاد تھی۔ ایک چڑیا کی طرح آزاد۔ اب میرے بھاگ جاگے تھے، خوشی گویا جھروکے میں سے جھانک رہی تھی اور اجازت کی منتظر تھی۔ مگر نہیں۔ تم کو خدا کا واسطہ والڈیمار ذرا غور سے سنو۔ اب میں محبت کی پیاسی تھی۔ کسی مرد کی عزیز جان بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ کسی مرد کی مددگار و غمخوار بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میں عیش و آرام ڈھونڈ رہی تھی۔ پر کس قدر ذلیل و حقیر ہے دنیا اور

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

بشیر الدین

نوٹ: چیخوف کا یہ افسانہ براہ راست روسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

آٹا

افسانہ

جیران پور کا قصبہ نہ زیادہ چھوٹا تھا نہ بہت بڑا تقریباً پانچ ہزار کی آبادی تھی۔ زمیندار مسلمان شیوخ تھے، رعایا میں ہر قوم اور ہر پیشے کے لوگ تھے، اور ان میں سے اکثر کے الگ الگ محلے تھے۔ ٹھکرانا، گھوسیانا، کوری ٹولہ، حلوائی بازار، کنجڑا محال اور چار ٹولی محلوں کے نام سے پتہ چلتا تھا کہ جیران پور کے بسانے والے کے دماغ میں کسی بڑے شہر کا خاکہ تھا۔ اور یہ قصبہ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں وجود میں آیا، جب جاگیرداری نظام رعایا اور راعی، حاکم و محکوم کے مکانات ایک دوسرے کی بغل میں بننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ خود زمینداروں کا محلہ شیخ پورہ، شیخانا یا شیخ باڑا نہ کہلاتا تھا بلکہ قلعہ معلی کے ڈھنگ پر گڑھی کے نام سے موسوم تھا اور اس کے ہر مکان میں دربار کے لئے کوئی کمرا یا دالان مخصوص تھا۔ اس میں زمیندار کے لئے ایک کرسی رہتی تھی، راجپوتوں برہمنوں کے لئے ایک بنچ، کارندوں اور مسلمان رعایا کے لئے چٹائیاں اور بقیہ رعایا پرجا کے لئے دھرتی ماتا کا مسطح سینہ!

مکانوں کی ساخت میں بھی فرق تھا۔ زمینداروں کے مکانات پختہ کھوری اینٹوں کے تھے۔ بڑے پھاٹک، محرابی دروازے، بلند شہ نشین، کشادہ صحن، دو منزلے، سہ منزلے۔ برجیاں بھی، تہ خانے بھی اور چور دروازے بھی! ٹھاکروں اور مہاجنوں کے مکان کچے، کھپریل سے چھائے ہوئے، بقیہ رعایا کے لئے جھونپڑے تھے، تاریک تنگ، پھوس سے ڈھکے ہوئے۔ قصبہ میں کوئی ٹاؤن ایریا نہ تھا اسلئے نہ تو صفائی کا انتظام تھا، نہ گلیاں ہموار تھیں۔ اکثر مقامات پر گھروں کا بدبودار سڑا ہوا پانی راستے کی خاک کو کیچڑ میں تبدیل کر دیتا تھا اور آتی جاتی بیل گاڑیاں موٹر اور لاری اس کی مدد سے راہ چلتوں کے کپڑوں پر گلکاریاں کرتے رہتے تھے۔ مغربی تعلیم یافتہ حضرات ایسے مقامات سے ناک پر رومال رکھے لپ جھپ گزر جاتے، لیکن پھوس کی جھونپڑیوں میں زائیدہ بچے اسی فضا میں کھیلتے، قلقاریاں مارتے اور وباؤں سے جو بچ جاتے وہ جوان ہو کر ان گندگیوں میں رینگنے والے دوسرے کیڑے پیدا کرتے رہتے تھے۔

جیران پور دو چیزوں کے لئے مشہور تھا، ایک تو "پیڑے" کے لئے دوسرے شیرمال کے لئے۔ پیڑوں کی شہرت کا سبب تو گھوسیانا تھا۔ جہاں گھوسیوں کا پورا محلہ آباد ہوگا وہاں کھوئے کی کیا کمی، اور جہاں کھویا افراط سے ملیگا وہاں کے پیڑے یقینی اچھے ہوں گے۔ مگر شیرمال کی شہرت کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے ایک دن ناصر سے اس کا راز دریافت کیا۔

وہ بولے "شیرمال کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، عمدہ دودھ، عمدہ گھی اور عمدہ آٹا۔ دودھ یہاں اچھے سے اچھا ملتا ہے، گھی کی بھی وہی حالت ہے، رہا آٹا، تو یہاں مشین نہیں چلتی بلکہ چکی میں گھروں پر پیسا جاتا ہے....."

میں نے شہری ہونے کی حیثیت سے زرا منہ بنا کر پوچھا" تو موٹا ہوتا ہوگا ؟"

وہ بولے "جی ہاں، موٹا تو یقینی ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ آپ کے حلق میں خراش پڑ جائے۔ انسانی ہاتھوں میں مشین کی طرح باریک پیسنے کی طاقت کہاں۔ لیکن اسی کی وجہ سے گیہوں کی اصلی طاقت بھی قائم رہتی ہے اور اس آٹے کی روٹیاں نرم بھی ہوتی ہیں اور زود ہضم بھی۔ ان میں مشین کے مائدے کا چیڑا پن نہیں ہوتا۔"

میں نے اپنی جگہ غور کیا تو واقعی میں ناصر کے ہاں جب بھی آتا تو ایسی تمام چیزیں خوش ذائقہ معلوم ہوتیں جن میں آٹا ملا ہوتا تھا۔ پھر میری خوراک بھی شہر سے دگنی ہو جاتی تھی۔ پھر بھی میں نے شرارت سے کہا "یہ محض آپ کا حسن ظن ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اپنا قیمتی وقت ہاتھ سے آٹا پیسنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک آٹا مل کھول دی جائے تو کتنا فائدہ ہو۔"

معلوم ہوا جیسے ناصر کے تن بدن میں کسی نے مرچیں لگا دیں۔ وہ تلملا کے بولے "جی ہاں بڑا فائدہ ہو۔ جو عورتیں اپنے ہاتھ سے آٹا پیس لیتی ہیں ان کی ورزش جاتی رہے، صحت خراب ہو، یا بیمار پڑیں۔ جو پیسنے والیاں اسی ذریعہ اپنا پیٹ پالتی ہیں وہ بھوکوں مریں یا شہروں میں جا کر عصمت فروشی کریں!"

میں نے مسکرا کر کہا "کیوں شہر جائیں، آپ کے دیہات ہی میں رہیں لیکن میاں کی کمائی کھائیں۔"

انہوں نے کہا "جی ان کے شوہر زندہ ہوتے تو وہ اس کام کو کرتیں ہی کیوں۔ وہ چاروں عورتیں جن کا آٹا پیسنا اور دال دلنا پیشہ ہے بیوائیں ہیں۔ تلسیا چمارن، رام بیتیا کہارن، رام دسیا اہیرن اور مجیدن جولاہن۔"

نہ جانے کیوں میری تخیل نے میرے سامنے ایک تصویر پیش کر دی چکی چل رہی ہے، اس کے گرد پسینے میں بھیگی ہوئی دو گداز ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ساڑی ران تک سمٹی ہوئی ہے اور پیسنے والی چکی کی موٹھ (جوا) ہاتھ میں لے کر آگے جھکتی ہے، پیچھے جھکتی ہے، داہنی طرف جھکتی ہے، بائیں طرف جھکتی ہے اور لہک لہک کے گا رہی ہے۔

چکیا نہ ڈولے موا کلیا نہ ڈولے

جوا پکڑ کے روئیں رم بیتیا رم دسیا!

میں اپنی تخیل کی بے لگامی پر مسکرا دیا۔ میں نے کہا "اس محنت سے بیواؤں کو جنسی تسکین تو ضرور ہوتی ہوگی لیکن ان کا پیٹ ہرگز نہ بھرتا ہوگا۔"

ناصر جاگیردارانہ انداز سے گرج کر بولے "پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔ دن میں ڈھائی تین سیر آٹا اور تین چار سیر دال دل لیتی ہیں، ان کے کھانے بھر کو آٹا تو گراپڑا ال جاتا ہے، پھر ایک آنہ سیر پیسنے دلنے کا

علی عباس حسینی

ملتا ہے۔ سات آٹھ آنے روزانہ مفت ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ اب کیا چاہیئے قارون کا خزانہ؟"

میں نے ان کا غصہ آخری ڈگری تک پہنچا دیا۔ "بیگم جی جن کر عرض کیا "اگر ان میں سے کوئی جوان ہے تو اس سے کہیں....." وہ بھوے ہوئے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں نکال کر بولے "جناب یہ آپ کا شہر نہیں ہے یہاں کے مرد عورت تہذیب یافتہ نہیں ہیں۔ یہاں عورت و مرد میں تعلقات تفریحی اور وقتی نہیں ہوتے۔ ان کی غرض گھر بنانا ہوتی ہے۔ ان عورتوں کا گھر بس کر اُجڑ چکا۔ آپ کی ہمدردی کی انہیں ضرورت نہیں۔ وہ عزت آبرو سے اپنی گزر بسر کر لیتی ہیں!"

میں نے اس پر بھی بس نہ کیا۔ "آپ جتنی بھی تعریف کریں ان کا معیار زندگی زیادہ بلند نہیں کیا جا سکتا۔"

ناصر بڑے زور سے "ہونہہ!" کہہ کے پاؤں پٹکتے اندر چلے گئے۔

یہ قصہ تھا ۱۹۳۵ء کا۔ کئی سال میں جیران پور نہ جا سکا۔ ۱۹۴۷ء میں ناصر نے اپنے لڑکے اسلم کی شادی ٹھان دی۔ اب تو جانا ہی پڑا۔ قصبہ اسٹیشن سے چار فرلانگ پر تھا اور راستہ عام طور سے بہت ناہموار۔ میں نے اسی لئے ناصر کو پہلے ہی سے اپنے آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ اسٹیشن پر ان کا آدمی بھی تھا اور سواری بھی تھی۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہی اسٹیشن پر ایک خاص قسم کی چہل پہل دیکھی۔ دو ایک سپاہی بھی ٹہل رہے تھے، پانچ چار پنجابی بھی زلفیں رکھائے، پٹے کٹائے وردیاں پہنے باتیں کر رہے تھے۔ پھل بھی بک رہا تھا، مٹھائی بھی تھی اور بیرے نکلس لگائے، ہاتھوں پر چائے کا سامان رکھے "چائے صاحب؟ چائے صاحب؟" کہتے چلے آ رہے تھے۔ باہر نکلا تو سڑک بھی حد نظر تک درست دکھائی دی۔ مجھے محسوس ہونے لگا میں کسی نئی جگہ، اجنبی دیس میں جا رہا ہوں۔ ناصر صاحب کے گھر تک پہنچتے پہنچتے جو راستہ کاٹے نہ کٹتا تھا چشم زدن میں طے ہو گیا۔ نئی نئی عمارتیں تھیں، نئے نئے دفتر تھے، باغ کی جگہ چٹیل میدان تھے جنگل کی جگہ ہموار سبزہ زار تھا۔ پھر اتنا ہی راستہ طے کرنے میں چار ٹرک ملے اور دو تین جیپ گاڑیاں بغل سے گزر گئیں۔

ناصر اپنے پچھلے تپاک سے ملے۔ میں نے دیکھا ان کی گڑھی کچھ بوسیدہ سی ہو رہی ہے کچھ حصے گر پڑ گئے ہیں، کچھ بے تعلق پڑے ہیں۔ مجھے تعجب سا ہوا کہ ناصر سا منتظم اور خوش سلیقہ آدمی اور مکان کی یہ حالت، بیٹے کی شادی ٹھان دی اور مرمت تک نہ کرائی۔ ملاقات ہوتے ہی تو یہ بات پوچھنے کی نہ تھی اس لئے اس وقت تو چپ ہو رہا لیکن دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

میں نے پوچھا "کیوں جی بھلے مانس، یہ تم نے گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اتر والا کمرہ مزار کے لئے جگہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ دکن والا دالان دیدہ بے نور کی طرح اپنی ساری چمک کھو چکا ہے۔ سید سے بُرج کی دیوار کی اینٹیں بوڑھے کے دانتوں کی طرح گھس بھی گئی ہیں اور گر بھی رہی ہیں۔ آخر بیٹے کی شادی کر رہے ہو کچھ تو لیپ پوت کرائی ہوتی؟"

ناصر نے ٹھنڈی سانس بھری "میاں تم شاید کسی ہوائی اڈے کے قریب نہیں رہتے۔ ۱۹۴۲ء میں سرکاری حکم ہوا جیران پور میں اڈا بنے گا۔ قصبہ کا سارا چونا، سارا کوتا، ساری اینٹیں، سارے درخت چشم زدن میں حکومت نے لے لئے۔ گاؤں کے سارے محنت مزدوری کرنے والے، چمار، اہیر، پاسی، جولاہے، پٹھان، ٹھاکر، برہمن، ڈیڑھ روپے، دو روپئے، تین روپے روزینہ پر جوتے گئے۔ جنھوں نے عمر میں اتنا نہ کمایا تھا، ان کی عقلیں ماری گئیں۔ آہستہ آہستہ سب کے سب باہر بھیج دیئے گئے۔ کوئی برما گیا، کوئی آسام، کوئی ایران گیا، کوئی مصر بعض ان میں سے وہیں مر کھپ گئے، کچھ ہاتھ پاؤں کٹا کر واپس آئے، کچھ اب تک فوج میں کام کر رہے ہیں۔ راستے میں جو نئے مکانات تم نے دیکھے ہیں وہ انہیں نو دولتوں کے ہیں۔ پورے قصبے میں بصرف ڈیڑھ یا ڈھائی مزدور ہیں۔ پانچو چمار، بکسی حجام اور تلسیا چمارن۔"

میں نے کہا "تو یہ تو تین ہوئے۔ ڈھائی ڈیڑھ کیسے؟"

وہ بولے "تلسیا عورت ہے۔ اسلامی قاعدے سے عورتوں کا حصہ مرد کے آدھا ہوتا ہے۔ یوں اگر لو تو ڈھائی ہوئے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تینوں ملا کر ڈیڑھ سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ پانچو فوج سے ایک ٹانگ اور بکسی ایک ہاتھ کھو کر لوٹا ہے، اور تلسیا فاقہ کرتے کرتے اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اس کے ہاتھ بھی ہلتے ہیں، گردن بھی ہلتی ہے اور آنکھوں سے بھی کم سوجھتا ہے......"

مجھے تلسیا کا نام پہچانا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے کہا "یہ وہی تلسیا تو نہیں جو پسائی کا کام کرتی تھی؟"

کہنے لگے "ہاں جی، اچھی خاصی تندرست عورت تھی۔ ڈھائی تین سیر روزانہ آٹا پیستی، تین چار سیر دال دل لیتی، لیکن شارت اعال راؤ سیٹھ نے آٹے کی مشین نکالی بس سارا قصبہ ادھر جھک پڑا۔ چاول پیسنے والیاں فاقہ کرنے لگیں۔ رام بسیا بھیک مانگ کر مر گئی۔ تلسیا ابھی تک زندہ ہے۔ اور ہم لوگ جو اسے مزدوری پر لگا دیتے ہیں تو اسی خیال سے کہ کسی طرح کمبخت کو پیٹ بھرنے کو چار روٹیاں مل جائیں ——" وہ کچھ سوچنے لگے۔

میں نے پوچھا "اور وہ دونوں جو جوان تھیں؟"

ڈیوڑھی پر سے ماظہورن نے پکارا "حضور اندر بلایا جا رہا ہے"

ناصر یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے "کہ پھر کبھی باتیں ہوں گی۔"

شام کو تقریباً چھ بجے ناصر نے اپنی فٹن گاڑی منگائی خاصے

بڑے رئیس تھے۔ موٹر بیٹھنے لے سکتے تھے۔ مگر شدائد کا اتنا شدید ان پر اثر تھا کہ باپ دادا کے چلن سے ایک قدم ہٹنا پسند نہ کرتے تھے۔ فٹن پرانی ہونے پر بھی اچھی حالت میں تھی۔ رنگ روغن درست تھا، اسپرنگ اچھی تھی ربڑ نیا تھا۔ اور گھوڑا بہت ہی سبک خرام۔ ہم لوگ جس طرف جا رہے تھے دور دویہ بڑے بڑے پکڑ اور املی کے درخت تھے۔ کہیں کہیں تو ان کی گھنی شاخوں کی محراب سے نکلتی ہوئی سیمنٹ کی سڑک خوب ناریں ہلال کی طرح چمک اٹھتی تھی۔ ہوا میں ایک ہلکی سی طراوت تھی جیسے وہیں پاس ہی کے کسی تالاب میں غوطہ لگا کر آئی ہو۔ اس پُر لطف فضا میں گھوڑے کی ہموار چال ویسی ہی اچھی معلوم ہوتی جیسے تنہائی میں کوئی میٹھا جملے سے شغل کرے۔ سڑک پر بالکل سناٹا تھا، نہ یکہ، نہ گاڑی، نہ ٹرک، نہ لاری، نہ جانور نہ آدمی۔

میں نے اس مترنم سکوت کو ایک سوال سے توڑا۔ "بھئی ادھر اتنا سناٹا کیوں ہے؟"

ناصر نے کہا "یہ سڑک خاص طور سے پیرڈل ٹنکی کو جاتی ہے۔ اس پر سورج ڈھلنے ہی کوئی نہیں چلتا۔ فوج والوں سے ہر ایک ڈرتا ہے۔"

فوجیوں سے ڈرنے کے اسباب پر میں غور ہی کر رہا تھا کہ سب سے ایک نیا کچا مکان دکھائی دیا۔ دو منزلہ خوبصورت سا، اس کے سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑی تھی۔ اور اس کے قریب ہندوستانی سپاہی باہر کھڑے سگریٹ پی رہے تھے، باتیں کر رہے تھے، قہقہے مار رہے تھے۔ میں نے سمجھا کسی افسر کے ٹھہرنے کی جگہ ہوگی۔ پھر بھی اس پر تعجب تھا کہ لڑائی کے زمانہ میں ڈسپلن اتنا خراب کہ افسر کے بنگلے کے سامنے کھڑے ہیں اور فوجی بے ترتیبی سے نہیں کھڑے ہیں بلکہ ہنس رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔ میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ دوسرا چھوٹا سا احاطہ دکھائی دیا۔ اور اس کے بیچ میں ایک بنگلہ۔ پھاٹک پر سڑک کے سامنے ہی ایک عورت اور فوجی میں تفریحی چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ عورت جیسے ناصر کے گھوڑے کی ٹاپ پہچانتی تھی۔ فٹن کے مقابل آتے ہی وہ جھپٹ کر الگ ہو گئی اور اس نے ناصر کو جھک کر سلام کیا۔

ناصر نے جواب دینے کی جگہ گھوڑے کو چابک ماری۔ وہ فٹن لے کر بھاگا۔ ناصر نے پوری قوت صرف کر کے اس بپھرے جانور کو ایک فرلانگ پر جا کر روکا۔ اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "حرام زادی!"

میں نے مسکرا کر کہا "جی گھوڑا نمک حرام ہے......"

وہ ہنس دیئے "اتنا میں بھی جانتا ہوں، لیکن میں نے گالی سلام کرنے والی کو دی تھی۔"

میں نے پوچھا "وہ کون ہے؟"

وہ میری طرف اس طرح مڑ پڑے جیسے اس پورے قصے میں ساری شیطنت میری ہی تھی۔

جی، وہ پہلا بنگلہ رم بیٹا کا ہے اور دوسرا مجیدن کا۔"

میں نے تعجب سے کہا "وہی قصبہ میں آٹا پیسنے والیاں؟"

وہ بگڑ کر بولے "جی ہاں۔ پہلے وہ قصبہ میں آٹا پیستی تھیں وہاں سیٹھ کی مشین آگئی۔ انھوں نے بھی پیٹ بھرنے کے لیے اپنی مشین چلائی۔ اُن کا معیار زندگی برابر بڑھتا ہی گیا۔ اب وہ تہذیب و ترقی کی چوٹی پر ہیں۔ اٹے والیاں! لائسنس دار طوائفیں!"

قلوبطرہ کی ایک رات: — بقیہ صفحہ ۵۴

اس پر بجلی گری۔ قلوبطرہ نے سر جھکایا اور ایک گرم آنسو پیالے میں ٹپک پڑا یہی واحد آنسو تھا جو عمر بھر میں اس کی آنکھ سے نکل کر محلول موتیوں میں شامل ہوا۔

"میری جان ملکہ میں نے لاکھ تعجیل کی مگر تاخیر ہو گئی" انٹنی نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ دعوت ختم ہو گئی۔ لیکن فرش پر یہ لاش کیسی ہے؟"

"اوہ! کچھ نہیں" قلوبطرہ نے جواب دیا "ایک زہر کی آزمائش کر رہی تھی کہ اگر آگسٹس مجھے قید کر لے تو استعمال کروں"......

کیا آقائے نامدار میرے پاس تخت پر فروکش ہو کر ان یونانی مسخروں کی جگت پھیریاں دیکھینگے؟"

(تھیو فائل گوتیے)

پیچیدہ فطرت: — بقیہ صفحہ ۵۵

اس کا ہر معاملہ۔ مجھے خوشی نصیب نہ ہوئی۔ میری راہ میں پھر رکاوٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ خوشی مجھ سے دور ہے۔ کوسوں دور۔ اف، میری بدبختی۔ کاش تم اس کو سمجھ سکتے۔"

"مگر کیا واقعہ پیش آیا۔ اب آپ کی راہ میں کونسی رکاوٹ حائل ہوئی۔ بتائیے مجھے مہربانی کر کے بتائیے۔"

"مجھے پھر ایک دولتمند بڈھا نصیب ہوا۔"

حسینہ نے اپنا چہرہ پنکھے سے ڈھک لیا۔ مصنف اپنے ہاتھوں کے بل سر کو تھامے ایک ماہر نفسیات کی طرح غور کرنے لگا۔ انجن سیٹی بجاتا اور دھواں پھینکتا تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں درجہ کی کھڑکیوں کے پردوں کو خون آلودہ بنا رہی تھیں۔

بھول

افسانہ

جب یہ دونوں الجھنیں باہم دست وگریباں ہوگئیں تو اسے بیٹراپاسستہ خودکشی کا نظر آیا! جان بچانے کا کیا آسان اور عمدہ طریقہ ہے، بس یہی کہ جان دیدی جائے! مگر کوئی ایک ترکیب ہو تو اس پہ فی الفور عمل کیا جائے۔ یہاں بھی سینکڑوں پھندے تھے۔ اس نے سارے رائج اور غیر رائج اصولوں پہ غور کرنیکا تہیہ کرلیا۔

چھت کی کڑی میں شیفون کا دوپٹہ ڈال کے پھانسی دے لی جائے! لاحول ولاقوۃ، یہ بھی کوئی ڈھنگ کی موت ہوگی! بڑی بوڑھیوں کے کہنے کے مطابق ہاتھ بھرکی زبان ایک طرف نکل پڑے اور نظر نرگس رنگت غزال مد بھری انکھیاں علیحدہ نکل پڑیں!! گردن ابھی خیر کے ساتھ مینا کو شرماتی ہے، پیچ کھاکے ہوجائیگی تار کا کھمبا! ظفر دن دہاڑے لاش کو دیکھکر ڈر گیا تو یہ مرے پہ سو دُرے ہوئے! کبھی یاد کرنا تو کیا معنی راتوں کو سوتے سوتے ڈر کر ڈرے گا! اور کمبخت کو یہ خبر بھی نہ ہوگی کہ اسی کی خاطر .... یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔

یہ بھی ترکیب ہے کہ ٹہلتے ہوئے کسی دن ندی تک پہنچیں ..... یا اپنے ہی باغ کا کنواں بہی ..... اور ٹھنڈے ٹھنڈے اللہ کے گھر سدھاریں ..... مگر اس میں یہ مشکل ہے کہ گھر والوں کو شاید کئی دن تک حادثہ کا پتہ ہی نہ چلے! اور یہ مشہور ہوجائے کہ صاحبزادی صاحبہ فرار ہوگئیں ...... ظفر علیحدہ بدگمان ہو اور اماں باوا بے پانی جلدڈوب مریں! پھر جب کہیں ندی کے اس پار کسی مچھیرے کے جال میں پھنسیں اور وہ موٹی مچھلی سمجھ کر جلدی جلدی نکالے یا مالی کی ناک لے تانس بو سنگھائے اور وہ کنواں جھانکے تو یہ راز کھلے کہ بیچاری اللہ کو پیاری ہوئی۔ اب وہ شہید عشق کی لاش منظر عام پر لائی جائے تو ...... تو حاضرین کی آنکھ ناک پناہ مانگیں ...... تعفن ایسی کہ ہیبیوں باغ رشک ارم بیمار ہے اور صورت ایسی کہ ..... یاد ہے وہ کتا جو پچھلے برس کنوئیں میں گر گیا تھا بعد میں نکالا تو پھول کر کمبخت گدھے کی برابر ہوگیا تھا ...... ابھی یہ کتے کی موت مرنا گوارہ نہیں! حالانکہ کہا ہے کسی نے:—

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کبھی مزار ہوتا!!

اچھا اب دو منزلہ کی اس کھڑکی سے کود کیا رہیگا؟ بہت اونچائی نہیں ہے جو جسم بکھرے نہ بکھر جائیں کھوپڑی کے تو کھیلیں ہونگی اور بھیجا گھنگرالے بالوں میں الجھے گا۔ ایسے پڑے ہونگے پتہ بھی نہ چلیگا کہ ان میں سڈول بازو کون سے ہیں اور تھرکتی ٹانگیں کدھر گئیں! ادھر گری اُدھر ٹھنڈی ہوئی۔ ایسی میں وہ ظفر اپنی نئی نویلی ڈاکٹری کا بھی خاک استعمال نہ کر سکیگا بلکہ دور کھڑے گا کہ اس سنہری لڑکی کا یہی حشر ہونا تھا! سارے میں کود کی پھرتی تھی بس ایک دفعہ قدم بہکے اور ختم! کبھی بھول کر بھی نہ سمجھ پائیگا کہ ہم نے دانستہ جان دی ...... اس جوانی میں ...... اس بیہودہ کے پیچھے ....

گولی مارنے کی واردات اکثر دبیشتر سننے میں آتی ہیں سینکڑوں نامرادوں کا آزمودہ طریقہ ہے اور یہ بھی ہے کہ اسے کوئی غلطی یا اتفاق سے تعبیر نہ کرے گا، ظفر کو جان نثاری ماننا ہی پڑے گی۔ مگر آفت یہ ہے کہ گھر میں کوئی ریوالور تو ہے نہیں کہ کنپٹی کے پاس رکھا اور لبلبی دبادی .... وہی ابا جان کی دونالی بندوق جسے اٹھانا بھی پہاڑ سے کم نہیں ہے، کسی نہ کسی طرح مشکل سے چلا بھی لی تو کیا ضرور سینہ سے لگ بھی جائے گی، فرض کیجئے نال رکھی تھی کنپٹی پہ! اور ہاتھ ہلا تو ہم باقی جو ں کے توں رہے محض کان اڑ گیا! لیجئے حسن میں یہ جانکاہ اضافہ اور ہوا ...... یا پھر چلاتی تھی دل پہ رکھ کے اور نکل گئی بغل میں ہوکے! ناحق کا فضیحتہ بنے گا اور فوراً کسی سے شادی کردی جائے گی بلا تاخیر!

اسی سلسلے کی ایک زنجیر چھری چاقو سے متعلق ہے مگر وہ بھی منہ کا نوالا نہیں! اول تو پنسل تراشنے کے چاقو سے یا ڈائیننگ ٹیبل کی چھری سے کام چل نہیں سکتا، اس کے لئے چاہئے کوئی آبدار ہتھیار کہ ادھر سینے پر رکھا اُدھر دل کے پار ...... یوں تو باورچی خانے میں گوشت بنانے کے لئے بڑا تیز چھرا رہتا ہے، ابھی پرسوں زرا سے میں باورچی کا ہاتھ لہولہان ہوگیا تھا مگر اس کی نوک تیز نہیں جو دل ول میں گھونپ لیا جائے اس سے تو محض گردن کاٹی جاسکتی ہے مگر حضرت! یہ اپنا گلا آپ کاٹنا کچھ شاعروں کو ہی زیب دیتا ہے، اور یہاں بات شعر و افسانہ کی حد میں آنے سے قبل ہی تلخ حقیقت بن گئی تھی۔ اسے انصار ناصری کی "چندرا مونی" یاد آگئی ...... فرض کیجئے گا گلا کاٹا اور وہ سلیقہ سے۔ کٹ سکا اور رگ ثابت رہ گئی اور بعد میں ٹانکے لگادئے گئے تو یہ کچھ ملکہ نور جہاں کے ہاتھ نہیں جن میں جہانگیریاں پہنادی جاتیں یہاں تو کوئی گلوبند ایجاد کرنا پڑے گا!

بہت سے لوگ ریل یا موٹر کے سامنے آکر جان دیتے ہیں مگر وہی صورت حرام کا مسئلہ پیش ہوگیا۔ یہاں مر کے مثال قائم کرنا ہے، چڑیل بننے کا ارمان نہیں! اگر قبر پر فاتحہ تو ایک طرف، یاد کئے ہول آئے!

اب آخری اور سب سے بہتر بات یہی کچھ کھا کے سو رہنا۔ اس میں کچھ بل بیل نہیں پڑتے! کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ لطف یہ کہ سب سے پہلے اسی کو بلایا جائے گا وہ کبھی پھڑکتی نبض دیکھے گا کبھی دھڑکتے دل کو سنے گا، کیا ہیت کردہ عمل ہوئے اور ساری تنوطیت چھوڑ کے صاف صاف کہدے کہ ہائے ملیحہ تونے یہ کیا غضب کیا مجھے کہیں کا نہ رکھا ہائے جلد باز لڑکی میں آج شام کو تجھ سے اظہار عشق کرنے آنے والا تھا ...... خیر اب تو پریشان نہ ہو لو یہی خوشی مرجا! وعدہ کرتا ہوں کہ جونہی تجہیز و تکفین سے فرصت ہوئی میں اپنے ہسپتال میں جو سب سے زیادہ زود اثر زہر ہوگا وہی نکال کر کھالونگا اور ہم دونوں عالم بالا میں اٹھلاتے پھرا کرینگے ...... افوہ اگر

تسنیم

کہیں ظفر ایسا کہہ دے تو نزع کا عالم بھی کتنا خوشگوار بن جائے۔ مرتے دم یہ سکون تو ہو کہ ہم نے اس پتھر کے بت کو بھی سجدہ کرا ہی دیا۔

بس یہی ٹھیک رہیگا ...... مگر کیا کیا جائے آخر؟ اس نے ناک میں پہنی ہوئی ہیرے کی کیل کو انگلی سے چھوا ...... ہیرا زہر قاتل ہوتا ہے نا!! لیکن ایسی قیمتی چیز کو ضائع کرنا کیا ضروری ہے۔ یہ کیل آپا جان کے کام آئے گی ...... ہم تو دو چار آنے کی چوڑیوں کا کانچ یا دس بارہ آنے کی شربت دین کی شیشی سے بھی کام چلا سکتے ہیں ...... شماتت ہمسایہ سے بچنا تو محال ہوگا مگر نقصانِ مایہ سے بہتر کیوں نہ کیا جائے۔ شیشہ کھانے سے تو سنا ہے کہ آنتیں کٹتی ہیں اور پیٹ میں بڑا سخت درد اٹھتا ہے۔ اس سے تو ٹنچر آیوڈین ......

اس نے زینے پر چڑھتے پہچانے قدموں کی آہٹ سنی، چلنے کا وہ مخصوص انداز جس کی بابت کہتی تھا کہ ؂

لرزتے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر!

منجو نے آتے ہی کہا" خیر تو ہے یہ۔ تمی صورت کیوں بنائی ہے؟ "کیا بہت دن سے ظفر کو نہیں دیکھا؟"

"منجو چھیڑو نہیں ...... بہت کوفت ہو رہی ہے آج!"

"یہی تو پوچھتی ہوں کہ ہے کی کوفت ہے! ظفر کب سے نہیں آئے؟"

عطیہ نے بتایا" رات ہی تو آئے تھے ...... بس اس دن تمہارے سامنے آئے یا پھر ہفتہ بھر بعد رات صورت دکھائی دی۔"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟ دری انداز میں کیا؟"

"بدتر ...... مجھ سے تو کیا باتیں ہوتیں دعا سلام!! مزاج شریف!!! البتہ اماں نے شکوہ کیا کہ تم مہینوں صورت نہیں دکھاتے، خون سفید ہوگیا ہے، بہن سے شکایت کروں گی ...... کہنے لگے کام کی فرصت نہیں ملتی ...... امی سے کیا شکایت کیجیے گا وہ تو روز مجھ سے کہتی ہیں کہ آپا کے پاس ہو آنا مگر مجھے فرصت ملے تب ہی نا ...... میں نے پوچھا ظفر بھائی پان کھائیے گا؟ بولے کہ اس دن تم نے پان دیا تھا تو ایسا منہ کٹا کہ کھانا تک نہ کھایا گیا ...... اب تمہارے ہاتھ کا پان نہ کھاؤں گا! قاسم بیٹھے تھے وہ کہنے لگے ایسا ہی پان کھلانے کو دل ہے تو مجھے کھلا دو۔ اس پر آپا بولیں کہ واہ ابھی میں نے آپ سے پان کو پوچھا تو آپ نے صاف منع کر دیا تھا ...... میرا جی جل گیا تھا، میں وہاں سے اٹھ کر چلی آئی ......"

منجو بگڑ پڑی" تم ہی کیوں اس اللہ مارے کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہو؟ بہت ہی دماغ خراب ہے اسکا! جب نہ تب آلو کی سی صورت بنائے اونگھا کرتا ہے اور جو تم کو ذرا بھی پوچھے تو خیر صبر ہے مگر اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے! قسم خدا کی میں تو ایسے مردچڑوں کو اپنی ایڑی چوٹی پر سے صدقے کر دوں۔ وہ ایک دفعہ بات نہ کرے تو میں سات دفعہ، ٹھینگا منہ پر نہ ٹھوکوں۔ ...... تم کو کیا پسند ہے؟ کونسی ادا بھا گئی اس کی؟"

عطیہ نے کہا" اب تو ضد سی ہو گئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ اگر میں نے بار مان لی تو میری ذہنی شکست ہو جائے گی اور میں کبھی کسی انسان کے ساتھ خوش نہ رہ سکوں گی ...... مجھے یہی خیال مارے ڈالتا ہے کہ ظفر نے مجھے منہ نہیں لگایا ...... کیسی شرمناک بات ہے یہ! چاہے جان جائے میں نے سید عابد کے چھوڑ دوں گی ...... کیا وہ انسان نہیں ہے ...... ایمان سے منجو میں اس کی بہت سی باتیں پی جاتی ہوں مگر جب وہ قاسم یا آپا کے سامنے کچھ ارشٹ پٹانگ سا جواب دے دیتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

منجو نے کہا" قرآن کی قسم اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہونگی کہ عطیہ پاگل ہے، ترا یہ ہٹ تو مشہور ہے۔ بس اسی ہٹ کے پیچھے زندگی تباہ کر رہی ہے۔ اری کمبخت یہ تو سوچ کہ اس خنگلی میں دھرا کیا ہے مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ تمہارا معیار ایسا پست ہوگا جب اول اول تم نے ظفر کا تذکرہ کیا تو میں کبھی کہ نہ جانے کیا قیامت خیز چیز ہوگی جس نے غریب قاسم کی دال نہ گلنے دی اور پھر جو اس دن دیکھا تو دیکھتی رہ گئی! ہے کیا جس کے پیچھے ہٹی ہو؟"

یہ بات خود عطیہ کو بھی معلوم نہ تھی۔

منجو نے طنزیہ لہجے میں کہا" یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے ظفر کے یہی ڈھنگ رہے تو کیا کرو گی؟ اس کے پیچھے جوگ لو گی؟ جنگلوں کی خاک چھانو گی؟ ...... اور فرض کرو وہ تمہاری تمنا کے مطابق تمہارے عشق میں مبتلا ہو جائے تو کیا تم اس سے شادی کرکے خوش رہ سکو گی؟ وہ اجاڑ ایسی تمہارے لئے مناسب رفیق حیات ثابت ہوگا؟ جب نہ تب تو وہ پینک میں رہتا ہے لڑکے اسکا مذاق اڑاتے ہیں لڑکیاں اس پہ نفرت کستی ہیں، میاں نہ ہوا تماشہ ہوگیا۔ اور تم اس کے پیچھے قاسم کو ٹھکرا رہی ہو، اچھی ضد ہے ماشاء اللہ ......"

"محض ایک ضد ہی نہیں ...... تم حیران ہوگی منجو ...... مجھے بھی حیرت ہے کہ آخر یہ مجھے ہوا کیا ہے مگر جب بھی سنجیدگی سے سوچا ہے دل سے یہی جواب ملا کہ اگر دنیا میں کسی کے اندر کشش ہے، کسی کی توجہ مجھے مسرور کر سکتی ہے کسی کی لاپرواہی مجھے غمگین بنا سکتی ہے تو وہ صرف ظفر کی ذات ہے ...... میں جانتی ہوں کہ ظفر کی ذات عورتوں میں مقبول نہیں اور مرد اسکا مضحکہ اڑاتے ہیں مگر میرے پاس اپنے احساسات کا کوئی مداوا نہیں ہے ...... البتہ یہ میں جانتی ہوں کہ اگر قاسم اور دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح ظفر بھی مجھ سے التفات برتتا تو میں اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتی۔ اس کی بےرخی میرے لئے جانکاہ ہے۔

مجھے معلوم کرنا ہے کہ اس کے دل میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں یا کہ وہ معذور ہے اور اگر وہ معذور ہے تو کیا دنیا کی کوئی عورت اسے شکست نہیں دے سکتی؟" اسے خود ہی اپنے پرجوش لہجے سے اجنبیت محسوس ہوئی اور جھینپ کر منجو کی طرف دیکھنے لگی۔

"میری قابل دوست تم نے ان محققین کو شاید سنا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی کسی ادنیٰ سی چیز کی حقیقت معلوم کرنے میں گزار دی۔ اور شاید اسی وجہ سے تم بھی شہرت حاصل کرنے کے لئے ظفر کی دماغی تحقیق چاہتی ہو...... مگر دماغ رہے کہ تمہیں بہت دیر بعد اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور اس تاخیر کے باعث تم مجبور ہو جاؤ گی کہ اپنے کئے کی سزا خاموشی سے بھگتو اور اف نہ کرو...... ایک تو تمہاری ضد تمہاری نسائیت کا تقاضہ ہے اور پھر تمہارے حسن و شباب کا اصرار ہے کہ تم اس توہین کا بدلہ لو جو ظفر کی بیگانہ روی سے تمہاری ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ گی اور ظفر تم سے اظہار محبت کرے گا تو وقتی طور پر تمہارے جذبہ تکبر کی تسکین ہو جائے گی مگر شادی کے بعد...... جو اس کا لازمی نتیجہ ہے...... کیا تم دو دن ـــ رہ سکتی ہو کہ ایسے بیگانہ روش انسان سے مطمئن رہو گی؟ ہنوز تمہیں بھی فطرت کا صحیح مطالعہ معلوم نہیں۔ عورت میں محبوبہ بننے کا مکمل مادہ موجود ہے اور وہ طالبہ محبت میں وہ عاشق بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر یہ امر محال ہے کہ عورت کسی ایسے مرد سے محبت کر کے اسے زندگی کا ساتھی بنا کے خوش رہے جو ہمیشہ اس سے سرکش رہا ہے۔"

منجو نے سہمے ہوئے انداز سے پلک جھپکتے "یہ پند و نصائح کیسے...... میں کسی کو مجبور تو نہیں کر رہی ہوں......" "کسی کو محبت کے لئے مجبور کرنا تمہارے امکان کی چیز ہی نہیں...... البتہ تم انتخاب کرتے وقت حماقت سے کام لے رہی ہو...... ایک طرف قاسم ہے جو تمہارے اجتناب کے باوجود تم سے نا امید نہیں ہے اور اسے تاحیات یہ احساس رہے گا کہ تمہارا حصول اس کی سب سے بڑی فتح ہے وہ ہمیشہ تمہیں گرانقدر سمجھ کے عزیز رکھے گا۔ دوسری طرف ظفر ہے جس نے کبھی تم سے اچھی طرح بات بھی نہیں کی کبھی تمہارے نزدیک آنے کی خواہش نہیں کی...... مگر تم قاسم کو اسے ٹھکرا رہی ہو کہ وہ تمہارے پیچھے پیچھے گھسٹ رہا ہے۔ اور ظفر کے پیچھے اس لئے جا رہی ہو کہ وہ مڑ کر تمہاری طرف نہیں دیکھتا ابھی کچھ نہیں بگڑا عقل سے کام لو، ایک طرف قاسم کے کھنکتے قہقہے دن کا چین اور رات کی نیند اڑا دیں، دوسری طرف ظفر جس کی ماتمی صورت دیکھ کے بھلے چنگے آدمی کو ٹھنڈ آ جائے۔ یا تو قاسم کی مے ریز آنکھیں جن پہ رعنا نے روڈہائی صفو کی نظم لکھ ڈالی تھی یا وہ ظفر کے بے حس دیدے جن کو دیکھ کے بقول نسیمہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اس بیچارے کے ساتھ اس کی پیدائش سے پہلے ہی کوئی سخت ٹریجڈی ہو گئی ہے...... دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوا...... جو کوئی سنے گا کہ اس ہیرا جیسے قاسم کو ٹھکرا کر عطیہ سنگ موسیٰ سے ڈھلے ہوئے ظفر کو......"

عطیہ نے چڑ کر کہا "مانا قاسم میں ساری خوبیاں ہیں وہ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے مگر تم اسے میرے حوالے کرنے پر کیوں مصر ہو؟ اس کوہ نور کو اپنے تاج میں جڑوا لو...... تم کیوں نہیں کر لیتیں اس سے شادی؟"

"اوئی بہن ہے ہے۔ دو میاں کون سے مذہب میں جائز ہیں۔ میری تو منگنی ہو چکی، اب تو قاسم میرے لئے بھائی کے برابر ہے۔"

"منگنی سے کیا ہوتا ہے ٹوٹ جائے گی"

"توبہ! تیرے منہ میں خاک!! بڑی آئی کہنے والی میری تو ٹھیکرے کی مانگ ہے میرے میاں۔ اگر قاسم کا نام بھی سن لیا تو جان کا خون کر دے گا...... بڑا اکھڑ ہے وہ!"

"اور تمہیں وہ اکھڑ کیوں برا ہے؟" دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں بھئی" منجو نے شرمانے کی ناکام کوشش کی "وہ مجھے بہت پسند ہے کیا بھی ہے......"

"بس اسی طرح...... اسی طرح مجھے ظفر اچھا لگتا ہے...... بچپن سے......"

منجو گھبرا گئی "وہ تمہاری فکر کرے تو خیر حرج نہیں مگر تم تو زبردستی گلے پڑتی ہو کبھی قدر کی نگاہ سے بھی نہ دیکھے گا۔ قاسم البتہ تم پہ فدا ہے وہ مرتے دم تک تمہارا غلام بنا رہے گا......"

عطیہ نے جھنجھلا کر کہا "منجو تم بار بار قاسم کا نام کیوں لیتی ہو...... جیسے تمہیں آپا جان کی بابت علم نہیں! قاسم جب تک میرے پاس بیٹھے ہیں وہ کیسی مضطرب نظر آتی ہیں اور جب کبھی میں قاسم سے مخاطب ہو جاتی ہوں تو وہ کس قدر بے تاب ہو کے رہ جاتی ہیں...... قاسم بے وقوف ہے جو میری بے اعتنائی کے باوجود ہمت نہیں ہارتا اسے چاہئے کہ وہ آپا جان کی قدر کرے......"

"ہائیں نا راہ برا! قاسم تو دل پہ پتھر رکھ کے تمہاری آپا جان سے سر پھوڑے اور تم اس بیہودہ ظفر کی وجہ سے اس کی زندگی تلخ کر دو...... ذرا تم ہی ظفر کو چھوڑ کے قاسم کی قدر کر لو! تو سب اپنے اپنے دل کے مالک ہیں...... ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ مرد ٹھکرا دے تو عورت کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے میں ہوتی تو پلٹ کے ظفر کا نام نہ لیتی...... سچ کہنا تمہیں اپنی ہتک نہیں محسوس ہوتی؟"

عطیہ نے سوچا کہ کاش میں نے منجو کے آنے سے پہلے ہی کچھ کھا لیا ہوتا تو اس سوال کا مکمل جواب دیتی...... اور وہ رونے پر آمادہ ہو گئی۔

"منو خدا گواہ ہے مجھے اپنی جان دوبھر ہو گئی ہے...... مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی، دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں، خیر، اللہ نے چاہا تو جلدی سن لو گی کہ عطی زہر کھا کے مر گئی۔"

منو نے تڑپ کر کہا "ماشاء اللہ یہ نیا شوق سوجھا ہے، تو مرد اور سارے گھرانے کی ناک کٹواؤ، عمر بھر برادری والے طعنے دیا کریں کہ عطیہ ظفر کے عشق میں زہر کھا کے مر گئی۔ ادھر زندگی خراب ہوئی سو ہوئی۔ اُدھر عاقبت بھی خراب...... اور یہی تم سمجھی ہو کہ لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح تمہارا نام بھی روشن ہوگا کتابیں لکھی جائیں گی، نظمیں کہی جائیں گی تو صاف کان کھول کے سن لو کہ ایسا ہونے نہ رہا، اوّل تو سب ہی کوشش کریں گے کہ جس طرح بھی ہو بات دب جائے اور کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو وہ وہ لعنتیں برسیں گی کہ......"

عطیہ اس سے بھی ڈر گئی "پھر کیا کروں؟"

منو نے کہا "بھئی میری رائے لینی ہو تو صاف بات ہے، ظفر کو مارو گولی اس پہ تو کوئی پاگل لڑکی شادی کرے تو کرے ورنہ عمر بھر کنوارا رہے گا! اور تم چپ چاپ قاسم کو قبول کر لو...... جانے تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اسی قاسم کے پیچھے وہ نسیمہ دوڑ دوڑ کر تمہارے گھر آتی رہتی، اسی قاسم کی محبت میں اچھی خاصی رعنا شاعرہ بن بیٹھی، اسی قاسم کے تذکرے محفلوں کی جان ہیں..... ایسا انمول انسان تمہاری ایک نظر کی خاطر صبح سے شام تک تمہارے کمرے کا طواف کرتا ہے، اور تم اسے منہ نہیں لگاتیں...... ظفر تو قاسم کی جوتی کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔"

اور جب منو چلی گئی تو عطیہ کے خیالات نے اور بھی گورکھ دھندے کی شکل اختیار کر لی، وہ قاسم سے شادی کرے تو ایک طرف جانے آپا جان کا کیا حشر ہو اور پھر اس کی اپنی ہار! آخر ساری کوششیں بیکار گئیں، ظفر نے پروا نہیں کی...... تو یہ احساس ساری عمر انگاروں پہ سینکتا رہے گا...... اور قاسم کیا اندھا ہے وہ بھی جلائے گا کہ بہت ظفر کے لئے جان پھلکے تھے اس نے قدم نہ رکھا تو ہار جھک مار کے میرے پاس آئی، کیا بگڑ جاتا اگر پہلے ہی......"

منو بھی ٹھیک کہتی ہے خودکشی کا تو یہ مطلب ہوگا کہ "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" یہاں ظفر کے کان پہ جوں بھی نہ رینگے گی وہاں اللہ میاں کے یہاں وہ پکڑ دھکڑ ہوگی کہ توبہ بھلی! پھر خدا جانے کیا کیا تہمتیں تراشی جائیں، باتیں بنیں اور برادری نے سارے گھر کا جینا عذاب کر دیں...... بڑی چیز یہ ہے کہ انسان کو ناامید نہ ہونا چاہئیے، دل اس کا انتظار کیا جائے کہ ظفر میں آدمیت آ جائے اور یہ نہیں تو پھر اس موت کا جو برحق ہے...... اسے دفعتہً ظفر سے زیادہ غالب مرحوم پہ پیار آیا جنہوں نے کسی ایسے ہی بُدھے کے عشق میں مبتلا ہو کر کہا تھا

س ۵ : مُنحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

پڑھتے پڑھتے گھبرا گئی تو نیچے اتری، دیکھا آپا آرام کرسی پر لیٹی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھی

"آپا جان، اماں کہاں ہیں؟"

"اسٹور روم میں!" اس نے غیر ارادی طور پہ اسٹور روم کا رخ کیا۔ آٹے کی بوریاں، دالوں کے مٹکے گھی کے کنستر اور مصالحوں کے ڈبے!! کبھی عجیب شاعرانہ فضا ہے تضیع اوقات کے لئے، چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے کرتے اس نے ایک چھوٹا سا رکھا ہوا ڈبہ کھولا، اور ــــ کھولتے ہی اچھل پڑی، اس میں سنکھیا تھا! چوہے مارنے والی سنکھیا کی گولیاں!!

اس نے ایک دفعہ اماں سے پوچھا تھا کہ اگر اس گولی کو آدمی کھائے تو مرے گا یا نہیں؟

اماں نے کہا تھا کہ "دو ایک گولی سے تو آدمی کیا مرے گا البتہ دس پانچ کھائے تو ضرور مر جائے گا!" وہ مرنے کا ارادہ تو ملتوی کر چکی تھی سوچا کہ اگر دو گولیاں کھا لی جائیں تو کیا حرج ہے بس تھوڑی سی طبیعت خراب ہوگی...... ڈاکٹر کی ضرورت پیش آئے گی...... ظفر ڈاکٹر ہے! زندہ باد!!

اماں بڑی توجہ سے آٹا تلوا رہی تھیں اس نے چپ چاپ دو گولیاں نکال کر ڈبہ رکھ دیا اور وہاں سے کھسک آئی،

"درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست" کے خیال سے اس نے فوراً ہی دونوں گولیاں پانی کے ساتھ سٹک لیں اور صدق دل سے دعا مانگی کہ "اللہ پاک ظفر یاب فرما۔"

مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہونگے کہ اس کا جی متلایا، وہ جلدی جلدی پان بنانے لگی تو دیکھ پوچھنے لگی "کیا وحشت ہے؟"

"جانے کیوں جی متلا رہا ہے!"

پان کھا کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور بیماری کا استقبال کرنے کو تیار ہونے لگی، ظفر نے کبھی آج تک اس کے کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا مگر اب تو یقیناً آئے گا...... اس نے بکھری ہوئی کتابیں قرینہ سے رکھیں، مالی کو گلدان کے پھول بدلنے کا حکم دیا اور منتشر چیزیں اکٹھی کرنے لگی، جب وہ بستر کی سلوٹیں نکال رہی تھی تو اسے ایک ساتھ چکر آ گیا اور سر پکڑ کے بستر پر بیٹھ گئی، دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور آنکھیں...... جیسے کوئی اندر کی طرف کھینچ رہا ہو! زندگی کی قدر کھلنے لگی اور

اس نے سوچا ایسا نہ ہو جو دم ہی نکل جائے! اور یہ سوچتے ہی دم سا نکل گیا! مرنا ایسا آسان کھیل نہیں ہے...... اور پھر بلا کسی تیاری کے...... کوئی وصیت تک نہیں!...... یہ گولیاں تو بم کا گولہ

ہو گئیں...... اسکا سر بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے شعلے ناچ رہے ہوں! اسے یاد آیا کہ چوہے بھی ان گولیوں کو کھا کے خوب چکر کھاتے ہیں اور یونہی لٹو کی طرح گھوم گھوم کے مر جاتے ہیں! اُف توبہ! موت! چوہے کی طرح سے مرنا! سفید سفید کفن، اس کے چاروں طرف لپٹنے لگا اور قبر اپنا بھیانک منہ کھول کر سامنے آگئی! یا اللہ...... وہ چیخ مار کے بھاگی سے ایسا لگا جیسے کوئی اسکا تعاقب کر رہا ہے...... موت کا فرشتہ!!!

آنگن تک آتے آتے اس نے کئی چیخیں ماریں اور اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔ زکیہ کچھ لمحے حیران نگاہوں سے تکتی رہی پھر اٹھانے کو بڑھی اور ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی

"ہائے اماں عطی کو کیا ہو گیا! منہ سے جھاگ سے نکل رہے ہیں۔"

اماں نے سر پیٹ لیا۔ الٹ پلٹ کے دیکھا تو بے حس و حرکت! گھر میں کہرام پڑ گیا محلے پڑوس کی عورتیں جمع ہونے لگیں......

نوکر نے پوچھا "ہسپتال سے ظفر میاں کو بلا لاؤں؟"

زکیہ نے کہا "ارے خدا کے لئے کسی کو بلا لاؤ...... جلدی کرو...... ہائے آج ابا جان بھی گھر پہ نہیں ہیں۔"

ذرا سی دیر میں ڈاکٹر ظفر بوکھلائی صورت بنائے آموجود ہوئے اور قاسم بھی اپنی روزمرہ کی حاضری دینے تشریف لے آئے......

جب عطیہ نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے ظفر سے نگاہ ٹکرائی...... جھکے ہوئے نبض دیکھ رہے تھے...... زرد چہرے پر کسی نے اور منوں پیلا ہرٹ تھوپ دی تھی اور آنکھیں!! پہلے سے کہیں زیادہ ویران! عطیہ نے اپنی آنکھیں میچ لیں...... پھر دیکھا...... ظفر کا چہرہ مشکل سے آدھا گز پرے ہوگا...... کچھ کہنا چاہا، ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھی "خاموش" اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔

چاروں طرف سے مختلف سوالات کی بوچھار ہونے لگی...... وہ ٹکٹکی باندھے اپنے مسیحا نفس کو گھور رہی تھی...... "لیجئے اب تو اطمینان ہو گیا...... آئیے اب آپ کو دیکھیں۔"

ڈاکٹر ظفر کے ساتھ ہی عطیہ کی نگاہ بھی گئی! قاسم کھڑا تھا...... سرخ آنکھیں بکھرے بال اور ماتھے سے لے کے گردن تک خون کی لکیر......

"یہ آپ کو کیا ہوا؟" وہ ظفر کی ہدایت کے مطابق خاموش نہ رہ سکی۔

"قاسم محض مسکرا دیا! ظفر نے کہا "ہونا کیا صاحب! انہوں نے رو رو کر عورتوں کو مات کیا اور میں نے انجکشن لینے ہسپتال بھیجا تو راستے میں سائیکل سے گر کے سارا ماتھا زخمی کر لائے۔"

ظفر کے لہجے میں طنز تھا مگر قاسم کے چہرے پر نا سمجھانہ مسکراہٹ آگئی۔ اس نے قمیض کے دامن سے چہرے کا خون پونچھتے ہوئے کہا "بڑی دیر تک مجھے چوٹ کا احساس ہی نہ ہوا"۔ عطیہ نے سوچا کہ شکیبا کھا کر ظفر کا امتحان مقصود تھا نہ کہ قاسم کا...... قاسم کی شخصیت میں عقدہ ہی کیا ہے جس کی جستجو ہو...... اور یہی وجہ ہے کہ وہ عطیہ کی توجہ حاصل نہ کر سکا تھا۔ عطیہ نے متجسس نظروں سے ظفر کے جذبات کا جائزہ لینا چاہا مگر خشت نقش و نگار کا بھاری پردہ پڑا تھا اور وہ اب بھی تاریکی میں تھی......

اب ڈاکٹر ظفر اس کی طرف مخاطب ہوئے: "اچھا بتائیے آپ نے کیا کھایا تھا؟"

اسکا خون خشک ہو گیا "کچھ نہیں"۔

"کچھ نہیں کیسے...... وہ تو آپ کے پیٹ سے نکلا ہے!"

"کیا نکلا ہے؟" سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"زہر!" —— سب ایک ساتھ اچھل پڑے "زہر!!"

"ارے نہیں ظفر بھائی......" زکیہ اور قاسم نے چونک کر کہا "زہر نہیں ہو سکتا"

"ممکن ہے میرا خیال غلط ہو" ڈاکٹر ظفر نے اپنے کندھے ہلائے "بہر کیف جو کچھ استفراغ میں نکلا وہ آپ لوگوں نے بھی دیکھا تھا"

بہت سی سوالیہ نگاہیں عطیہ کی طرف اٹھیں! حیران!! خشمگیں!!! اور پریشان نگاہیں!!!!

"کیا تم نے غلطی سے کچھ کھا لیا تھا عطیہ؟" قاسم نے ملائمت سے پوچھا۔

مارے ڈر کے آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے اس کے گالوں پہ پھسل پڑے "اللہ قسم میں نے کچھ نہیں کھایا"۔

"ارے ارے تم گھبراؤ نہیں" قاسم سٹپٹا گیا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے کوئی ایسی غذا کھائی ہو جس میں پوائزن کے اثرات پیدا ہو چکے ہوں"

"ہاں یہ بھی ممکن ہے"۔ ظفر رات کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

عطیہ کی طبیعت سوائے دماغی خلفشار کے درست ہو چکی تھی۔ سنکھیا کی گولیاں بظاہر اس کے معدے سے نکل گئیں مگر اصل میں اس کے پیٹ کے اندر گنبدیں بن کے لڑھکنے لگیں وہ مضطرب تھی کہ کسی سے دل کی بات کہہ کر اپنی بے چینی مٹا دے ورنہ یہ راز آپ سے آپ اس کے ہونٹوں سے پھوٹ بہے گا اور سب کو خبر ہو جائیگی۔

اس نے منّو کو بلا بھیجا۔

منّو آئی تو باہر ہی سے آپا جان نے سنا دیا کہ آج عطیہ مرتے مرتے بچی، ظفر بھائی کہتے ہیں کہ اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی تھی۔" منّو سمجھ گئی کہ عطیہ نے جان بوجھ کے یہ حرکت کی ہے۔ کمرے میں آئی تو غصے سے منہ سرخ تھا

"کہیے آج کیا سوانگ رچایا تھا آپ نے ؟"

عطیہ منّو کے غصہ سے ڈر گئی اور منّو نے سنانا شروع کیا "بھئی عقلی لعنت ہے تم پر! تم سے بے غیرتوں کو زہر سے بھی موت نہیں آتی اور حیادار بے موت مر جاتے ہیں۔ تمہاری جذباتیت نے تم کو کہیں کا نہ رکھا...... تم نے رہی سہی وقعت بھی خاک میں ملادی! ظفر کیا سوچتا ہوگا"

"انھیں کیا پتہ!" سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"جی ہاں وہ تو دودھ پیتا بچہ ہے! نہ وہ آپ کی اندھی سیدھی حرکتوں کو دیکھتا ہے نہ اسے آپ کے اس دیوانے عشق کا علم ہے۔ تم ہی جیسی بیوقوف لڑکیاں تو مردوں کو خراب کردیتی ہیں۔ یونہی ان کے ناز کیا کم تھے، تمہاری اس حماقت نے اور سونے پر سہاگہ کردیا...... اللہ گواہ ہے کہ تم مرجاتیں تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا تمہاری سخت جانی سے ہوا......"

عطیہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ کبتی جاری ہو، بات نہیں سنیتیں کس کمبخت نے مرنے کی کوشش کی تھی"۔

"ماشا اللہ آپ مجھے بھی بنانے لگیں"۔

"تمہاری جان کی قسم...... بلکہ میں تو ڈر گئی تھی کہ مر نہ جاؤں...... میں نے تو یونہی چوہا مارنے والی دو گولیاں کھائی تھیں......"

منّو بے اختیار ہنسی آگئی...... عطیہ اسے قاسم کی بات بتانے لگی منّو نے کہا "اندھی اب بھی تجھے نہیں دکھتا؟ جس کے لئے تو نے طاعون کے چوہے جیسی موت چاہی اس کی آنکھ سے آنسو کی بوند بھی نہ ٹپکی اور قاسم نے حال تباہ کرلیا...... اب بھی نہ سمجھے تو تجھ سے خدا سمجھے......"

باہر سے ظفر کی آواز آئی "میں آسکتا ہوں" دونوں خاموش ہوگئیں۔ ظفر نے آکر ٹمپریچر دیکھا، عطیہ کو بخار ہوگیا تھا، کہنے لگے "ابھی زہر کا اثر پوری طرح زائل نہیں ہوا"

"زہر؟ کیسا زہر؟" منّو نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"اب اس کی وضاحت تو عطیہ ہی کرسکتی ہیں!"

عطیہ نے سوچا کہ کاش میں نے دو کے بجائے چار گولیاں کھالی ہوتیں ظفر نے میز پر انجکشن کا سامان پھیلانا شروع کیا۔

"سوئی لگائیے گا؟" عطیہ کو انجکشن سے بہت ڈر لگتا تھا۔

"جی ہاں" محویت سے کام میں مصروف تھے۔

منّو نے عطیہ کی طرف دیکھ کے ناک چڑھائی اور کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔

"تکلیف تو نہیں ہوگی؟" بات بڑھانی چاہی۔

"بس خفیف سی" انجکشن لے کے بڑھے "بازو پر سے قمیص ہٹائیے" عطیہ نے انجکشن لیتے ہی بہت منہ بگاڑا اور اس سے بھی زیادہ بُرا منہ منّو نے دور کھڑے بنایا، ظفر صاحب کو اپنے سوا کسی کا ہوش نہ تھا۔

"اچھا دیکھئے گھر سے دوا بھیجتا ہوں، ایک خوراک فوراً پی لیجئے گا۔ کھانا بالکل نہ کھائیے! اور بات کم کیجئے...... آداب عرض......"

منّو نے کہا "اُوہ...... جی چاہتا تھا...... جی چاہتا تھا......"

مری ہوئی آواز میں پوچھا "کیا؟"

"معاف کرنا...... یہی جی چاہتا تھا کہ جوتی کھینچ ماروں......"

ظفر صاحب کو صبح شام حاضری دینا پڑی...... طبیعت سنبھلے اور بگڑ جائے۔ کمزوری کا یہ عالم کہ پلنگ سے اٹھنا دوبھر، ظفر کی رائے سے دوسرے ڈاکٹر کو بھی دکھایا گیا مگر کسی اور کی دوا تو اس کے حق میں زہرِ قاتل ہوجاتی تھی...... اللہ کی مرضی!

ایک دن پوچھا "آپ فیس نہیں لیتے؟"

"باہر لیتا ہوں...... آپ سے نہیں لوں گا"

"واہ فیس تو ہر ایک سے لینی چاہیے"۔

"آپ کو فیس ہی دینا ہے تو مجھ پر کیا موقوف...... کسی اچھے ڈاکٹر کو بلائیے"۔

بات کہہ کے کیف پا کے چھوڑنا پڑا۔

مہینوں گزر گئے، عطیہ نے اب بیمار رہنا چھوڑ دیا تھا، شاید اسلئے کہ ظفر بلا ضرورت ہی آنے لگے تھے بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں، اکثر پان بھی کھا لیا کرتے......

ایک دن خالہ جان آئیں تو انھوں نے بتایا کہ ظفر کا تبادلہ ہوگیا، اگلے مہینے تک لکھنؤ سے چلا جائے گا، خود ہی تبادلہ کی کوشش کی تھی۔ اور اب کہتا ہے کہ یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا"۔

اسی رات عطیہ کو بخار آگیا، بلا کسی کوشش کے، حالانکہ منّو نے اس اتفاق کو تسلیم نہیں کیا! صبح کو ظفر آئے۔

"آپ نے سنا میرے تبادلے کی بابت؟" ظفر نے پہلی مرتبہ عطیہ کو گہری نگاہوں سے دیکھا "کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں سن لیا" پھیکی مسکراہٹ "اللہ مبارک کرے"۔

"آپ سے کچھ مشورہ کرنا تھا"۔

"فرمائیے......"

"قصہ یہ ہے کہ ادھر آپ کی صحت خراب رہے گی اُدھر میں ...... میرا دل گھبرائے گا ...... سو میں سوچ رہا ہوں کہ خالہ جان سے عرض کروں ...... تمہاری کیا مرضی ہے؟"

یہ بھی کوئی تک ہے پوچھنے کا! عطیہ ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی

"کہہ دوں خالہ سے کہ تم راضی ہو؟"

"واہ" اس نے کتاب پٹخ دی اور ظفر کو گھورنے لگی۔

ظفر ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکے "اچھا بھئی مجھے نہیں تو زکیہ کو ہی صاف صاف بتا دینا۔"

اور عطیہ نے دفعتاً طے کر لیا کہ وہ منع کردے گی! ظفر شادی کرنا چاہتے ہیں یا کچھ احسان! ...... یہ اظہار محبت کا نرالا انداز تھا۔ ایسا تو نہ کسی فلم میں دیکھا نہ کسی ناول میں پڑھا! دنیا جہان سے نرالی بات۔ مگر اسی دن رات کو جب آپا جان اسکا منشا پوچھنے بیٹھی گئیں تو اس نے ہاں کیا نہ نا کیا۔ آپا جان نے کچھ بہت اصرار سے پوچھا بھی نہیں، ان کے نزدیک یہ رشتہ مناسب تھا، بات طے ہو گئی، ظفر کے تبادلے سے قبل منگنی اور جب وہ چھٹی لے کے گھر آئیں گے تو شادی!

دوسرے روز وہ منجو کے گھر یہ خوشخبری سنانے کو چلی۔ زینے پر سے اتر رہی تھی کہ قاسم کی مخصوص سیٹی سنائی دی۔ وہ شاید ادھر ہی آرہا تھا۔ آپا جان نے آواز دی، وہ ٹھہر گیا۔ عطیہ وہیں زینے کی آخری سیڑھی پہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اسے قاسم کے سامنے جاتے وقت وحشت سی ہوتی تھی

"علطی کا کیا حال ہے"، قاسم آپا جان سے پوچھ رہا تھا

"اچھی ہے ...... وہ تو تم نے سن ہی لیا ہوگا!"

"کیا؟"

"علطی کی ظفر سے شادی ہو رہی ہے ......" عطیہ کے قدم کانپ گئے

"جی! ؟ ...... ایسے ہی ......"

"تم چاہے جس سے پوچھ لو رات ہی تو رشتہ طے ہوا ہے، ظفر کی بدلی ہو رہی ہے جانے سے پہلے رسم ہو جائے گی۔" پھر آپا جان نے ہمدردی اور حسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا "بھئی مجبوری ہے، علطی کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اگر ظفر چلے گئے تو علاج کا کیا ہوگا، پھر وہ دونوں خوش بھی ہیں! ...... سچ کہنا قاسم تم کو اس خبر سے رنج تو نہیں ہوا؟"

نہیں نہیں تو یہ سمجھئے ...... رنج کا کیا موقعہ ہے مجھے بہت خوشی ہوئی، خدا راس لائے!"

"میرا مطلب تھا کہ تم ظفر کو پسند نہیں کرتے نا! اسے بھی وہ کچھ احمق سا ... تو شاید تم کو افسوس ہو کہ علطی نے اس بے وقوف سے ......"

"ظفر محض ایک بیوقوف انسان ہی تو ہے، وہ گدھا بھی ہوتا تو جہاں علطی کی صحت اور خوشی کا سوال ہے وہی ہماری خوشی ہے ...... دیکھا جائے تو ظفر بڑا شریف لڑکا ہے ...... اسکا دل بہت وسیع ہے وہ ......"

علطی اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گئی اور قاسم اس سے ملے بغیر ہی لوٹ گیا۔ ذرا سی دیر بعد چچی جان آگئیں پوچھنے لگیں "قاسم یہاں نہیں ہے؟ میں سمجھی کہ مجھ سے پہلے پہنچ گیا ہوگا!" اماں بی بیٹھی تھیں بولیں "آیا تو تھا، زکیہ سے کچھ باتیں کر کے جانے کدھر چلا گیا ......"

پھر اماں نے چچی جان کو عطیہ اور ظفر کی بات بتایا، چچی نے کہا "بہن جسطرح ظفر تمہاری بہن کا بیٹا ہے اسی طرح قاسم بھی تمہارے مرحوم دیور کی نشانی ہے۔ اس کے باپ زندہ ہوتے تو کچھ کہتے سنتے میں تو آج تک تمہارے ہی آسرے پہ پڑی ہوں ...... بھائی نے بھی وعدہ کیا تھا کہ ......"

"ہم کوئی وعدہ سے پھرے تھوڑی ہیں ...... دونوں بچیوں میں سے ایک تمہاری ہے ...... قاسم جیسا بچہ ہمیں کہاں ملیگا!"

"بہن تم نے میرا دل رکھ لیا" چچی بیچاری رونے لگیں "خدا تمہیں اسکا اجر دے!"

ابا جان بلائے گئے بہت دیر تک گفتگو رہی آخر میں چچی جان زکیہ کے لئے قطعی طے کر کے اٹھیں۔ کئی دن گزر گئے نہ ظفر آئے نہ قاسم کی صورت نظر آئی عطیہ حیران تھی، خیر ظفر تو ہمیشہ سے اللہ کا نور ہیں، مگر قاسم کو کیا ہوا۔ منجو آئی کچھ پریشان سی تھی خاموش بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے منجو؟"

"ہے کیا تمہارا سر! ...... تو غریب قاسم کی زندگی برباد کر دی! بس جی خوش ہو گیا؟ نہ جانے بیچارے سے کس بات کی عداوت تھی!"

"کیا ہوا قاسم کو؟" وہ گھبرا اٹھی۔

"اب تک نہیں ہوا تو اب ہو جائے گا ...... ہائے ہائے بدنصیب!"

"خدا کے لئے کچھ بتاؤ بھی، میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں"

"جی ہاں آپ تو بڑی خیر خواہ ہیں ...... میں وہیں سے آرہی ہوں، تمہاری چچی نے بلایا تھا۔ بیچاری آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں ...... مجھ سے کہنے لگیں کہ منجو تمہیں کچھ معلوم ہوگا کہ قاسم زکیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا یا عطیہ سے؟ میں تو یہ سمجھی تھی کہ زکیہ کو پسند کرتا ہے میں نے بات پکی کرلی۔ قاسم کو آکر بتایا تو اس نے جان کا خون کر رکھا ہے نہ منہ سے بولے نہ ہنسے کھیلے جب سے فاقہ ہے ایک نوالہ اڑ کے منہ میں نہیں گیا سرد بن کے پڑا ہے، آنکھ کا آنسو نہیں تھمتا ...... کہتا ہے کہیں تو کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا مجھے مجبور کیا تو اپنی جان دیدوں گا ...... اب بتاؤ میں بھابی اور بھائی کو کیسے صورت دکھاؤں گی، ان کی بیٹی مانگ چکی ہوں"

عطیہ دھک سے رہ گئی "منجو یہ تو بہت برا ہوا ...... یا تو اگر

جان مفت میں گئی یا سارے گھر میں گل کھلا......؟

"عطیہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تمہارے اختیار سے بات نکل چکی ہے کوئی راستہ نہیں ہے کہ قاسم کو سمجھایا جائے ...... اور وہ سوقت دنیا میں کسی کی بات سانتا ہو کرے گا تو تمہاری ......"

"تو میں اس کے پاس جاؤں ......؟ ...."

"ہاں اگر تم چاہتی ہو کہ یہ گتھی سلجھ جائے ......"

اور جب وہ بلا وجہ پھپھی جان کو یاد کر کے ان سے ملنے چلی تو اسکا دل بیٹھا جاتا تھا ۔ ہیں قاسم سے کیا کہوں گی جا کے ...... وہ میری بات ملنے گا بھی! میں نے تو آج تک اس کی کوئی بات نہیں سنی! اور پھپھی جان سوچیں گی کہ یہ قاسم کے پاس کیوں آئی ہے، اگر اسے قاسم سے محبت ہے تو یہ ظفر سے شادی کیوں کر رہی ہے۔"

ہر چند کہ قاسم نے اس کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا، وہ کامیاب لوٹی واسے پہلے سے کہیں زیادہ اختلاج ہو رہا تھا اور کچھ ایسا احساس ہو رہا جیسے اس کے ہاتھ سے کوئی خون ناحق ہو گیا ہے قاسم کی غمگین شکل اس کی آنکھوں میں بس چکی تھی، قاسم کی متورم آنکھیں خشک ہونٹ اور بکھرے ہوئے بال اس کے حواسوں پہ چھائے ہوئے تھے وہ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جان سے دور دق کا مریض ہو!!

مقررہ تاریخیں قریب آگئیں۔ قاسم کسی دوست کی دعوت پر کانپور چلا گیا تھا اور ظفر اس عرصے میں دو ایک بار آئے بھی تو عطیہ نے حجاب کی وجہ سے محض جھلک دکھانے پر اکتفا کیا ...... پاس آکر نہیں بیٹھی ....

ایک دن پہلے قاسم آگیا، بہت دبلا ہو گیا تھا پتہ چلا ملیریا سے بخار آنے لگا تھا، آتے ہی اماں کے پاس گیا "تائی اب مجھے کچھ کام بتائیے میں آگیا ہوں۔"

میاں مجھے تمہارا ہی انتظار تھا، اب جو چاہے کرو۔"

"قاسم نے دعوت نامے لکھے دعوت کا مینو بنایا، سارے دن اور ساری رات اسے سانس لینے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ لاؤ، وہ کرواؤ، بلاؤ، اسے منگاؤ، عطیہ مسلسل اسے پشیمان نگاہوں سے تکتی رہی۔

ساڑھے چار بجے شام کا وقت تعین کیا گیا تھا، مہمان آنے شروع ہو گئے، قاسم ادھر سے ادھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ خالہ جان بھی آگئیں۔ دولہا وغیرہ ابھی تک نہیں آئے بس اب آنے ہی والے ہیں، وہ قیمتی کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ایک کرسی پر بیٹھی تھی، جب قاسم اس کے قریب سے گزرتا تو وہ لرز کر آنکھیں جھکا لیتی تھی، ......

پانچ بج گئے اب تک دولہا کا پتہ نہیں۔ سارے مہمان منتظر ہیں خالہ جان گھبرا گھبرا کے دروازہ کی طرف دیکھتی ہیں۔ اسے ناقابل بیان کوفت ہو رہی ہے۔ ...... کیا مطلب ہے ظفر کا ......

ساڑھے پانچ بج گئے اب پونے چھ ہو رہے ہیں! مہمان اکتا چلے ہیں اور میزبانوں کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں ...... اس کا سر چکرانے لگا۔ دل چاہتا ہے کہ دیوار سے سر پھوڑ لے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے ظفر کا منشا کیا ہے ...... کیا حادثہ پیش آگیا۔

قاسم کبھی اس کی صورت دیکھتا ہے اور کبھی ہر موٹر کے ہارن پر دروازے کا رخ کرتا ہے۔ آخر میں خالہ نے اس سے کہا" میاں جاکے دیکھو تو کیا قصہ ہے" اور وہ فوراً چلا گیا۔

قاسم کو گئے بھی دیر ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ بن کے گزر رہا ہے اسے غصہ آ رہا ہے اپنے اوپر ...... اور ظفر کے اوپر ...... اسے نفرت ہو رہی ہے اپنی ذات سے اور ظفر کی ذات سے ...... مہمانوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں سب رہ رہ کر اسے رحم کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ نظریں سوئیاں بن کے اس کے رگ و پے میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ گھبرا کر ڈرائنگ روم سے اٹھ گئی اور دوسرے کمرے میں کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ظفر نے خود ہی شادی کی خواہش کی تھی اسے کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ پھر وہ کس بات کا انتقام لے رہا ہے۔ پھر اس بیغیرتی کا کیا باعث ہے، کتنا عجیب انسان ہے اور کیا اسے انسان کہا بھی جا سکتا ہے ...... اگر اسوقت ظفر کے بجائے اور کوئی ہوتا ...... اگر قاسم....

قاسم لوٹ آیا تھا! بہت سے سوالات شروع ہو گئے، قاسم نے کہا" ابھی آتے ہیں، کسی مریض کو دیکھنے چلے گئے ہیں ... بس آتے ہی ہونگے ...... میں نے ٹیلیفون پر تاکید کی ہے" قاسم اسے ڈھونڈتا ہوا آگیا ...... وہ دور کہیں خلا میں گھور رہی تھی۔

"عطیہ"

اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپک کے قیمتی ساری میں جذب ہو گئے۔

"ارے یہ کیا؟ ...... رو رہی ہو ...... گھبرا گئیں؟ ......

خدا کے لئے بدشگونی نہ کرو، تمہاری قسم وہ اب آنے ہی والے ہیں ... کسی مریض سے وعدہ کر چکے تھے، اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، بس اب لمحوں میں آئے ......"

مگر وہ برابر روتی رہی ...... یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں قاسم نے بڑھ کے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا" میں تمہارے پیر پکڑتا ہوں.... عطیہ خدا کے لئے اب نہ رو ورنہ ......"

"تمہیں اللہ کا واسطہ میرے اوپر رحم کرو مجھے نہ جانے کیا ہوا جا رہا ہے ...... اُف ......"

عطیہ نے سر اٹھا کے قاسم کی طرف دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر نظر پڑی جس میں قاسم نے ایک بھدی سی انگوٹھی پہن رکھی تھی، عطیہ"

باقی صفحہ ۔۔ پر

سڑک بن رہی تھی

افسانہ

سہیل عظیم آبادی

سڑک بن رہی تھی۔

پورب سے پچھم دوڑتی ہوئی اٹھارہ میل لمبی سڑک پانچ مہینہ پہلے سیلاب میں ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ایک بڑا پل اور پانچ چھوٹے پلوں کو سیلاب کا پانی بہاکر ایک فرلانگ لیگیا تھا۔ اور سڑک بالکل بیکار ہوگئی تھی۔ سارا کاروبار بند تھا۔ اس سڑک کے ذریعہ ہزاروں من غلہ ہر سال بیل گاڑیوں اور موٹر ٹرک پر لدکر شہر جایا کرتا تھا لیکن سڑک ٹوٹ جانے کی وجہ سے سارا کام رُکا ہوا تھا۔ ادھر چند دنوں سے صرف بیل گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔ جگہ جگہ سڑک سے نیچے زمین برابر کرکے گاڑیوں کے لئے راستہ نکال دیا گیا تھا۔ اور انہیں راستوں سے موٹر گاڑیاں گزرتی تھیں۔ سڑک کا ٹھیکہ ایک بڑے ٹھیکہ دار کو ملا تھا اور سینکڑوں مزدور کام کررہے تھے۔ کاموں کی دیکھ بھال کے لئے میٹ، منشی، اور اوورسیر بابو مقرر تھے۔ ٹھیکہ دار خود بھی کبھی کبھی اپنی بڑی سی لال رنگ کی گاڑی پر آیا کرتا تھا۔ اور جتنا کام ہوچکا ہوتا اسے دیکھنے کے بعد ضروری باتیں سب کو سمجھا کر چلا جایا کرتا تھا۔ کام صبح سویرے ہی سے شروع ہوتا اور سورج ڈوبنے کے قریب آکر تو ختم ہوتا۔ سینکڑوں مزدور —— مرد اور عورتیں، کام کرتے تھے۔

سڑک کے دونوں طرف مزدوروں کی بستی سی آباد ہوگئی تھی اور جیسے جیسے کام آگے بڑھتا جاتا۔ یہ بستی بھی ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ چلی جاتی۔ یہ بستی کیا ہوتی۔ درختوں کی ڈالیوں سے گھری ہوئی جھونپڑیوں کا بے ترتیب سلسلہ جن میں دن بھر تو اداسی چھائی رہتی۔ اور شام ہوتے ہی نئی رونق پیدا ہوجاتی۔ زندگی کی لہر دوڑنے لگتی۔

رامو اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا —— آج اس نے اپنا حساب صاف کرالیا تھا۔ اور دس دن کے لئے گھر جانے والا تھا۔ چار مہینے سے کام کررہا تھا اور چار آدمی مل کر —— وہ، اس کی عورت منگنی، اس کا بیٹا راجو اور اس کی بیٹی رجنی۔ چاروں مل کر ہر روز پانچ روپے کما لیتے تھے۔ رامو خود دوسرے مزدوروں کے ساتھ مل کر "ہیّا۔ ہیّا" کہہ کر دن بھر رولر کھینچتا تھا۔ منگنی اور رجنی سڑک پر مٹی یا گنگٹ پھینکتی تھی۔ اور راجو دھرمٹ سے سڑک کوٹتا، یا پھر مٹی کاٹتا تھا، اور ہر روز ان چاروں آدمیوں کا خرچ ڈیڑھ روپے تھا۔ بقیہ ساڑھے تین روپے کی نقد بچت تھی اور وہ بہت خوش تھا۔

رامو ابھی اور بھی کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دس دن پہلے یکایک رجنی کا سسر آگیا اور اس نے گونا کے لئے ضد کی اور تاریخ مقرر کرکے چلا گیا رامو کو رنج تو ضرور ہوا لیکن وہ بھی چپ ہوگیا، رجنی کا بیاہ ہوچکا تھا۔ اب وہ پرائے گھر کی بن چکی تھی۔ رامو کا زور بھی کیا تھا۔ مجبور ہوکر اس نے بات مان لی اور بڑی بہن سے پتر دکھانے کے بعد لگن بننے پر تاریخ مقرر کردی گئی تھی اور اب رجنی کی رخصتی میں صرف پانچ دن باقی تھے۔ وہ بیٹھا بیٹھا سوچ رہا تھا

شہر کو جانے والی کسی بیل گاڑی پر بیٹھ کر وہ شہر چلا جائے گا۔ دن بھر ضروری چیزیں خریدے گا اور دوسرے دن شام تک واپس آجائے گا۔ چار پانچ گھنٹے جھونپڑی میں آرام کریگا۔ اور صبح ہونے سے پہلے ساری چیزیں لے کر گھر چلا جائے گا۔ پھر وہاں انتظام کرے گا۔ لیکن اسے فکر تھی، گھبراتے گا یا نہیں۔ اور کس دام پر؟ - ہر چیز تو جور و زاری میں ملتی ہے۔ اصل دام پر کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ پھر وہ سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کیا چیزیں خریدنی تھیں۔ اگر چیزوں کے دام بڑھ گئے تو اس کی مزدوری بھی تو بڑھ گئی تھی۔ اور اس نے اُسے زیادہ داموں پہ کوئی چیز خریدنا جبر نہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بیٹی کو رخصت کردے۔ جوان بیٹی پرائی عزت ہوتی ہے جتنی جلدی اپنے گھر پہنچ جائے اچھا ہے۔

سورج ڈوب چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ اس کی عورت جھونپڑے کے اندر ٹانگ پسارے پڑی تھی جیسے اسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔ رجنی ایک درخت کے نیچے زمین میں کھدے ہوئے چولھے پر بھات پکا رہی تھی۔ چولھے کے شعلے سے جو روشنی پھیل رہی تھی اس میں رجنی کا چہرہ بڑا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ رامو نے سوچا —— بیچاری پانچ دن بعد چلی جائے گی۔ اس کے دل کو چوٹ لگی۔ مگر اس نے پھر سوچا —— اچھا ہے چلی جائے اور ابھی دن پہلے دامو کی بیٹی رات کے وقت ایک منشی کے پاس پکڑی گئی تھی۔ اور اب تک سارے مرد اور عورتیں اس کا قصہ دہرا رہے تھے۔ لیکن اس کی رجنی کتنی اچھی لڑکی تھی کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرے۔ اور اس کا سر گھمنڈ سے آپ ہی آپ اونچا ہوگیا۔ اور چھاتی جیسے بڑھ گئی۔ اُسے یاد آیا کہ آٹھ مہینہ پہلے جب گانو میں گماشتہ کے بیٹے نے اس سے مذاق کیا تھا۔ تو کس بری طرح اس نے ڈانٹا تھا اور اُسے کتنا ذلیل کیا تھا۔ رامو کو گماشتہ کے بیٹے پر غصہ آگیا۔ لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا۔ اور جب اس نے رجنی سے مذاق کیا تھا اور رجنی نے اسے ڈانٹ بتائی تھی تو بھی وہ دوسرے ہی دن بھاگ گیا تھا۔ ورنہ رامو اور اس کا بیٹا راجو تو سوچ چکے تھے کہ جو بھی ہو گماشتہ کے بیٹے کو اتنا ماریں گے کہ ہاتھ پاؤں سے بیکار ہوجائے گا۔ اور پھر یہاں بھی کام کرتے کرتے جب ایک میٹ نے اس سے مذاق کیا تھا۔ تو رجنی نے سب کے سامنے کہہ کر میٹ کو ذلیل کردیا تھا۔ اور سینکڑوں آدمیوں کے سامنے اُسے ایسی سوٹی موٹی گالیاں دی تھیں کہ وہ بھی کچھ دن یاد کرے گا۔

رامو بہت خوش تھا۔ اس کے پاس ٹھگ بھگ پانسو روپے جمع تھے۔ گھر پر جو غلہ پیدا ہوا تھا وہ الگ موجود تھا۔ وہ پنچ برادری کے پچاس آدمیوں کو اچھا سا کھانا کھلا کر بیٹی کو رخصت کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہر چیز مہنگی تھی۔ چاول روپیہ کا دو سیر ملتا تھا لیکن

ٹھیکیدار بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ اپنے مزدوروں کو ایک روپے میں تین سیر چاول دیا کرتا تھا۔ اس لئے سارے مزدور خوش تھے اور سب کے پاس کچھ نہ کچھ رقم جمع ہو گئی تھی۔

اس کی نظر پھر رجنی پر پڑ گئی۔ شعلے کی روشنی میں اس کا چہرہ لال لال نظر آرہا تھا۔ وہ سوتی سی پھٹے لال رنگ کی ساری پہنے تھی۔ اور کھانا پکا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر یہی لڑکی کسی مالدار گھر میں پیدا ہوتی تو رانی کی طرح رہتی۔ لیکن اس کے ہاں پیدا ہوئی ——— نہ اچھا کھانا پہننا اور نہ آرام۔ دن دن بھر دھوپ میں جل کر کام کرنا۔ اس کا پہلا سا رنگ بھی نہ رہا تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ یہ کرنا ہی تھا ——— اُسے رجنی کی قسمت پہ بڑا رنج ہوا۔

ہر طرف چولہے میں آگ نظر آرہی تھی۔ سب کا کھانا پک رہا تھا۔ ساری بستی میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ کہیں کوئی بچہ چیخ رہا ہے تو کہیں کوئی عورت گا رہی ہے۔ کہیں کوئی دوسرا مرد برہا الاپ رہا ہے۔ کہیں کوئی ماں اپنے بچے پر سخ ہو رہی ہے۔ کہیں دو چار بیٹھ کر اپنا اپنا دکھڑا ایک دوسرے کو سناتے اور ایک دوسرے کی ہمدردی کرتے جاتے تھے۔

وہ سوچنے لگا ——— ابھی تک بیل گاڑیاں چل نہیں رہی ہیں اور راجو کدھر چلا گیا۔ اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں لیکن وہ تو سالا کھلنڈرا ہے۔ کام جیسے تیسے ختم کیا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپ کرتا ہے۔ یا گیت گاتا ہے۔ اسے گھر کے اور کاموں کی فکر کیا۔

راموکو خیال ہوا کہ اگر اس کو بھی اس سال لگن بن جاتا تو وہ اپنی بہو کو لے آتا۔ بیٹی چلی جاتی تو بہو آجاتی۔ اور رجنی کے چلے جانے سے مزدوری میں جو کمی آجاتی وہ پوری ہو جاتی۔ لیکن برہمنوں نے دیکھ کر اسے بتایا کہ لگن بنتا ہی نہیں ہے ——— سچی بات تو یہ تھی کہ وہ بہو لانے کے لئے جتنا فکر مند تھا، رجنی کو رخصت کرنے کے لئے اتنا فکر مند نہ تھا۔ لیکن دو دن پہلے راجو کی بھیٹی کی بات جو اُڑی تو پھر وہ بھی رجنی کو رخصت کر دینے کے لئے خوشی سے تیار ہو گیا تھا ——— پھر بھی اسے اپنی بیٹی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ جب دوسری مزدور لڑکیاں کبھی کسی سیٹھ یا منشی سے ہنس کر باتیں کرتیں تو ان کی مائیں انہیں غیرت دلاتیں اور رجنی کی مثال دیتی تھیں۔ آخر وہ بھی تو جوان ہے۔ لیکن کسی سے کچھ نہیں بولتی۔ بس آنکھ جھکائے اپنا کام کئے جاتی ہے۔ اگر کوئی سیٹھ چھیڑ کرتا ہے تو منہ بنا کر ایسا جواب دیتی ہے کہ پھر سیٹھ کی نانی مرے جو اس سے بات بھی کرے۔

راموکو محسوس ہوا کہ مزدوروں کی پوری ٹولی میں سب سے زیادہ باعزت وہی رہی ہے۔ ورنہ دوسرے سب کے سب بے عزت اور بے غیرت ہیں۔ سب کی بیٹیوں کو سیٹھ اور منشی چھیڑتے رہتے ہیں اور یہ لوگ کچھ نہیں بولتے۔ اور بعض تو بیٹیوں کی کمائی کھاتے ہیں۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ جب کہیں کام شروع ہوتا ہے تو وہاں کیا کیا ہوتا ہے۔ وہ

ہوش سنبھالتے ہی یہ کام کرتا آیا تھا۔ وہ خود کتنی مزدور عورتوں سے ہنسی مذاق کر چکا تھا۔ اور کتنی مزدور عورتوں نے کچھ دنوں کے ہنسی مذاق کے بعد خود کو اس کے حوالے کر دیا تھا ——— پہلے تو وہ خود ایسے معاملوں میں بڑی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اور اسی وجہ سے بیس برس پہلے کام کرتے کرتے وہ ایک منشی کا گہرا دوست بن گیا تھا۔ لیکن اب اُسے یہ سمجھ آگئی تھی کہ منشی اُسے اُلو بنا کر اپنا مطلب پورا کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی بیٹی ——— وہ کیچڑ میں کنول تھی

رامو یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"ارے بیٹی! پک گیا بھات؟"

رجنی مڑی اور بولی ———

"ابھی کچھ دیر ہے بابا! آلو بھی تو نہیں سیجھا، بھرتہ بغیر بھات کا ہے میں کھاؤ گے؟"

"اچھا اتنی جلدی نہیں۔ ابھی تو کوئی گاڑی بھی چلتی نہیں دکھائی دیتی۔ مگر یہ راجو کہاں چلا گیا۔ یہ لونڈا سدا کا بے فکرا ہے۔ کبھی کسی بات کی فکر کرتا ہی نہیں۔ اسے اتنا بھی خیال نہیں کہ بہن کا گونا ہونے کو ہے۔ اور اسے میرے ساتھ شہر جانا ہے۔ پاس بیٹھتا تو کوئی صلاح دیتا۔ مگر اسے تو اپنے گھومنے سے کام ہے۔ بے فکرا کہیں کا ———"

راموکو راجو پر غصہ تو ضرور آیا۔ لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ راجو سامنے تھا کب۔ اگر سامنے ہوتا تو دو چار باتیں ضرور سن جاتا۔ لیکن وہ غائب تھا۔ اور رامو کے سامنے سے غائب بھی اسی لئے رہتا تھا کہ بات نہ سننی پڑے۔

اس سے تو بہت اچھی رجنی تھی۔ جو دن بھر تو کام کرتی تھی۔ اور گھر کھانا بھی پکاتی دوسرے کام کرتی اور کبھی کبھی ماں کے بدن میں تیل بھی مالش کر دیا کرتی۔ اس نے سوچا سچ مچ بیٹی کو ماں باپ سے محبت زیادہ ہوتی ہے اور بیٹا تو اسی وقت تک ساتھ رہتا ہے۔ جب تک اس کی جورو نہیں آجاتی۔ ادھر گھر میں جورو آئی اور بیٹے کا رنگ بدلا۔ اسے یہ سوچ کر بڑا رنج ہوا کہ اب رجنی چلی جائے گی۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ جوان ہو کر ساری بیٹیاں ماں باپ کو چھوڑ کر اپنے مرد کے یہاں چلی جاتی ہیں۔ یہی دنیا کی ریت ہے

دور بیل گاڑیوں کی قطار کی روشنی نظر آنے لگی اور وہ جیسے چونک پڑا۔ جو گاڑی سب سے پہلے مل جائے اس پہ بیٹھ جانا چاہیئے اور سویرے ہی شہر سے کام کر کے ضروری چیزیں خرید کر واپس آجانا چاہیئے۔ یکایک اس نے رجنی کو پکارا:۔

"بیٹی ہو گیا کھانا؟"

"ہاں بابا۔"

"ارے راجو کہاں ہے؟"

"راجو جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا۔ راموں نے پوچھا" کہاں تھا؟"

"بس یہیں تو، سر میں ذرا درد تھا۔ پڑا ہوا تھا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ مگر اسے منگتی پر غصہ آیا۔ اس نے اس لونڈے کو بگاڑ رکھا ہے جب اس سے کچھ کہتا ہے تو بیچ میں آ کر اس سے لڑنے لگتی ہے۔ لیکن راجو کے جواب پر وہ چپ ہو گیا۔ اور رجنی سے کھانا مانگا۔ رجنی دونوں کے لئے کھانا لے آئی۔ اور وہ دونوں بیٹھ کر کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے رامو بولا۔

"ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر میں کسی بیل گاڑی پر شہر جائیں گے۔ کل دن بھر بازار کریں گے اور شام کو وہاں سے چلیں گے۔ پھر دن کو یہاں سے گھر چلے جائیں گے۔ دوپہر دن پہلے گھر بھی تو پہنچنا ہی چاہیئے۔ وہاں بھی تو کام کرنا ہی ہوگا"

راجو چپ چاپ سنتا رہا۔ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اتنے میں رجنی پاس آئی چولہے میں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں رامو نے دیکھا۔ رجنی کی آنکھیں پھولی پھولی تھیں۔ اور سارا چہرہ آنسو سے میلا ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا بیٹی کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔ روئے کیسے نہیں جس گھر میں پیدا ہوئی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اس سے چھوٹ رہی ہے۔ ماں باپ، بھائی بھاوج سب سے چھوٹ رہی ہے۔ رامو کے دل کو بڑی چوٹ لگی۔ لیکن کیا کرتا۔ جب سے دنیا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ جو بھی ہو وہ رجنی کے لئے خوب اچھے کپڑے خریدے گا۔ زیادہ دام لگے تو لگ جائے۔ بیچاری روز روز کپڑے پہنے تھوڑے آئے گی۔

منگتی بھی جھونپڑی سے نکل کر آ گئی۔ اور اس کے پاس کچھ دیر تو چپ بیٹھی رہی پھر بولی۔

"سنتے ہو؟ جو جو چیز ہم نے بتایا ہے سب لیتے آنا۔ بھول مت جانا۔ اور ہاں دیکھو! رجنی کے لئے ساڑی بہت اچھی لانا۔ موٹا پہنتے پہنتے تو اس کی زندگی کٹ گئی۔ کنجوسی نہ کرنا!"

رامو کی طبیعت چڑ ہی تو گئی۔ جیسے اسی کو رجنی سے محبت ہے۔ اسے تو محبت ہی نہیں — اور بولا۔

"ہاں ہاں، سن لیا — سن لیا"

"بس میری بولی تو مرچ ہے۔ ہم بولے اور تم چڑھے!"

رامو بولا۔

"اچھا جاتے کے وقت دانتا کل کل مت کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو کیا چاہیئے؟"

"ہم کو کیا چاہیئے —— ؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی جس میں شکایتوں کی جیسے لمبی داستان چھپی ہوئی تھی۔ رامو نے اس کی طرف دیکھا اور اسی طرح لمبی سانس لی۔ اور دونوں چپ ہو گئے۔

دونوں باپ بیٹا کھانا کھا چکے تو رامو نے منگتی سے کہا۔

"دولا تو، روپیہ نکال کر دے اب گاڑی بھی نزدیک آتی جا رہی ہے"

منگتی جلدی سے جھونپڑی میں گئی اور ٹین کا ایک بکس لے آئی بکس کو کھول کر اس نے کپڑے کی ایک گٹھری نکالی اور اس میں سے روپیہ نکال کر دیا۔ رامو نے روپیہ گنا اور اپنی دھوتی کے ایک کونے میں باندھ کر کمر سے باندھ لیا۔ اور دونوں باپ بیٹا شہر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں بیل گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ اور ایک گاڑی والے سے معاملہ طے کر کے دونوں باپ بیٹا گاڑی میں بیٹھ رہے۔ منگتی سے طے تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر وہ اور رجنی اپنے گاؤں چلی جائے۔

جب شہر پہنچا تو صبح ہو رہی تھی۔ سارے لوگ نیند میں تھے۔ بس دو چار آدمی آتے جاتے دکھائی دیئے۔ وہ بھی چپ چاپ گاڑی پر پڑا رہا۔ اور جیسے ہی دکانیں کھلنے لگیں، تو دونوں باپ بیٹا بازار نکل پڑے۔ رامو کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رجنی کے لئے اچھے سے اچھے کپڑے خریدے اور وہ ایک دکان سے دوسری دکان پر پھیرا پھرتا تھا۔ لیکن کوئی دکاندار کارڈ کے بغیر کپڑا دینے پر راضی نہ ہوتا تھا اور جب کوئی تیار بھی ہوتا تو دام اتنا زیادہ مانگتا کہ رامو کا سر گھوم جاتا۔ اور وہ دل ہی دل میں دکاندار کو گالیاں دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔

دوپہر ڈھل گئی اور رامو کپڑا نہیں خرید سکا۔ اور ابھی بہت سی دوسری چیزیں خریدنی باقی ہی تھیں۔ اسے بازار کی اس حالت پر بڑا غصہ آیا۔ آخر پہلے بھی تو یہی دکاندار تھے۔ تھوڑے سے پیسے لے کر آتا تھا۔ اور مطلب کی ساری چیزیں خرید کر لے جاتا تھا۔ اور اب وہی شہر ہے وہی بازار ہے وہی دکاندار ہیں۔ روپے بھی زیادہ خرچ کرنے پر آمادہ ہے لیکن ایک تو چیز ہی نہیں ملتی۔ اور اگر کوئی چیز پسند آتی ہے تو پھر دام اتنا زیادہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ کچھ مایوس ہو چلا کہ شاید اسے رجنی کے لئے کوئی اچھا کپڑا مل ہی نہیں سکے گا لیکن وہ ہمت نہ ہارا۔ آخر ایک دکان میں اسے پسند کے کپڑے مل گئے۔ دام تو زیادہ دینے پڑے مگر چیز تو مل گئی اور اسی سے بہت خوش گیا۔

وہاں سے وہ دوسری دکانوں پر گیا اور ضرورت کی دوسری چیزیں خریدتا رہا۔ اب وہ بہت خوش تھا۔ چیزیں اسے پسند کے مطابق مل گئی تھیں وقت بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اب ساری چیزیں باندھ کر گاڑیوں کے اڈے پر پہنچے۔ اور کسی واپس جانے والی گاڑی سے معاملہ طے کرے۔

تھوڑی دور آگے بڑھا۔ تو اسے راستے میں بھٹی ملی۔ بہت دنوں سے اس نے پی نہیں تھی۔ راجو سے اس نے کہا۔

"چل بیٹا تو آگے بڑھ کہیں دکان پر بیٹھ کر کچھ کھا لے۔ ہم دو گھونٹ پی کر آتے ہیں"

راجو سامان لے کر آگے بڑھ گیا اور کچھ کھا پی کر گاڑیوں کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن رامو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جب دیر ہونے لگی تو وہ گھبرا سا گیا۔ اور اس کا دل چاہا کہ ڈھونڈنے جائے لیکن اب اتنا سامان وہ کہاں کہاں لئے پھرتا

مجبوراً چپ چاپ وہیں بیٹھا رہا۔ اور جب سورج ڈوبنے کے قریب آیا۔ تو رامو اسے مجبوستا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اور نہ لتا بھی کیا۔ وہ جانتا تھا کہ رامو جب پینے بیٹھ جاتا ہے تو اسے کوئی بات یاد نہیں رہتی۔

رامو نے آتے ہی للکار کر پوچھا۔

"ارے بیٹا! کوئی گاڑی ٹھیک ہوئی۔"

راجو نے کہا۔

"ہم نے تو کسی سے کوئی بات نہیں کی، طے کر لو۔"

"آخر ایک گاڑی والے سے بات طے ہو گئی۔ اور سارا سامان اس پر رکھ دیا گیا۔ رامو جب آیا تھا تو گاڑی چاول کے بوروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور سونے میں اسے آرام نہیں ملا تھا۔ اسے خیال ہوا کہ آج رات خالی گاڑی پر چین سے سوتا ہوا جائے گا۔ وہ خود تو گاڑی کے پاس رہ گیا اور راجو کو کچھ کھا لینے کے لئے بازار بھیج دیا۔

ابھی رات تھوڑی سی باقی تھی کہ رامو کی نیند ٹوٹ گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ گاڑی بان بھی سب کے سب سوئے ہوئے تھے سوائے بیل گاڑیوں کی گھڑ گھڑ کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ ابھی تک اسے تھوڑا تھوڑا سرور باقی تھا۔ اس کی طبیعت لہرا اٹھی اور اس کا دل چاہا کہ گانا گائے لیکن اسے یاد آ گیا کہ ابھی گانے کا وقت نہیں۔ ابھی تو بیٹی کو رخصت کرنا ہے لیکن اُسے اپنا گذرا وقت یاد آ گیا۔ کہ کبھی جب وہ گانا گاتا تھا تو گاؤں کے لوگ سننے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن جب اُسے یاد آیا کہ رجنی کا گونا کرنا ہے تو جیسے فکر کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ رجنی کی رخصتی کے لئے جتنا فکرمند وہ اس وقت ہوا تھا۔ کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ بیل گاڑی اور تیز ہو جائے اور وہ جلد سے جلد پہنچ جائے — لیکن ابھی چار پانچ کوس دور تو وہی جگہ تھی جہاں سڑک بن رہی تھی۔ اور رجنی کو چھوڑ کر آیا تھا۔ پھر اس کا گاؤں تو اس جگہ سے بھی چھ کوس دور تھا۔

اس نے سوچا کہ منگتی اور رجنی کو پہلے ہی چلے جانے کے لئے کہہ دیا۔ یہ غلط کیا۔ اتنا سامان وہی دونوں آدمی کس طرح لے جا سکیں گے۔ منگتی اور رجنی بھی وہاں رہتی تو سامان کو مل جل کر سب لوگ لے جاتے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہاں تک تو پہنچ جائے۔ پھر وہاں انتظام ہو ہی جائے گا۔ وہ باتیں سوچتا رہا اور گاڑی بڑھتی چلی گئی۔ لیکن تھا وہ بہت خوش — آخر پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اور جب اس کی نیند ٹوٹی تو سورج بہت اونچا ہو چکا تھا اور وہ باغ صاف نظر آ رہا تھا جہاں سڑک بنانے والے سارے مزدوروں کی بستی آباد تھی۔ پھر اسے فکر ہوئی کہ آخر اتنا سامان کس طرح جائیگا اور راجو سے بھی اس نے سوال کیا۔ لیکن راجو نے بھی کوئی خاص صلاح نہیں دی۔ اور وہ جھلا اٹھا۔ لیکن چپ ہی رہا۔ اس سے کچھ بھی نہ بولا۔

آخر وہ باغ کے قریب پہنچا تو گاڑی سے اُتر پڑا اور تیز تیز چل کر وہاں پہنچا کہ کوئی انتظام کرے۔ اسے لوگوں نے جیسے ہی دیکھا۔ کئی آدمی دوڑ پڑے جیسے سب کے سب اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ یہ سب کے سب اُسے مبارک باد دینے آ رہے تھے کہ وہ رجنی کا گونا کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ اور اسی کا سامان خریدنے شہر چلا گیا تھا۔ وہ اور تیز قدم بڑھانے لگا۔ مزدوروں کے قریب پہنچا۔ ایک ہی وقت کئی ایک نے مل کر کہا۔

"رامو بھائی! رجنی تو منشی کے نوکر کے ساتھ بھاگ گئی۔"

رامو پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے دیکھا جھونپڑی کے باہر منگتی بیٹھی ہوئی بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہی تھی ———

اور سڑک بن رہی تھی

بھول: ——— بقیہ صفحہ ۶۶

بے اختیار دل چاہا کہ وہ قاسم کے ہاتھ سے یہ انگوٹھی اتار کے پھینک دے اور غیر ارادی طور پر اس نے انگوٹھی کو چھو لیا ...... قاسم اُسے ٹکٹکی باندھے حسرت سے تک رہا تھا "بس اب چلو .... ظفر آ رہے ہونگے"

"نہیں نہیں" وہ ایک ساتھ نکھر گئی "میں ظفر سے شادی نہیں کروں گی"

"عطیہ" قاسم نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھ سے بھول ہو گئی تھی قاسم ...... مجھ سے بھول ہو گئی تھی"

"غلطی" ہاتھ کی گرفت بڑھ گئی۔

پھر وہ دونوں ہارن کی آواز سے چونکے، برآمدے کے سامنے موٹر آ کے رکا اور ظفر اترے، وہی کرخت چہرہ اور چشمے کے موٹے موٹے شیشوں سے جھانکتی ہوئی ویران آنکھیں ......

قاسم نے کانپ کر عطیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور یہ کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"اب وقت گزر چکا ہے عطیہ .... اب بھول جاؤ ..... سب کچھ بھول جاؤ"

ضربِ تقسیم

افسانہ

شوکت تھانوی

ہمارا خاندان تو خیر کبھی ترقی یافتہ تھا نہ اب ہے اور نہ آثار ایسے ہیں کہ کبھی ہو سکے گا۔ البتہ سسرال کی طرف سے نہایت بلند اقبال بھی واقع ہوئے ہیں اور ترقی یافتہ بھی۔ سنا ہے کہ بیگم صاحبہ کے دادا جان جنت مکانی اپنے وقت کے نہایت عظیم الشان شاعر واقع ہوئے تھے چرخ تخلص فرماتے تھے اور سنا ہے کہ ان کی شاعری کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی غصہ میں کوئی غزل کہ ڈالی تو مشاعرے میں قیامت برپا کر دیتے تھے اور اپنے سامنے کسی کا چراغ جلنے نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ہر مشاعرہ آپ کے کسی شعر پر اعتراض کیا نتیجہ یہ کہ مشاعرے میں لاٹھی چل گئی پولس کو موقع پر پہونچنا پڑا اور کہئے کہ آجکل کا زمانہ نہیں تھا ورنہ اشک آور گیس بھی یقیناً استعمال کی جاتی۔ سنا ہے کہ تمام قصبہ کے لوگ چونکہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے کہ قصبہ میں کوئی چھوٹا موٹا استاد قائم ہو جائے لہذا سب نے یہ طے کر لیا کہ اپنے بچوں کو شاعر ہونے دیں گے اور اس فیصلہ کے بعد انہی بزرگ محترم کو استادِ وقت سمجھکر تمام قصبہ کے نوجوان زانوئے تلمذ تہ کر کے بیٹھ گئے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا یعنی کچھ ہی دنوں میں وہ نوجوان جنکا دراصل نام بھی عرفیت کی وجہ سے خطرے میں پڑا ہوا تھا ایک ایک تخلص کے مالک بن گئے۔ اور یہ روایت ہے کہ ان بزرگ محترم کے یہاں ایک دربار سا لگنے لگا۔ اسکے علاوہ ان بے شمار شاگردوں کی وجہ سے ضروریات کی تمام چیزیں تقریباً مفت گھر میں آنے لگیں کسی شاگرد کے یہاں سے گڑ چلا آ رہا ہے کسی کے یہاں سے ساگ اور مولیاں۔ کوئی صاحب بکری کے لئے چارہ لئے چلے آ رہے ہیں تو کوئی صاحب پینے کا تمباکو لا کر پیش کر گئے۔ بات یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر شعبہ کے لوگ موجود تھے اور سب ہی کو شاعر بننا تھا لہذا ہر ایک کو کم سے کم یہ بات تو معلوم ہی تھی کہ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنی ہی مٹھاس پیدا ہوگی۔ ان بزرگ محترم کے شاگردوں کی تعداد تو خیر بہت تھی مگر ان میں سے دو بہت مشہور تھے یکہ بانوالے جمن چودھری المتخلص بہ رونق اور دوسرے منشی ٹھاکر المتخلص بہ ٹھاکر ان دونوں کا تذکرہ اس قلمی بیاض میں موجود ہے جو اب تک ان بزرگ محترم کی یادگار کے طور پر ہماری سسرال میں محفوظ ہے۔ اس بیاض میں یوں تو دھوبی کا حساب بھی ہے، کچھ خضاب کے نسخے بھی ہیں اور ایک آدھ جگہ کچھ مستورات کے نام بھی نہ معلوم کیوں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر زیادہ تر خود اپنی غزلیں ہیں اور ان غزلوں کے اکثر اشعار میں ان دونوں شاگردوں کا ذکر ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

> رونق اور ٹھاکر سے روشن ہو گئی بزمِ سخن
> کیوں نہ ہو اس چرخ کے دونوں ستارے یہ بھی ہیں

سنا ہے کہ ایک مرتبہ زمین کا ایک مقدمہ چل گیا۔ آپ کا مخالف خود آپ ہی کا ایک شاگرد تھا جسنو پہلوان المتخلص بہ رستم۔ فیصلہ میں رستم ہار گیا اور چرخ صاحب جیت گئے ملاحظہ ہو اس گستاخ شاگرد کی بدتمیزی کہ دوسرے ہی مشاعرے میں یہ شعر پڑھ دیا ؎

> رستم اب اہلِ زمیں بھی خانماں برباد ہیں
> چرخ کج رفتار کی یہ مہربانی دیکھئے

کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا مگر ان بزرگ محترم نے الٹا رستم کو گلے لگا لیا کہ بیٹا ہر چند کہ تم نے استاد پر حملہ کیا ہے مگر بڑی کس سلیقہ سے کیا ہے۔ جیتے رہو میری محنت ٹھکانے لگا دی۔

مطلب صرف یہ تھا کہ ان چند حوالوں سے بیگم صاحبہ کے دادا جان مرحوم مغفور کی شاعرانہ عظمت کا تھوڑا بہت اندازہ کرایا جائے ورنہ دراصل وہ ہمارے آج کے موضوع بحث نہیں ہیں۔ ان بزرگ محترم کی وفات حسرت آیات کے بعد بیگم صاحبہ کے والد محترم کی وضعداری ملاحظہ ہو کہ ہر چند کہ آپ کو شعر و شاعری سے کوئی لگاؤ نہ تھا تاہم پاسداری فرماتے تھے مگر احتیاطاً وقت بے وقت کے لئے ایک تخلص رکھ چھوڑا تھا کہ دانستہ آید بکار اگر کبھی اتفاق سے کوئی شعر سرزد ہو گیا تو اب تخلص کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ عرش تھا آنجناب کا تخلص مگر اس عرش پر کبھی کوئی ستارہ طلوع نہ ہوا اور آپ پر کبھی کوئی شعر نازل نہ ہو سکا۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند یعنی بیگم صاحبہ کے برادر عزیز اور ہمارے آدھے گھر والے میاں جعفر اس خاندان کے گویا آخری چراغ ہیں۔ آپ نہ شاعر ہیں نہ تخلص رکھتے ہیں البتہ شاعرانہ غلط بیانی اور دروغ بافی میں اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اور ناک میں دم ہے آپ کے اس جھوٹ کے مارے۔ خیر اب تو ہم لوگوں نے بھی آپ کا بخوبی اندازہ کر لینے کے بعد یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ آپ کی ہر روایت کو فوراً سو پر تقسیم کر دیا کرتے ہیں اور حاصل تقسیم کے طور پر صحیح صحیح واقعہ برآمد ہو جایا کرتا ہے۔ مثلاً جناب تشریف لائے نہایت بدحواس۔ بہن اپنا کام کاج چھوڑ بھائی کی بدحواسی سے بدحواس نظر آ رہی ہیں۔ دریافت کیا خیریت! معلوم ہوا خیریت کہاں۔ اس محلہ میں چوریوں کی وارداتیں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ کل رات پڑوس کے حکیم صاحب کے یہاں چوری ہو گئی۔ جھاڑو دے گئے چور کوئی سوا سو کے قریب تو محض برتن لے گئے ہیں"

بیگم نے کلیجہ پر ہاتھ مار کر کہا "ہائے ہائے ان بیچارے کے یہاں تو یوں ہی مفلسی کا ڈیرہ تھا۔ بہ غریبی میں آٹا گیلا ہوا"

ہم نے جلدی سے جیب سے نکالی پنسل اور ایک سو پچیس کو سو سے تقسیم کرنے لگا۔

بیگم نے کہا۔ ذرا آپ بھی تو جاکر پوچھئے۔

ظفر میاں نے جلدی سے کہا۔ اب وہ کیا کرینگے جاکر، میں جو صبح ان کے پاس بیٹھا تھا۔"

ہم نے اس روایت کا نتیجہ تو خیر پہلے ہی نکال لیا تھا مگر تصدیق کے لئے حکیم صاحب کے یہاں جانا بھی ضروری تھا لہذا پہونچے حکیم صاحب کے یہاں۔ وہ بیٹھے ہنس رہے تھے۔ کیا عالی ظرف انسان ہے کہ تمام ... غائب اور عالی ظرفی موجود کہ ہنس رہے ہیں۔ ہم نے چوری کے متعلق ہمدردی کرنا چاہی تھی کہ وہ ہنس کر بول اٹھے۔ "اجی یہ محلہ کے لونڈے کی حرکت ہے۔ ابھی وضو کرکے لوٹا یہاں چھوڑ گیا تھا۔ دیکھا تو غائب۔ اس قسم کے لوٹا چور ہمارے محلہ میں کچھ بڑھتے جا رہے ہیں۔"

عرض کیا "اور باقی تو کچھ نہیں گیا۔ اس لوٹے کے سوا؟"

حکیم صاحب نے فرمایا "اور کیا جاتا۔ یہ کوئی چور تھوڑی تھا کوئی اٹھائی گیرا ہوگا۔"

ہم خوش تھے کہ کتنا صحیح نتیجہ ہم نے نکالا تھا ایک سو چھبیس کو سو پر تقسیم کر دیا جواب آیا ایک۔ کسر کو ہم خود جواب میں شامل نہیں کرتے بالکل صحیح جواب تھا اور لوٹا بھی ایک ہی غائب ہوا تھا۔ گھر پہونچ کر دریافت کیا کہ ظفر میاں کہاں ہیں معلوم ہوا کہ کھسک گئے کہیں۔ بیگم کو بتایا کہ وہ دیکھو لو اخبار اسی پنسل سے میں نے ایک سو چھبیس کو سو پر تقسیم کیا ہے۔ زبانی بھی تقسیم کر سکتا تھا مگر تمہارے سامنے اپنی قابلیت کا ٹھوس ثبوت کیسے پیش کرتا۔ میرا فیصلہ یہ تھا کہ کوئی برتن حکیم صاحب کے یہاں سے کھو گیا ہوگا۔ چنانچہ حکیم صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ باہر لوٹا رکھا تھا کوئی شخص اڑا لے گیا۔"

بیگم نے آنکھیں نکال کر کہا "بس لوٹا۔"

ہم نے کہا "مزید تصدیق کے لئے تم خود چلی جاؤ نا۔ میں تو اب سمجھ چکا ہوں کہ ظفر میاں کس حد تک معتبر راوی ہیں چنانچہ ان کی روایات کا نہایت صحیح نتیجہ پر پہونچ جایا کرتا ہوں۔ آپ کو خدا جانے کب برادرِ عزیز کے جھوٹ سچ کا اندازہ ہو سکے گا۔"

بیگم خاموش ہو گئیں۔ بھائی کا معاملہ تھا۔ بھائی جھوٹا ہو یا سچا شوہر سے کم میاں سے زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ دس پانچ دن کا غوطہ دیکر پھر جناب نے تشریف لاکر ہمشیر کو سراسیمہ کر دیا۔ "میں کہتا ہوں آپا۔ خدا کے واسطے یہ گھر چھوڑ دو تمام محلہ میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں آدمی مر گئے اور تم یہاں بیٹھی ہو اطمینان سے۔ ابھی وہ کلو تانگہ والے کی بیوی مری ہے۔"

بیگم نے چونک کر کہا "اسی ہیضہ میں؟"

ظفر میاں نے فرمایا۔ "ہاں صاحب ہیضہ میں ہیضہ میں گولی چل رہی ہے دھڑا دھڑ موتیں ہو رہی ہیں۔"

بیگم نے فوراً لال دوا ڈھونڈھ کر تمام گھڑوں میں ڈال دی۔ پیاز اور سرکہ کی چٹنی تیار ہو گئی اور اب ہمارے آتے ہی ناک میں دم شروع کر دیا کہ خدا کے واسطے یہاں سے کچھ دنوں کے لئے ٹل جاؤ سخت ہیضہ پھیل رہا ہے سینکڑوں آدمی مر گئے۔ آج کلو تانگہ والے کی بیوی مری ہے۔ اب ہم پریشان کہ یا اللہ اتنا ہیضہ پھیل گیا اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی جس محلہ میں سینکڑوں موتیں ہو چکی ہوں اسی محلہ میں رہ کر ایسی بے خبری بھی کیا۔ گھر سے نکلے۔ ایک ایک سے دریافت کیا سب ہماری ہی طرح کے بےفکرے اور جیتم قسم کے لوگ ثابت ہوئے کسی کو ہیضہ کی خبر نہیں۔ آخر کلو تانگے والے کا سامنا ہو گیا۔ ہم نے ہمدردی کی تو اس نے خود کہا "حضور اسکو تو زندگی مل گئی۔ تین برس سے پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ بڑی بیماری تھی سب ہی دھاڑے تو پورے ہو گئے۔"

ہم نے حیرت سے کہا "مگر میں نے تو سنا ہے کہ ہیضہ ہوا تھا۔"

اس نے ہم سے زیادہ حیرت سے کہا "ہیضہ؟ ہیضہ کا کیا ذکر؟ اس کو تو آج صبح خون کی قے آئی اور بس ٹھنڈی ہو گئی۔"

ہم نے کہا "مگر محلہ میں ہیضہ بھی تو ہے۔"

اس نے چونک کر کہا "کہاں؟ کدھر؟ کیا کوئی مر گیا ہیضہ میں؟"

ہم نے کہا "ابھی میں نے سنا ہے" اور فوراً ہی خیال آیا کہ کہیں یہ ظفر میاں کی روایت تو نہیں ہے۔ لاحول پڑھتے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ بیگم صاحبہ مکھیوں پر فنٹ چھڑک رہی تھیں اور نالیوں میں فنائل تیر رہی تھی۔ ہم نے پہونچتے ہی پوچھا "یہ ہیضہ کی خبر ظفر میاں نے پہونچائی ہے کہ سینکڑوں مر گئے؟"

بیگم نے کہا "ہاں ہاں ابھی تو کہہ کر گئے ہیں۔"

ہم نے کہا لاحول ولا قوۃ بیوقوف بنوائی ہو۔ پہلے سے کہہ دیا ہوتا تو میں سینکڑوں کو سو سے تقسیم کرکے اطمینان کر لیتا نا۔"

بیگم نے قریب آکر کہا "کیا مطلب؟"

ہم نے جل کر کہا "وہی مطلب جو آپ کے بھائی صاحب کی دروغ بافی کا ہمیشہ ہوتا ہے۔ صرف کلو تانگہ والے کی بیوی مری ہے اور اس کو بھی ہیضہ نہیں بلکہ دق تھی آج خون کی قے ہوئی اور چل بسی وہ تو تین سال سے بیمار تھی۔"

بیگم نے کہا "توبہ ہے ان کے جھوٹ سے بھی۔"

خیر اب بیگم نے بھی تقسیم کا گر نے والا گر ہم سے سیکھ لیا تھا اور ظفر میاں حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ان کی زبان سے تاثیر جاتی رہی

ہے۔ یا کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ اب بہن پران کی خبروں اور روائتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ مگر آدمی ہیں قسمت والے ان کے مقدر سے لاہور میں شروع ہوگیا ہنگامہ۔ خوفناک کشت و خون۔ امرتسر کے ہولناک واقعات ملتان کی عبرت انگیز تباہ کاریاں؟ ان سب نے مل کر عورتیں تو خیر عورتیں ہیں مردوں کو سراسیمہ کر دیا۔ راتوں کو تمام محلہ والے جاگ رہے ہیں۔ مسلمانوں کا محلہ ہے تو وہ سکھوں کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لاٹھیاں۔ برچھے۔ اینٹیں۔ پتھر۔ بندوقیں سنبھالی جا رہی ہیں سکھوں کا محلہ ہے تو وہ تلواریں صاف کر رہے ہیں۔ کرپانیں درست کر رہے ہیں۔ ہر طرف ہوشیار رہو کے ایسے خوفناک نعرے کہ بجائے ہوشیار ہونے کے آدمی بے ہوش ہو جائے۔ کبھی خبر آئی کہ اس بازار میں فساد ہوگیا۔ کبھی اطلاع ملی کہ اس سڑک پر چھرے بھونکے گئے یہاں آگ لگا دی گئی وہاں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ اس قسم کے موقعوں پر یوں ہی افواہیں اڑا کرتی ہیں پھر ظفر صاحب کو تو گویا خداداد موقع ہاتھ لگا اور مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ محلہ کمیٹی نے آپ کو سالار بھی بنا دیا۔ ہمارا سالار تو خیر خدا نے ان کو بنایا تھا مگر اب وہ محلہ کمیٹی کی طرف محافظتی دستے کے سالار مقرر ہوگئے۔ اب حضرت کے صرف دو کام رہ گئے دن بھر محلہ بھر پر حکومت جمانے پھرنا اور فرصت کے اوقات میں تو تصنیف افواہوں سے غریب بہن اور یتیم بہنوئی کا دم نکالنا۔

ارے صاحب قیامت سے بجز اقیامت۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے نالیوں میں خون بہتے دیکھا ہے۔ گاجر مولی کی طرح انسان کاٹا جا رہا ہے اور خصوصاً آج تو بہت اندیشہ ہے قریب کے گاؤں میں چالیس ہزار سکھ تلوار میں کرپانوں اور بندوقوں سے مسلح تیار بیٹھے ہیں کہ رات کو اس محلہ پر حملہ کریں گے۔"

بیگم نے کہا "پھر کیا ہوگا؟"

ظفر صاحب نے نہایت اطمینان سے فرمایا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں جو اللہ کو منظور ہے وہ ہوگا۔"

ہم نے حسب معمول چالیس ہزار کو سو سے تقسیم کر کے دیکھا تو بھی چار سو مسلح سکھ ہوتے تھے اگر واقعی چار سو سکھ اچانک آ پڑے اس محلہ پر تو حالات بیحد خطرناک ہو جائینگے تمام محلہ کے مرد ملا کر دو سو سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہم بھی گھبرا گئے۔

بیگم نے بھائی کی محبت سے بیتاب ہو کر کہا "آج تو میں تم کو نہ جانے دوں گی۔ ڈھائی پسلی کے آدمی کر ہی کیا لوگے۔"

ظفر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا سالار ہو کر اگر گھر میں گھس کر بیٹھ گیا تو مقابلہ کون کرے گا۔"

ہم نے کہا "مگر مقابلہ ہی کیا کر لوگے تم لوگ، وہ اگر چالیس ہزار نہیں تو چار سو ضرور ہونگے۔"

ظفر صاحب نے اس طرح کہا گویا خود گن کر آئے ہیں۔ "چار سو؟ غضب کر رہے ہیں آپ پورے چالیس ہزار مسلح جوان۔"

بیگم نے کہا "بھائی میں تو تم کو ہرگز نہ جانے دونگی۔"

ظفر صاحب نے کہا "عورتوں کی سی باتیں نہ کیجئے میں نہ گیا تو روند ڈالا جائے گا یہ محلہ۔"

بہن نے بہت روکنا چاہا۔ ہم نے بھی اخلاقاً تھوڑا بہت منع کیا۔ مگر سالار کی حیثیت سے وہ واقعی کیسے رک سکتے تھے چلے ہی گئے اور چلتے چلتے دم نکال گئے کہ اگر اس گھر پر حملہ ہو تو آپ لوگ۔ سیڑھی لگا کر چھت پر پہونچ جائے گا اور سیڑھی گھسیٹ لیجئے گا حملہ کے وقت بتیاں گل کر دیجئے گا اور دروازے ہر طرف سے بند رکھئے گا۔"

ان کے جانے کے بعد یہ عالم کہ ٹہل رہے ہیں برآمدے میں ان سکھوں کے انتظار میں جو چالیس ہزار تو خیر کیا مگر چار سو ضرور ہونگے۔ بیگم کا یہ عالم کہ گویا سینے کے اندر روئی دھنکی جا رہی ہے۔ جتنی دعائیں بیچاری کو یاد تھیں مع اپنے دادا جان کی ایک مناجات کے سب بار بار پڑھ چکی تھی۔ ہم نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ تم سو جاؤ مگر ان کو یقین تھا کہ سونے کے بعد قیامت سے پہلے پھر بیدار ہونا نصیب نہ ہوگا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئے تو ذرا بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے دل بیٹھنے لگا تو پھر ٹہلنے لگے۔ گیارہ سے بارہ۔ بارہ سے ایک اور ایک سے دو بج گئے اسی عالم میں مگر سکھ ہیں کہ کسی طرح آتے ہی نہیں کہ یکایک دور سے سیٹیوں کی آوازیں اور ہوشیار ہوشیار کا وہ شور بلند ہوا کہ ہوش رخصت ہونے لگا۔ کتے بھی اسوقت کورس میں بھونک رہے تھے۔ بیگم اسوقت ہمارا ہاتھ پکڑے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ کا وظیفہ جلدی جلدی دوہرا رہی تھیں۔ یہ سب کچھ تو تھا ہی کہ اسی شور و غل میں دور سے دو تین آوازیں بندوقوں کی بھی آ گئیں۔ گویا طے ہوگیا کہ وہ خوفناک گھڑی آ پہونچی۔ محلہ میں اور بھی کھلبلی سی پیدا ہوگئی۔ گھروں میں عورتوں نے، چھتوں پر لڑکوں نے اور سڑکوں پر کتوں نے وہ شور برپا کیا ہے کہ واقعی یہاں بھی اختلاجی کیفیت پیدا ہوگئی اور دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا بیگم بیچاری تو اسوقت وظیفہ بھی بھول چکی تھیں۔

خدا جانے ہم سب پر یہ عالم کب تک طاری رہا البتہ ہوش اسوقت آیا ہے جب محلہ کمیٹی کے کچھ رضاکار ہر طرف یہ آوازیں بلند کرتے ہوئے نکلے کہ "خیریت ہے۔ امن ہے۔" مگر کچھ لوگ بیحد ہنس بھی رہے تھے جنپر بیگم کے علاوہ خود ہم کو بھی بیحد غصہ آ رہا تھا کہ سبحان اللہ

کیا خوب موقع پہنچنے کا۔ بہر صورت اس خبر کے آجانے کے بعد ذرا اطمینان ہوا اور ہم لوگ بھی عین اسوقت جبکہ مرغ اذان دے رہا تھا سونے کے لئے لیٹ چکے تھے۔

دوسرے دن تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب کے محلہ میں کسی مہتر نے اپنی نصف بہتر کو غالباً نشہ میں یا غصہ میں آ کر مارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چلائی کہ بچاؤ مجھکو۔ یہ آواز جو سالار والا نمبردار نے سنی تو بجا دی سیٹی اور دوڑ پڑے اس محلہ کی طرف اپنی جماعت لیکر۔ پہلے تو اپنے ہی محلہ کی سرحد پر پڑاؤ ڈال کر حالات کا اندازہ کیا اور جب معلوم ہو گیا کہ خیریت ہے تب تو بہادرانہ شان سے گویا اس محلہ کی مدد کو جا پہنچے جہاں سب مہتر کی بنسی بجا رہے تھے جاکر معلوم کیا "بچاؤ بچاؤ" کا شور کیسا تھا تو پتہ چلا کہ مہتر اور ان کی نصف بہتر کا کچھ گھریلو جھگڑا تھا۔ لاحول پڑھ کر سب واپس آگئے مگر اصل تحقیقات مقصود تھی ان چالیس ہزار مسلح سکھوں کی جو قریب کے گاؤں سے حملہ آور ہونے والے تھے۔ مگر کسی کو ان کے متعلق کچھ نہ معلوم تھا۔ حکیم صاحب سے دریافت کیا۔ کوتانگہ والے سے پوچھا۔ رحیم بخش درزی سے دریافت کیا اور آخر کار پتہ یہ چلا کہ سب کو یہ اطلاع دینے والے ظفر صاحب ہی تھے۔ خیر یہ فیصلہ تو ہم کر ہی چکے تھے کہ تعداد میں وہی مبالغہ ہے جسکو سو سے تقسیم کرنے کے بعد ہمیشہ صحیح نتیجہ نکلا کرتا ہے مگر وہ چار سو سکھ ہی آخر وہاں آئے کیوں نہیں۔ ہم اسی غور و فکر میں تھے کہ ہمارے دوست سردار کرتار سنگھ جو اتفاق سے اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں خیریت دریافت کرنے تشریف لے آئے کہ رات کو کچھ عجیب شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ میرا تو ارادہ تھا کہ اسی وقت آکر حالات دریافت کروں مگر کسی نے آنے نہیں دیا۔

اب جو ہم نے سردار جی کو چالیس ہزار مسلح سکھوں کا واقعہ معہ اپنے سو سے تقسیم کرنے کے اصول کے سنایا تو وہ بڑی زور سے ہنسے اور دیر تک ہنسنے کے بعد فرمایا "ظفر میاں کہاں گئے ہیں انکو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آخر وہی جیتے اور آپ ہارے"۔

ہم نے کہا "یعنی؟"

سردار جی نے فرمایا "غالباً ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ ان کے مبالغہ کو سو سے تقسیم دیکر اصل واقعہ معلوم کر لیا کرتے ہیں لہذا اب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے اور وہ مبالغہ کو سو سے ضرب دیکر بیان کرنے لگے ہیں تاکہ جب آپ تقسیم کریں تو ان کے مبالغہ پر کوئی اثر نہ پڑے اور اصل واقعہ آپ سے سو گنا پھر بھی دور رہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ کل ہمارے گاؤں میں یہ طے کیا گیا ہے کہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے چار چار آدمی باری باری مسلح ہوکر رات بھر پہرہ دیا کریں۔ نو بجے سے بارہ بجے تک چار آدمیوں کی ایک ٹولی بارہ سے تین تک دوسری ٹولی اور تین سے چھ تک تیسری ٹولی۔ اس چار کو چار سو تو وہ عموماً بنا تے ہونگے مگر آپ کی تقسیم کے مارے چالیس ہزار بنانا پڑا"۔

سردار جی تو ٹہلتے رہے مگر ہمارا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ بلبلاتے ہوئے گھر میں گئے اور بیگم کو من و عن تمام واقعہ سنا کر ایک نہایت عمدہ ترکیب بتائی مگر ان کی عقل میں بھلا یہ ترکیب کہاں آسکتی تھی نتیجہ یہ کہ الٹی ہم ہی سے خفا ہو گئیں۔ حالانکہ اس سے مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ہم ان کے یا ان کے برادر عزیز کے دشمن ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ہم نے دوستانہ مشورہ دیا تھا کاش وہ منظور کر لیتیں۔ اگر ہمیشہ کے لئے ان کے برادر بجان برابر کے جھوٹ کی اصلاح نہ ہو جاتی تو ہمارا ذمہ تھا۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ کیسا مخلصانہ مشورہ تھا کہ ریڈیو پر اور اخبارات میں برابر اعلان کیا جا رہا ہے کہ افواہیں پھیلانے والوں کو فوراً حکومت کے حوالے کر دیا جائے انشاء اللہ ان کو عبرت انگیز سزائیں دی جائینگی۔ گویا سرکاری طور پر بیگم صاحبہ کے بھائی کے جھوٹ کا علاج ہو سکتا تھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ کہا پھر ایسا نادر موقع نہ مل سکے گا۔ گھریلو معاملات میں جھوٹ بولنا اخلاقاً خواہ کتنا ہی بڑا جرم کیوں نہ ہو مگر قانوناً کوئی جرم نہیں ہے مگر اس وقت اس ہنگامہ کے بدولت ظفر میاں کی عمر بھر کی اس عادت کا نہایت آسانی سے علاج ہو جائے گا صرف یہ اطلاع کرنے کی دیر ہے کہ رات سارا محلہ اس طرح بےچین رہا اور اس کی وجہ ظفر میاں کی یہ روایت تھی۔ پولیس ان کو ہاتھوں ہاتھ لے جائے گی اور سرکاری مصارف سے ان کی اس بیماری کی حد تک پہونچی ہوئی عادت کا علاج ہو جائے گا۔ مگر وہ جو کہا ہے ناکسی نے کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ ایسے نیک مشورے کا صلہ ہم کو یہ ملا ہے کہ پہلے تو وہ گرجیں۔ پھر برسیں۔ دونوں آنکھوں سے موسلا دھار برسیں اور اب بات چیت بند ہے منہ پھولا ہوا ہے۔ آنکھیں سوجی ہوئی ہیں اور سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی ہے گویا درد سر بھی ہے۔ ظفر میاں کا بیان ہے کہ کم سے کم ایک سو چار کے قریب بخار ہوگا اور ہم حیران ہیں کہ اگر ایک سو چار کو سو سے تقسیم کرتے ہیں تو خطرہ اور تقسیم نہیں کرتے تو خطرہ۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ کہ جھوٹ کوئی بولے اور سزا کوئی بھگتے۔

ضروری رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالہ میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ ——— (ادارہ)

دوسرا کنارہ

افسانہ

قرۃ العین

اندھیرا۔ بہت گہرا اندھیرا۔ خوابوں کا شہر، پرانے نغموں، پرانی یادوں کا چھوٹا سا ویرانہ، اس پر اندھیرا چھاگیا۔ سوائے ایک دوسرے سے مل کر روتے ہوئے آگے روانہ ہوگئے۔ تاریک راستوں پر سے گذرتے ہوئے۔ سب امیدیں، سارے سپنے ان تاریک راستوں کے کنارے تھک کر گر پڑے۔ اور روحیں آہیں۔ تاریکی، وحشت اور ویرانی کی روحیں جیخیں چلاتی۔ اور سائیں سائیں کرتی ہوائیں چلیں۔ اور آہستہ آہستہ بہنے والے سرخ دریا کے ساحل پر دھواں اٹھا اور انمول خداؤں کے سیاہ معبدوں میں جلنے والے چراغ روتے رہے۔ روتے رہے۔ اور خوابوں کے اس ویران شہر میں رہنے والے شکست خوردہ انسان آگے بڑھے۔ ان کے دکھ بہت تھے۔ ان کے راز بجید چھوٹے چھوٹے دلے ہوئے اور بہت سافت خیز۔ اور تاریکی چھاگئی۔ خاموش ستاروں اور خوشبوؤں والی رات کی تاریکی گہری۔ اور گہری۔ سناٹا۔ اکیلا ابدی اور لازوال۔ اور تھکے ہوئے وقت کے اس ریگستان کے پرے سے، اس کی عمیق وسعتوں کو کاٹتی ہوئی، ایک گہری آواز تیر کی طرح نکلی اور بلند ہوئی۔ میرا سلام کہو اگر نامہ بر ملے۔۔۔ اور دھواں پھر اٹھتا رہا۔ شعلوں کی سرخ اور زرد رقصاں پرچھائیوں نے پانی کی سطح کو اور سرخ کر دیا۔ اور سرخ۔ اور چاند ڈوب گیا۔ پرانے درختوں کی شاخیں آپس میں جھک گئیں۔ ستارے ٹوٹ کر چٹانوں پر بکھر گئے۔ چاند ٹوٹ پھوٹ کر، تھک کر، نیچے گر پڑا۔ اور ہوائیں روتی رہیں۔

پھر یہ اندھیرا کم ہوا۔ اور صبح ہوئی۔ ایک اور صبح۔ اور چھاؤنی کا بگل بجا تھا۔ صبح، دوپہر، شام، رات، وہ بگل ہمیشہ اسی طرح بجا کرتا۔ ٹھنڈی اور سہانی صبح۔ اور دریچے کے باہر سویٹ پی کی خوشبوئیں اڑنے لگیں۔ اور گوبھی کے پتوں پر شبنم کے قطرے جھلملا اٹھے۔ دور پریڈ گراؤنڈ میں بگل بجتا رہا۔ پھر سورج نکلا۔ پھر بادل چھٹے۔ پھر روشنی پھیل گئی۔ پر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ بہت دور تھا۔ بہت دور۔ لاپرواہ، مذاق اڑاتا ہوا، خود پسند، مغرور۔ اور کرائسٹ چرچ کے گھنٹے بجنے لگے۔ اور بہت سے شور، بہت سی آوازیں۔ سب نے مل کر چاروں طرف سے جیسے سکوت کو توڑ دیا۔ وہ بہت اکتا کر، بہت تھک کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بٹیا صاحب جاگ گئیں۔ مہریوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہا اور دوڑ بھاگ مچا کر اس کے کام میں مصروف ہوگئیں۔ اس کا کتا ٹیپا کودتا آکر مسہری کے قریب صوفے پر پیر لٹکا کر کھڑا ہوگیا۔ کھانے کے کمرے میں صبح کی چائے کی گھنٹی تھرانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ بند کرلیں۔ سرخ اندھیرا اور زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اس نے کسی چیز کو دیکھنا نہ چاہا۔ ہر چیز سے۔ ہر ذرے سے اس کا خیال وابستہ تھا۔ وہ دریچے کے نیچے اس روش پر سے گذر کر اپنی کار میں بیٹھا کرتا تھا۔ وہ گیلری میں رکھے ہوئے ریک پر اپنی ہیٹ پھینکتا ہوا پردہ اٹھا کر اندر بڑے بھیا کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ وہ ٹیلیفون کی میز پر جھک کر ڈائریکٹری کے ورق پلٹتا تھا۔ وہ اسی نیلے آسمان کے نیچے، انہی فضاؤں میں اب بھی سانس لے رہا ہے۔ کاش۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کچھ نہ ہوتا۔ پر ایسا نہیں تھا۔ اور اس کا کتا مسہری کے نیچے کھڑا چوکلیٹ کے انتظار میں دم ہلا رہا تھا۔ وہ اس کمبخت کتے کو بھی چھو چکا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے چوکلیٹ کھلا چکا تھا۔ اس نے مسہری پر سے جھک کے کتے کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے انتہائی تکلیف محسوس ہوئی۔ باہر برآمدے میں آپا بڑے بھیا کے بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ اگر تم نے پھر شرارت کی تو انکل جمیل نہیں آیا کریں گے۔ وہ تمہیں کبھی اپنی موٹر سائیکل پر نہیں بٹھائیں گے۔ وہ کہہ رہے تھے تو نٹی بڑا برا ہے۔ ہم اس سے خفا ہو کر جا رہے ہیں۔ آپا برابر لوٹی سے باتیں کرتی رہی۔ کتا برابر دم ہلاتا رہا۔ اب وہ پاگل ہو جائے گی۔ قطعی پاگل۔ بالکل باؤلی ایسی۔

پھر وہ مسہری پر سے اتری۔ ایک بھری روز کی طرح اسکو صبح کا اخبار دے گئی۔ وہ صوبے کا گزٹ کبھی نہیں دیکھتی تھی۔ پر اسوقت اس کی نظروں پاینئر کے گزٹ کے کالم پر پڑگئیں۔ اس کا ننھا دل کہیں بہت دور رکا ہوگیا تھا۔ بہت دور کا۔ اس نے اخبار قالین پر پھینک دیا۔ کمبخت گدھا کہیں کا۔ گدھا۔ الو۔ چھاؤنی کے بگل بجتے رہے۔ صبح، شام، رات۔ صبح۔ شام، رات۔ رنگ برنگی روشنیاں اور لرزاں سائے اس کے چاروں طرف ناچتے رہے۔ ناچتے رہے۔

اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس نے بھولنا چاہا۔ ہمیشہ کے لئے بھول جانا چاہا۔ وہ لمحے۔ وہ ساعتیں۔ وہ انتہائی تکلیف دہ ساعتیں۔ انتہائی کرب انگیز یادیں جب اس کی بہن کی شادی کے ڈنر کی رات وہاں پر خوب تیز روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ اور دور دور تک پھیلے ہوئے یوکلپٹس اور پام کے درختوں کے نیچے رات کی ہواؤں میں سرسرا رہے تھے، اور "شرازو صندل" اور "پیرس کی شام" کی خوشبوئیں رات کی رانی کی مہک میں مل کر ہواؤں میں آ رہی تھیں۔ اور لاتعداد چمکدار طویل کاروں کی قطاریں برآمدوں، درختوں اور شہ نشینوں میں سے جھانکتی ہوئی برقی روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں اور سبزے پر ملٹری بینڈ پوری طاقت سے بجایا جا رہا تھا۔ اور مہمانوں کے گروپ گھاس کے قطعوں پر، جگمگاتے درختوں کے نیچے، برآمدوں اور شہ نشینوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور اندر آرکیسٹرا بج رہا تھا اور اسوقت وہ تھوڑی دیر کے لئے گل مہر کے پیڑ کے قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ جل رہا تھا۔ اور اس نے لوٹی سے کہا تھا۔ میرا دوست لفٹنٹ کمانڈر رحمٰن کراچی سے آیا ہوا ہے۔ وہ راجکماری صاحبہ سے شادی کرنا چاہتا ہے میں بھی اس کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ راجکماری سے پوچھو کیا وہ اسے پسند کریں گی مجھے تو وہ بیحد پسند ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ پھر وہ باتیں کرتا ہوا دوسرے مہمانوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اور سبز درختوں اور سرخ شہ نشینوں میں نارنجی اور نیلے برقی قمقمے جل رہے تھے اور ...

سب کے سب ایک دم مصروف ہو گئے۔ آرکسٹرا کی موسیقی بجتی رہی۔ اور دریا کے سرخ پانیوں کے کنارے دھواں پل کھاتا ہوا، دیرا تھا۔ اٹھتا گیا۔ اور اس کے ہیولوں کی جس زیادہ ہوگئی۔

اور رات کے گہرے اندھیرے میں ریڈیو گرام چلاتا رہا۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔ اگر نامہ بر ملے۔

پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اسوقت وہ سب بالکونی کے نیچے باتوں میں مصروف تھے۔ گل مہر کی شاخوں کے پرے اس کی ٹرک کھڑی تھی۔ اور درختوں میں بڑے بڑے سرخ پھولوں سے جیسے آگ لگ رہی تھی۔ سچ مچ کی آگ۔ وہ اپنی بہن کی شادی میں آئے ہوئے مہمانوں کو اپنے ساتھ پکنک اور مچھلی کے شکار پر لیجانے کے پروگرام بنا رہا تھا۔ اور اس نے بڑی بے تکلفی سے اس کی طرف مڑ کر اسماء سے کہا آپ کی ممی بھی ہمارے ساتھ جاویں گی نا؟ آپ کیلئے کل صبح پانچ بجے تک اسٹیشن ویگن اور ٹرک بھجوا دیئے جاویں گے۔ پھر اس نے سب کو اپنی مترنم آواز میں خدا حافظ کہا اور اس کی ٹرک گرد کے بادل اڑاتی باغ کی سرخ بجری والی سڑک پر سے گذرتی صنوبر کے درختوں کے پرے جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

پھر وہ اسماء کیلئے جس کے شوہر کا تبادلہ ان ہی دنوں پونا سے وہاں کا ہوا تھا، کوٹھی کے متعلق طے کرنے کے لئے اس راستے پر سے گذری جس کے دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے۔ اس نے اس گھر کے آگے کار روک لی جسکی روشوں کے ساتھ ساتھ چنار اور صنوبر کے درخت کھڑے تھے۔ جہاں چاروں طرف سبز گھاس کے وسیع قطعوں میں جن کے کنارے کنارے تیز سرخ، کاسنی اور سفید پھول لہلہا رہے تھے پانی دیا جا رہا تھا۔ گھاس پر پانی کے ٹیوب اور دور تک بکھرے پڑے تھے ان میں سے بہہ بہہ کر پانی آہستہ آہستہ گھاس میں جذب ہو رہا تھا۔ سرد، پرسکون، خاموش۔ وہ اس کا گھر تھا۔ اس کا ہو سکتا تھا۔ پر اس کا نہیں تھا۔ اس کا نہیں تھا۔ مالی اپنا کام ختم کر کے لمبے لمبے قدم رکھتا پھاٹک تک آیا۔ کوٹھی ابھی خالی نہیں ہوگی مس صاحب۔ صاحب بہادر سرکاری کام سے تھوڑے دن کے لئے ولایت جانیوالا ہے، اسلئے پوری کوٹھی بند نہ کردی جائے گی خالی دفتر کے کمرے کھلے رہیں گے۔ اپنا کارڈ چھوڑ جائیے مس صاحب۔ اس کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی اور دوسرے پھاٹک سے نکل کر خاموش، سایہ دار سڑک پر آگئی۔

اور وہ اندر سو رہا تھا۔ وہ باہر ہی سے واپس چلی گئی۔ اور وہ اندر سو رہا تھا۔

پھر وہ جاگ کر اپنی ساگوان کی مسہری پر سے اٹھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس نے سگرٹ جلایا۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا۔ اور وہ اپنے پرانے دون اسکول کا ایک پرانا گیت گنگناتا ہوا غسل خانے میں گیا۔ وہاں نہاتے میں اس کی آنکھ میں صابن گھسا اور اسے خوب چھینکیں آئیں۔ اور اس نے چپکے سے لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہ ٹینس کے لئے تیار ہونے لگا۔ اور چائے پیتے پیتے اس نے ریڈیوگرام پر اپنا پسندیدہ ریکارڈ لگا دیا۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔

جبکہ وہ اس سایہ دار سڑک پر سے واپس جا رہی تھی۔

پھر اندھیرے میں دو کاریں آمنے سامنے مخالف سمتوں سے ایک دوسرے کی طرف بڑھیں۔ پہلی کار نے قریب پہنچ کر اپنی سامنے کی روشنیاں مدھم کر دیں۔ اور دوسری کار زناٹے کے ساتھ برابر سے نکل گئی۔ وہ کلب سے واپس آرہا تھا۔ اور وہ اسی وقت کلب جا رہی تھی۔

وہ چلتی رہی۔ یہانتک کہ وہ دریا کے آخری پل تک پہنچ گئی۔ اس نے کار روک لی۔ وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بہت پیچھے۔

اور خوابوں، امیدوں کا ایک روتا ہوا ہجوم اندھیرے میں آگے بڑھتا گیا اس کے ہیولے یونہی جلتے رہے۔ جھونی کا بگل بجا اور آدھی رات کے پرند باغ کی تاریک جھاڑیوں میں شور مچانے لگے۔ اللہ۔ اللہ میرے۔ میں کس قدر کی احمق ہوں۔ الو۔ وہ جتنی مرتبہ اتنک اس سے ملی تھی، کلب کے بال روم میں ٹینس کورٹ پر، سال لوکی پریڈ کے موقعہ پر، پارٹیوں میں، اس کو ایک ایک منظر، ایک ایک لفظ، ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ کس کس سے باتیں کر رہا تھا اس نے کیا کیا کہا تھا۔ وہ کس کس موقع پر ہنسا تھا۔ اس نے کب اپنے مخصوص انداز میں اپنی سیاہ آنکھیں جھپکائی تھیں اور اس کو یہ بھی یاد تھا کہ اتنے سارے موقعوں پر اس نے کبھی اس سے ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسری لڑکیوں کا پارٹنر بنتا۔ کھیلوں میں، رقص میں، جشنوں میں۔ وہ کبھی اس گروپ میں شامل نہیں ہوا جس میں وہ شامل رہی ہو۔ سال لو پر اس نے سب کو اپنے ضلع کے جنگلوں میں شکار کے لئے مدعو کیا۔ پر اس کی طرف مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ وہ جب بھی کسی جگہ جاتی ہمیشہ ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ چند لمحے قبل وہاں سے جا چکا ہوتا یا پھر اسکے جانے کے بعد وہاں پہنچتا۔ اس ساری بے تعلقی اور بے نیازی کے باوجود وہ بڑے بھیا کا بہت گہرا دوست تھا، اور لو لو کا۔ اور اس کی ممی بڑی کنور رانی صاحبہ کا۔

بڑی کنور رانی صاحبہ کو وہ ہمیشہ ان کی ریاست کے مقدموں کے متعلق طرح طرح کے دلچسپ مشورے دیا کرتا۔ ان کے اختلاج قلب کے لئے بھی عارضے کے لئے نئے نئے معالج تجویز کرتا۔ بڑے بھیا کو گھوڑوں، کتوں اور موٹروں کی خریداری میں ان کی مدد کرتا۔ بڑے بھیا کی ولایتی بیوی یعنی چھوٹی کنور رانی صاحبہ کے ساتھ ان کے پسندیدہ رقص کرتا۔ لونی سے کھیلتا۔ لو لو سے اس کی فزکس اور ہوائی جہازوں کی باتیں کرتا۔

پھر اس کا تبادلہ ہوگیا اور وہ وہاں سے بہت دور چلا گیا۔

اور اس نے یوپی گزٹ کا پرچہ آتشدان میں پھینکدیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے ہیولے اسی شدت سے جلا کئے۔

وہ اپنی اس بیکار، بے مصرف، احمق زندگی سے عاجز آگئی۔ پھر وہ جاڑوں کے مرد، اکتائے ہوئے بے رنگ دن گذارنے کے لئے اپنے تعلقے پر چلی گئی۔ اس نے اپنے پرانے قصباتی محل کی ایک ایک چیز کو چھوا۔ شہ نشین، دالان، گیلریاں، کمرے، وہ پھاٹک جن کی محرابوں پر اودے کی

سلطنت کا پرانا نشان آمنے سامنے دو بڑی بڑی مچھلیاں سرخ پتھر سے بنی ہوئی تھیں۔ وہ درخت جن کی شاخوں پر بیٹھ کر وہ لوٹو کے ساتھ بچپن میں اسکول کا ہوم ورک ختم کیا کرتی تھی۔ اور باغ کے نشیب میں بانس کے ہرے جھنڈ کے نیچے بڑے حوض کے جنگلے کی جالی کے کچھ حصے شکستہ ہو کر پانی میں گر چکے تھے۔ آموں کے سائے میں سرخ پتھر کے چبوترے کے چاروں طرف اونچی اونچی گھاس اور خودرو پودے اگ آئے تھے۔ اور چبوترے کی سیڑھیوں کے کونے ٹوٹ گئے تھے۔ موٹر خانے اور اصطبل کی چھت کے بھاری شہتیر بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور اس کا دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ اور سارے قصبے میں شور مچ رہا تھا۔ بٹیا صاحب واپس آگئیں۔ بٹیا صاحب اب بہت بڑی ہو گئیں ہیں۔ انہوں نے کالج، ولایت سب پاس کر لیا ہے۔ بڑے بھیا صاحب اتنا پڑھ گئی ہیں۔ پر اب ان کو گھوڑوں کا شوق نہیں رہا۔ ان کے دونوں گھوڑے اصطبل میں اکتائے ہوئے کھڑے اپنی دموں سے مکھیاں اڑاتے رہتے ہیں پر بٹیا صاحب نے بھول کر بھی رام آسرے سے ان کے لئے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اب موٹر بھی اتنی تیزی سے نہیں چلاتیں۔ بس دن بھر اکیلی اکیلی باغ میں گھوما کرتی ہیں یا بڑے چودھری صاحب کے مزار کی سیڑھیوں پر بیٹھی جانے کیا کیا لکھا کرتی ہیں۔

پھر سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ بٹیا صاحب کی بڑے بھیا صاحب سے لڑائی ہو گئی ہے۔ چھوٹے کنور صاحب لوٹو میاں تو گذارے دار ہیں ان سے بڑے بھیا سے کوئی مطلب نہیں لیکن بڑے چودھری صاحب بٹیا صاحب کو بہت چاہتے تھے وہ بٹیا صاحب کے نام بہت سے گاؤں لکھ گئے ہیں۔ ویسے تعلقداری کے قانون کے لحاظ سے لڑکی کو وراثت میں کچھ نہیں ملتا۔ اسی لئے بڑے بھیا اب ان سے جلتے ہیں۔ بڑے بھیا اپنی ریاست میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ انہیں ٹینس، کتوں، گھوڑوں اور موٹروں کا بیحد شوق تھا۔ وہ ہر سال نئی موٹریں خریدتے اور عمدہ گھوڑے اور کتے۔ لیکن وہ کبھی ریس میں نہیں جاتے تھے۔ کبھی ڈرنک نہیں کرتے تھے۔ چھتر منزل اور دلکشا کلب میں رات رات بھر ڈانس میں نہیں گذارتے تھے۔ ان کے تعلقے کو کورٹ آف وارڈ سے چھٹکارا حاصل کئے بہت کم عرصہ ہوا تھا لیکن اتنے دنوں میں انہوں نے اپنی رعایا کے دلوں میں بہت جلد جگہ بنالی تھی۔ ان کی ولایتی میم صاحب کبھی سلیکس یا فراک یا اونچی اسکرٹ پہن کر باہر نہیں گھومتی تھیں جیسا کہ سنا گیا تھا کہ وہ لکھنؤ، نینی تال، اور مسوری میں کرتی ہیں۔ بلکہ ہمیشہ بڑی کنور رانی صاحب اور بٹیا صاحب کی طرح غرارہ پہن کر اور دوپٹے سے سر ڈھک کر باہر نکلتی تھیں۔ پر اتنے اچھے بھیا صاحب کو جانے کیا ہوا کہ اپنی اکلوتی بہن سے لڑ بیٹھے۔

اور پرانی محلسرا کی ساری مہریاں، مغلانیاں، سائیس، رکابدار اور دوسرے ملازمین سائے کی طرح چپکے چپکے ادھر ادھر سرگوشیاں کرتے پھرتے۔ بٹیا صاحب کو دیکھ کر انہیں بڑے چودھری صاحب کا زمانہ یاد آرہا تھا۔ ان کو مرے کتنے کم دن ہوئے تھے پر لگتا تھا جیسے مدتیں گذر گئیں۔ وہ دن جب بٹیا صاحب اسکول بند ہونے پر چھٹیوں میں نینی تال سے آتی تھیں اور چھوٹے بھیا کے ساتھ دور دور تک گھوڑا دوڑاتی چلی جاتی تھیں۔ اور جب گرمیوں میں آم کھانے کے لئے لکھنؤ سے بھیا صاحب کے دوستوں اور ان کی سہیلیوں کی پارٹیوں کے ٹرک اور اسٹیشن ویگنیں خوب دھول اڑاتے قصبے کی سڑک پر داخل ہوتے تھے۔ وہ سب زمانے گذر گئے۔ اور بڑے چودھری صاحب سفید جالی والے سنگ مرمر کے مزار پر موتیا اور بیلے کے جھاڑ جھک آئے اور ان کے گھوڑے اصطبل میں کھڑے کھڑے بوڑھے ہو چلے۔ اور بٹیا صاحب اکیلی اکیلی دن بھر آم کے باغوں میں گھوما کرتیں۔

پھر وہ اپنے باغوں سے بھی کتا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا اب کیا کرے۔

اور ایک روز لکھنؤ سے آنے والی سمینٹ کی چوڑی سڑک پر سے گرد اڑاتی ہوئی ایک سفید اسٹیشن ویگن آم کے ان ہرے کنجوں میں داخل ہوئی۔ اور سرجو کے کنارے آکر رک گئی۔

اور حالے میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ بڑے بھیا صاحب اور چھوٹے کنور صاحب کی غیر موجودگی میں بڑے صاحب ضلع کا دورہ کرتے ہوئے وہاں آپہنچے تھے۔ اور بٹیا صاحب کو یہ خبر سنانے کے لئے مہریاں سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھیر دار سرخ اور اودے لہنگے سمیٹتی اور پیروں کے چاندی کے کڑے بجاتی محلسرا کے اندر بھاگیں۔ اور ڈیوڑھیوں میں بیٹھ کر شطرنج کھیلنے اور حقہ پینے والے سارے منشی اور لالہ اور بھیا صاحب کا سارا عملہ سٹر پڑا کر اپنے اپنے کاغذات اور رجسٹروں کی طرف لپکا۔

اور قیامت کی طرح وہ اپنی سفید اسٹیشن ویگن میں سے اترا اور اپنے گوگلز اتار کر اس نے چاروں طرف کی ہریالی، اور سرجو کے پگھلی ہوئی چاندی جیسے بہتے ہوئے پانی پر نظر ڈالی۔ اور پھر وہ اپنے عملے کے ساتھ جانچ پڑتال کیلئے آگے روانہ ہو گیا۔

اور بٹیا صاحب پرانی محلسرا کے اندر اپنے وکٹورین طرز کے سجے ہوئے کمرے میں بیٹھی پیانو بجاتی رہیں۔ اور سرجو کے کنارے آموں کے باغ میں بڑے صاحب کا پڑاؤ کئی دن تک رہا۔

اور یکایکی بٹیا صاحب اپنی بیوک میں بیٹھ کر لکھنؤ واپس جانے لگیں۔ ان کا سارا عملہ اور سارے رشتے دار انہیں خدا حافظ کہنے باغ کے بڑے پھاٹک تک آئے جس کی محرابوں پر سرخ پتھروں کی دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں اور پھر دو موٹریں اسی سڑک پر جامنوں کی چھاؤں میں آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ایک سفید اسٹیشن ویگن۔ اور ایک گہری سرمئی بیوک ایک جھٹکے کے ساتھ نیلے دھوئیں کے بادل چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور اسٹیشن ویگن سمینٹ کی سفید ویران سڑک پر رینگتی رہی۔

اس کی آنکھوں کے بیوٹے یونہی جلتے رہے۔ اور چھاؤنی کے بگل کی طرح بجا کئے۔ اور کرائسٹ چرچ کے گھنٹے۔ پھر گرمیاں آئیں۔ اور مسوری کا سیزن ——— وہ ایک انگریز پولیس آفیسر تھا۔ جو صرف تین سال قبل انگلستان سے آیا تھا۔ اور کہتے ہیں اس سیزن میں وہ اس پر بالکل مرمٹا۔

اور قصبے میں پھر سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ بیٹا صاحب کو کیا ہو گیا جو انگریز سے شادی کئے لے رہی ہیں۔ اور مسوری کی روایت ہے کہ ایلمر بریڈلے تو چٹان پر سے کود کر خودکشی کرنے کو تیار تھا۔ ٹوٹو کا بمبئی سے تار آیا۔ کیا یہ افواہ صحیح ہے۔

کاش وہ صرف یہ محسوس کر لیتا۔ کاش اس کو محض اس کا اندازہ ہو جاتا کہ وہ یہ سب کچھ محض انتقاماً کرنا چاہ رہی ہے۔ بے بسی کا انتقام۔ لیکن وہ بہت نڈر تھا اور ہمیشہ کی طرح سب سے بے نیاز اور بے تعلق۔ چاہے وہ اس سے بھی زیادہ کوئی انتہائی حیرت انگیز حرکت کر بیٹھتی تب بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ اس کے متعلق کچھ سوچتا بھی نہیں۔

اور بریڈلے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اور وہ الہ آباد واپس جا رہا تھا جہاں کا وہ ایس۔ پی تھا۔

اور جب وہ رنک سے نکل ایلمر بریڈلے کے ساتھ رکشا میں بیٹھ رہی تھی اسی وقت وہ لیڈی اعجاز کے خاندان کے ساتھ اس طرف آتا نظر آیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں بہت خاموش تھیں۔ ہمیشہ کی طرح بہت خاموش لیکن متبسم۔ رکشا کے قریب سے گذرتے ہوئے انہیں دیکھ کر وہ بریڈلے سے باتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ اپنے اپنے محکموں کے واقعات، اور پھر قہقہے، مترنم قہقہے۔ اور مسوری کی ساری روشنیاں جگمگاتی، گھومتی ہوئی نیچے ڈوبی جا رہی تھیں۔ اور جس چٹان پر اس کی رکشا کھڑی تھی وہ ٹوٹ کر تیزی سے نیچے کھڈ میں گر رہی تھی۔

پھر وہ اس کو سلام کئے بغیر، اسکو دیکھے بغیر لیڈی اعجاز کی چھوٹی لڑکی اور دونوں ننھے بیٹوں کے ساتھ وادی کی طرف اتر گیا۔ شاید وہ سب چاندنی رات کی پکنک کے لئے جا رہے تھے۔ یہ راجکماری جہان آرا بیگم اس انگریز شخص سے کیوں شادی کر رہی ہیں۔ اس سے تو ہمارا لفٹننٹ کمانڈر حفیظ الرحمٰن ہی کہیں بہتر تھا جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اس نے دور سے اسے کہتے سنا پھر وہ سب وادی میں اترتے ہوئے چاندنی کے دھندلکے میں کھو گئے۔

اور اس شام، واپس سوائے پہنچکر اس نے رات بھر میں اپنا سارا سامان پیک کر لیا۔ ٹوٹو بمبئی سے آ چکا تھا۔ بڑی کنور رانی صاحبہ کی دیکھ بھال اس کے سپرد کر کے وہ صبح پہلے گیٹ سے دہرہ دون آ گئی۔ راجپور سے اس نے ایلمر بریڈلے کو فون کیا کہ وہ جا رہی ہے اور افسوس ہے کہ اب اس سے کبھی نہیں مل سکیگی کیونکہ اس نے اپنا شادی کا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔

وہ گھر واپس پہنچی اور کار سے اتر کر سیدھی اپنے کمرے میں جا کر مسہری پر گر گئی۔ اور خوب خوب رونے سے زیادہ مناسب کام اس کی سمجھ میں اسوقت اور کوئی نہ آیا۔ وہ خوب روئی۔ یہانتک کہ شام کا اندھیرا چھا گیا اور مال پر قمقمے جگمگا اٹھے اور دلکشا کی طرف ٹینگو کی موسیقی ہواؤں میں گونجنے لگی۔ پھر چھاؤنی کا رات کا بگل بجا۔ اور باغ میں رات کے پرند چیخنے لگے۔

پھر صبح ہوئی۔ ایک اور صبح۔ اور وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ اور مسہری کے سرہانے کی میز پر اس کی غیر موجودگی میں جمع شدہ ڈاک کے ایک نقرئی لفافے پر اس کی نظر پڑی۔ وہ مسز لیڈی اعجاز کی چھوٹی لڑکی کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اور کھانے کے کمرے میں چھوٹی کنور رانی صاحبہ اپنے بچے کو اوولٹین پلانے کے مرحلے میں مصروف ہیں۔ طرح طرح سے بہلا پھسلا رہی تھیں ٹونی ایکے سے نہائت۔ انکل جیمی تمہارے لئے اسکوٹر لا دینگے۔ اور اچھا تم اپنی نئی آنٹی کو دیکھو گے؟ انکل جمی نے تمہارے لئے ایک پیاری سی آنٹی چنے گئے ہیں۔ تم نے اوولٹین نہیں پیا تو پھر آنٹی تم سے کبھی نہیں بولیں گی۔ اور ٹونی نے فوراً اوولٹین پینا شروع کر دیا۔

اور رات آئی۔ ایک اور رات۔ جبکہ ہوائیں چل رہی تھیں اور بارش ہو رہی تھی۔ بڑے بھیا اور چھوٹی کنور رانی صاحب گورنمنٹ ہاؤس کے ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ اور وہ اکیلی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی۔ بالکل تنہا۔ اور اسوقت اس نے سوچا۔ وہ کیوں پیدا ہوئی۔ کیوں بڑی ہوئی۔ اس نے کیوں اتنا پڑھا لکھا۔ وہ مسوری کے حسن کے مقابلوں میں کیوں ہمیشہ فرسٹ آئی۔ اس نے تیراکی اور پیانو میں مہارت کس لئے حاصل کی۔ کیونکہ انسان اتنا مجبور اور بے بس ہے۔ اتنا بے بس۔

پھر ٹوٹو نے بمبئی سے لکھا۔ بٹیا۔ لفٹنٹ کمانڈر رحمٰن سے اب بھی شادی کر لو۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی جن باتوں کا وہ مذاق اڑایا کرتی تھی وہی سب باتیں ایک ایک کر کے اس کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ قسمت کتنی ستم ظریف ہے۔

اور روایت ہے کہ ایلمر بریڈلے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ اس نے آئی سی ایس اور آئی پی والوں کے لئے (COMPENSATION) کی تجویز منظور کر لی اور اگلے جہاز سے ولایت واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

اور پھر بڑے بھیا نے کہلوایا۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کر سکتا کہ تم اس طرح بیکار ادھر ادھر گھوما کرو۔ تمہیں اب کسی نہ کسی سے شادی ضرور کرنا پڑے گی۔ بڑی کنور رانی صاحبہ پر اختلاج قلب کا بہت سخت دورہ پڑنے والا تھا لیکن اس کی شادی کی خوشی میں وہ اچھی ہونے لگیں۔

اور پھر اسی طرح شہ نشینوں اور درختوں میں برقی قمقمے جگمگائے، اسپیشل ملٹری بینڈ اور آرکیسٹرا آیا۔ اور اس کی شادی ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو ایک آدھ مرتبہ پہلے کبھی مسوری میں دیکھا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا تعلقہ دار تھا جس کی آمدنی حد سے حد چالیس پچاس ہزار سالانہ رہی ہوگی۔ اس کی تعلیم لکھنؤ کے لا مارٹینیر اور کالون تعلقہ دارز کالج سے آگے نہ تھی۔ لیکن وہ اچھا ڈانسر تھا۔ اور ٹینس کا اچھا کھلاڑی تھا۔ اور اچھا فلرٹ تھا۔ مسوری آئی ہوئی ہندوستان کی ساری راجکماریوں اور بیگمات سے فلرٹ کرنا اس کا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ اور اس کی شادی ہو گئی۔ اور وہ اس زندگی میں زبردستی دلچسپی لینے لگی جو اسے کبھی بھی زیادہ پسند نہ تھی۔ وہ گرمی کے چار مہینے پہاڑ پر اور سال کا باقی حصہ اپنے شوہر کے تعلقے پر بارہ بنکی یا سیتاپور میں گذارتی جہاں روز کسی نہ کسی انگریز یا ہندوستانی افسر کی آمد پر دعوتیں ہوتیں اور اسے رات رات بھر فلور پر رقص میں جاگنا پڑتا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ اپنی [illegible] کے سپوتوں کی جلن کو جلانے میں خاصی کامیاب ہو چکی تھی۔ اور چھاؤنی کے بگل کی آواز پھر وہ اپنے بچے کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگی۔ اور پھر ایسا ہوا کہ اس

تبادلہ اسی ضلع کا ہوگیا جہاں اس کے شوہر کی ریاست تھی۔ اس کی بیوی ان دنوں اپنی ممی لیڈی اعجاز کے وہاں شملے گئی ہوئی تھی۔ کاش کوئی آکر اس سے کہتا کہ وہ بالکل اپنی بیوی سے خوش نہیں ہے۔ وہ بہت رنجیدہ رہتا ہے۔ وہ اکثر افسوس کیا کرتا ہے کہ اس نے ریحانہ اعجاز سے کیوں شادی کرلی۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کی طرح بہت خوش اور بشاش تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ویسے ہی متبسم تھیں اور اس کے قہقہے ویسے ہی مترنم۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔

اور اس سال مسوری میں اس کا شوہر جس کی اپنے مخصوص مشغلہ میں دلچسپی ویسی ہی برقرار تھی، سوسائٹی کے ایک بہت زبردست اسکنڈل میں انوولو (INVOLVE) ہوگیا اور نئی دہلی کے ایک "نائٹ" کی لڑکی نے اسے کورٹ تک پہنچانے کی دھمکی دی۔ وہ یہ سب باتیں برداشت نہیں کرسکی۔ اس نے خاموشی سے طلاق لے لی اور ایک بار پھر لکھنؤ واپس آگئی۔ اس کا بچہ اسے نہیں مل سکا بڑی کنور رانی صاحبہ نے اس سے بولنا چھوڑ دیا۔ بڑے بھیا نے اس سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرلیا لڑکو کسی ٹریننگ کے لئے امریکہ جا چکا تھا۔

اور اس وقت اسے ایلمر بریڈلے کا خیال آیا۔ وہ ابھی ہندوستان ہی میں تھا۔ اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے چکی ہے۔ وہ اپنے بچے کو کسی طرح نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ اس کو نہیں مل سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ کی ریاست کا ولی عہد تھا۔ اس کے لئے اس نے خود تلاش کرکے ایک عمدہ سی گورنس بھجوائی اور اس کے پہلے شوہر نے وعدہ کرلیا کہ وہ جب چاہے بچے کو آکر دیکھ سکتی ہے۔ وہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

اور اس کے چاروں طرف اتنا گہرا، اتنا سرخ، اتنا بھاری اندھیرا چھا گیا کہ وہ اپنی آنکھیں نہ کھول سکی۔ فضاؤں میں وحشت اور ویرانی کی تاریک روحیں زور زور سے چیخیں مارنے لگیں۔ ہوائیں روتی رہیں۔ سرخ دریا کے کنارے سے دھواں بلند ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ ساری کائنات پر چھا گیا۔ پرشور طوفان کی زد میں کر تیزی سے گھومتے ہوئے نڈھال چاند کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اتھاہ تاریکی میں گم ہونے لگے۔

اور ایلمر بریڈلے سے اس کی سول میرج ہوگئی۔

سارے صوبے کی سوسائٹی میں اچھا خاصا تہلکہ مچ گیا۔ انڈین پولیس کے ایک یوروپین آفیسر نے ایک ہندوستانی تعلقہ دار کی لڑکی سے شادی کرلی۔ گورنر سمیت سارا یوروپین طبقہ تلملا اٹھا۔ لیکن ایلمر بریڈلے خاموشی سے اسے اپنے ساتھ لیکر چند ہفتوں کے لئے کشمیر چلا گیا۔

اور اس کے کچھ عرصے بعد اس کے پہلے شوہر نے اپنے خاندان کی ایک پردہ نشین لڑکی سے دوسری شادی کرلی جو اس کی تفریحات میں قطعی مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔

وہ کشمیر سے الہ آباد آئی دن تیزی سے پرواز کرنے لگے۔ اس کا دل بے انتہا چاہ رہا تھا کہ اپنے بچے کو دیکھے لیکن ایلمر کو قطعی گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی سے کسی قسم کا تعلق بھی قائم رکھے۔

پھر اس سال مسوری میں ایسا اتفاق ہوا کہ سوائے میں اپنے برابر والے سوٹ میں اس کا پہلا شوہر مع اپنی بیوی اور اس کے بچے کے آکر ٹھیرا۔ اکثر لان پر اسکو اپنا بچہ کھیلتا ہوا نظر پڑ جاتا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس جاتی اسے چوکولیٹ اور کھلونے دیتی۔ بچہ ممی ممی کہہ کر اس کی ساری کے آنچل یا دوپٹے کے پلو کو اپنی طرف کھینچتا لیکن وہ جی پر جبر کرکے اسے گورنس کے پاس چھوڑ کر اپنے کمروں کی طرف چلی آتی۔ اس کے پہلے شوہر کا حکم تھا کہ بچے کو یہ بالکل معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کی ماں کا دوسرا شوہر ایک انگریز ہے اور اس کے سوتیلے بہن بھائی اینگلو انڈین ہوں گے۔

اور مسوری کا سارا سیزن اسی طرح گذرا۔ اور وہ چپکے چپکے خدا سے دعا مانگتی رہی کہ وہ مرجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور اس وقت وہ ایک چٹان پر کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ لہروں والے بال اسکارف میں سے نکل نکل کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس کی ساڑی ہوا کے تھپیڑوں سے مخالف سمت میں اڑی جا رہی تھی۔ اور وہ اکتا کر دوربین کے ذریعے وادی کا نظارہ کر رہی تھی۔ چٹان کے نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک پر موٹریں اور بسیں کنکھجوروں کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھیں یا نیچے اتر رہی تھیں۔ ایلمر کیمرہ لیکر پہاڑی کی چوٹی کی طرف چڑھ گیا تھا اور وہاں سے اس کو آواز دے رہا تھا اور اسے ایک طویل سفید اسٹیشن ویگن نظر آئی جو لہراتی ہوئی سڑک پر اوپر چڑھ رہی تھی۔ اور اس نے دوربین اپنی آنکھوں پر سے ہٹا دی۔

پھر وہ ایلمر کا سہارا لیکر چٹان سے نیچے اتر آئی۔ اور ایلمر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اب (COMPENSATION) لیکن ولایت واپس جانا چاہتا ہے اور اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے انگلستان کے خوبصورت پرسکون قصباتی مکان میں اور سیب اور چیری کے شگوفوں کے درمیان پہلے سے کہیں زیادہ خوش رہ سکے گی۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے قسمت۔ قسمت کی ستم ظریفیاں۔ کم از کم اس کو اب تک یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنے پیارے بچے کو جس سے اسے بیحد محبت تھی کبھی کبھی دیکھ سکتی تھی۔ پر اب وہ بھی اس سے ہمیشہ کے لئے چھٹ رہا تھا۔ وہ انتقاماً اپنی پہلی شادی کے لئے راضی ہوگئی تھی، پھر انتقاماً اس نے اپنے پہلے شوہر کو طلاق دیدی تھی۔ اب اس تیسرے شخص سے انتقام لیکر وہ کہاں جاسکتی تھی۔

اور رات ہو رہی تھی۔ وہ سب تاج کے ٹیرس پر بیٹھے تھے۔ ایلمر وطن جانے کی خوشی میں سیٹیاں بجا رہا تھا اور اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا تھا کہ وہ مشرق کی الف لیلوی سرزمین میں آکر یہاں سے ایک سچ مچ کی چھوٹی سی سوتی جاگتی گڑیا ایسی "پرنسس" کو اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ وہ ریلنگ پر جھک گئی۔ اس نے دیکھا نچلی منزل سے وہ لفٹ کے ذریعے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ جو کسی سرکاری کام سے انگلستان بھیجا جا رہا تھا اور وہ ان ہی کے جہاز میں سفر کرنے والا تھا۔ وہ سب ایک ساتھ ٹہلتے ہوئے گیٹ وے آف انڈیا

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ہمسائے

(افسانہ)

غلام عباس

اس پہاڑی پر وہ فقط دو ہی گھر تھے مکان تو اصل میں ایک ہی تھا مگر بعد میں اس کے مالک نے اسکے بیچوں بیچ لکڑی کی ایک تپلی سی دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اب اس میں الگ الگ دو خاندان رہتے تھے پہاڑوں پر مکان ویسے ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اس پر دو حصوں میں بٹ جانے سے اسکی مکانیت محض نام کو رہ گئی تھی۔ چنانچہ اگر اس کے رہنے والوں کو یہ تسلی نہ ہوتی کہ وہ گرمی کا زمانہ پہاڑ پر بسر کر رہے ہیں تو وہ بہت ہی آزردہ رہا کرتے۔

لکڑی کا بنا ہوا مخروطی وضع کا یہ مکان جس پر سرخ روغن ہو رہا تھا، پہاڑی کی ایک ڈھلان پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے لکڑی کا ایک لمبا زینہ چڑھنا پڑتا تھا۔ مکان کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی جسکو ہموار کر کے پھلواری بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر وہ پھلواری بے توجہی کا شکار ہو کے رہ گئی تھی اور اب اس میں ڈیلیا کا ایک آدھ پودا ہی رہ گیا تھا جو گویا بڑی وضعداری سے اس کی یاد کو قائم رکھنے پر مُصر تھا۔

اس پھلواری کے سرے پر لکڑی کا ایک بنچ رکھا تھا۔ اس پر بیٹھئے تو نیچے وادی کا حسین مگر اداس اداس سا منظر دکھائی دیتا جتنی دیر سورج غائب رہتا ہلکی سی دھند گردی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔ جب سورج نکلتا تو وہ دھند سنہری ہو کر چند لمحوں کے لئے اس رقبے کو اور بھی حسین بنا دیتی مگر جلدی آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی اور دیکھنے والا اپنی نظریں پھیر لیتا۔

اگست کی ایک صبح کو ابھی سورج نے مشرقی سلسلہ کوہ کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گھر میں سے نکلا اس کی عمر مشکل سے آٹھ برس کی ہوگی۔ اس نے سرخ اون کا پل اوور اور نیکر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بادامی رنگ کے بوٹ تھے۔ جن کے کنارے مینہ کے پانی میں بھیگ بھیگ کے سیاہ پڑ گئے تھے۔ لکڑی کے برآمدے سے اترتے ہی لڑکے کی نظریں بے اختیار ساتھ والے گھر کی طرف اٹھ گئیں۔ مگر اسکا دروازہ ابھی بند تھا۔ لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح مایوس پلٹیں گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو جسے دکاندار اپنی سستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔

اس کے بعد لڑکے کی نظر ڈیلیا کے پودے پر پڑی جس میں ایک بڑا سا سرخ پھول صبح کی سنہری دھوپ میں بڑی تمکنت سے جھوم جھوم رہا تھا۔ اس پھول نے لڑکے کے دل کو لبھا لیا اور وہ لپک کر اس کی طرف گیا وہ کئی لمحوں تک حیرت سے اس کی طرف تکتا رہا۔ اوس کی ننھی ننھی بوندیں اسکی پنکھڑیوں پر لرز رہی تھیں اور قریب سے دیکھنے سے ان میں پھول کا عنابی عکس جھلکتا ہوا بہت بھلا لگتا تھا۔ لڑکے نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر پر نظر ڈالی۔ مگر اس کی یہ حرکت محض اضطراری تھی اور پھر اس نے بڑی احتیاط سے پھول کو توڑ لیا۔

وہ خوشی خوشی پھول کو ہاتھ میں تھامے ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا اور کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس دروازے کے اوپر کے آدھے حصے میں شیشے جڑے ہوئے تھے جن میں سے اندر کا اودے سے رنگ کا ملگجا سا پردہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ دروازہ کھٹکھٹائے یا نہیں کہ اتنے میں لکڑی کے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی۔ لڑکا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اسکا وہ ہاتھ جس میں ڈیلیا کا پھول تھا۔ آپ سے آپ پیٹھ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک بھاری بھرکم آدمی شب خوابی کا لباس پہنے کمبل کی بکل مارے ایک ہاتھ سے مسواک کرتا اور دوسرے میں تھیلا تھامے باہر نکلا۔ پہلے تو اس نے لڑکے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر برآمدے سے نیچے قدم رکھتے ہی وہ مڑا۔

"کیا بات ہے اکبر میاں؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں" لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اچانک مدھم پڑ گئی تھی۔

"ببری سے کھیلنے آئے ہو؟"

"جی ......" اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ببری تو سو رہی ہے ابھی"

لڑکے نے نظریں جھکا لیں مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ اکبر میاں؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی پھول ہے" اور اس نے ڈرتے ڈرتے پھول سامنے کر دیا۔ اسکا چھوٹا سا ہاتھ شبنم سے ابھی تک گیلا ہو رہا تھا۔

"ببری کے لئے؟"

"جی ......"

"ببری تو سو رہی ہے اور پھر ابھی سویرا بھی تو ہے"

لڑکے نے اسکا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

"آج اتوار ہے نا؟ تم اور ببری دن بھر خوب کھیلنا" یہ اس نے چلتے چلتے کہا۔ پھر وہ مسواک کرتا ہوا کاٹھ کے زینے سے اتر گیا اور اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی جب تک اس پگڈنڈی کے پیچ و خم اور اس کی جھاڑیاں اسے کبھی چھپاتی کبھی دکھاتی رہیں اکبر برابر برآمدے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا اور آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اکبر نے ایک اور مایوسانہ نظر اس کمرے پر ڈالی اور پھر برآمدے سے اتر کر ڈیلیا کے پودے کے پاس چلا آیا۔ اب اس پودے میں کوئی دلکشی

نہیں رہی تھی۔ وہ شاخ جس سے اس نے پھول توڑا تھا لُنجی لُنجی سی نظر آ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو:-

"اب مجھ میں اور کوئی پھول نہیں لگے گا"

اکبر پودے کے پاس سے ہٹ آیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج اب لمبے لمبے پہاڑی بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا اور اس نے تمدہو کر اپنا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھند جو نچلی وادی پر چھائی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے دھوپ میں تحلیل ہو رہی تھی اور نیچے کا منظر لحمہ بہ لحمہ نکھرتا آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں میں انسانی چہرے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی اضطراری حرکتیں ان سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ نے جس پر ابھی نیند کا اثر تھا جسم کی حرکات پر قابو پانا شروع نہیں کیا۔

نیچے ایک مکان کی انگنائی میں، جو نشیب میں واقع تھا۔ ایک گرہستن بچوں کے چھوٹے چھوٹے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہی تھی قریب ہی دیوار کی ایک شاخ پر ایک خوش رنگ چڑیا اپنی لمبی چونچ سے اپنی دم کے بال سونت رہی تھی کبھی کبھی وہ اداسی سے چہک بھی اٹھتی تھی۔

اکبر اس نظارے میں ایسا محو ہوا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس نے ڈیلیا کے پھول کی ایک پتی نوچ لی۔ جب اسے اپنی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے ایک ایک کر کے ساری پتیاں نوچ ڈالیں اور ڈنٹھل کو ہوا میں اچھال دیا اس کا خیال تھا کہ وہ ڈنٹھل کو نیچے دور تک کھڈ میں گرتے دیکھتا رہے گا۔ مگر وہ تھوڑی ہی دور پر ایک جھاڑی میں اٹک کر رہ گیا۔

ایکا ایکی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سورج کی ساری دوڑ دھوپ کو بادلوں کے ایک جھرمٹ نے چھپا لیا۔ اور پھر ایک ہی دم بوندیاں آنے لگیں۔ گرہستن نے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جلد جلد سارے کپڑے الگنی پر سے اتار لئے۔

جس گھر سے اکبر نکلا تھا اسی میں سے ایک اور لڑکا دوڑتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کا لباس بھی قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا اکبر کا تھا۔ مگر اس کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہ ہو گی۔

"بھائی جان" اس نے چلا کر کہا "امی بلا رہی ہیں"

اکبر نے کچھ جواب نہ دیا۔

"بھائی جان امی کہتی ہیں ناشتہ کرو"

اکبر نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بدستور گھر کی طرف پیٹھ کئے بنچ پر بیٹھا رہا۔

لڑکا اندر چلا گیا۔ مگر پل بھر کے بعد وہ پھر آیا۔

"بھائی جان امی خفا ہو رہی ہیں" اس نے کہا۔

"سُن لیا سن لیا" اکبر نے بالآخر گردن پھیر کر کہا "آتا ہوں۔ آتا ہوں"

چھوٹا لڑکا پھر اندر چلا گیا۔ ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک عورت جس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والی نفشئی رنگ کی ساری کو کولھے پر سے سنبھالتی ہوئی برآمدے میں نمودار ہوئی۔

"اکبر بیٹے" اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا "اندر کیوں نہیں آتے میرے لعل۔ ناشتہ کیوں نہیں کرتے۔ بوندیاں آ رہی ہیں اور تم مینہ میں بیٹھے بھیگ رہے ہو۔ واہ بھئی واہ۔ ...... اور کہیں زکام ہو گیا تو ابھی تو بیماری سے اٹھے ہو۔ جلدی سے آ جاؤ، میرے پیارے"

"میں آ رہا تھا امی جان" اکبر نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مینہ سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتا، سہج سہج قدم اٹھاتا برآمدے میں آیا اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سامنے والے گھر کے دروازے پر نظر ڈالی۔

مینہ کوئی آدھ گھنٹہ تک برسا کیا۔ اس کے بعد ایک دم مطلع صاف ہو گیا اور سورج نے پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو کے اپنا سفر شروع کر دیا۔

دونوں لڑکے پھر اسی گھر سے نکلے۔ اکبر تو ڈیلیا کے پودے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور چھوٹا لڑکا سامنے والے گھر کے برآمدے میں پہنچا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بے دھڑک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"بیری" اس نے چلا کر کہا۔

"بیری" اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اور بھی زور سے چلا کر کہا "تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں۔ سچ مچ کا ہوائی جہاز ہے ان کے پاس۔ آ کر دیکھو"

"کیا ہے منیر میاں" اندر سے ایک ننھی سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو" منیر نے کہا۔

"چٹخنی لگ رہی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں جاتا۔ امی باورچی خانے میں ہیں"

"رات ماموں بڑا اچھا ہوائی جہاز لائے ہیں"

"کہاں ہے وہ ہوائی جہاز"

"بھائی جان کے پاس"

"اچھا میں آتی ہوں"

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی چھ برس کی ہو گی برآمدے میں آئی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا پھولدار ریشمی فراک اور گلی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر فیروزی اون کا کٹ نما سویٹر تھا۔ دونوں کانوں پر ایک ایک چٹیا تھی جس کے سرے پر سفید ربن بندھا ہوا تھا۔ سینے پر آسمانی رنگ کے ہوائی ریشم کا ننھا سا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سبز سوئیڈ کے سینڈل تھے۔

ان دونوں بھائیوں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ ایک جھونکے کی طرح ان کے پاس پہنچی۔ جیسے ہی منیر کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ٹھٹھا مار کے ہنسنے لگا۔

"اوہو ہو بیری" اس نے کہا "کتنا پوڈر مل رکھا ہے تم نے۔ تمہاری پلکیں کیسی سفید ہو رہی ہیں پوڈر سے"

"کب؟" لڑکی کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

"چپ رہو منیر" اکبر نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ بتائی۔

"ذرا شیشے میں جا کر منہ تو دیکھو" منیر نے کہا۔

بیری نے انگلی سے اپنے گال کو چھوا۔ تھوڑا سا پوڈر اس کی انگلی کے سرے پر لگ گیا۔

"دیکھا... "

"بس جی بس" بیری نے اچانک بگڑ کر منیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم نہیں بولتے تم سے"

"منیر تم چپکے نہیں رہے تو میں پیٹ دوں گا تمہیں" اکبر نے منیر کو آنکھیں نکالیں۔

"اکبر میاں" بیری، منیر کو بالکل نظر انداز کر کے گویا وہ وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اکبر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کہاں ہے ہوائی جہاز جو تمہارے ماموں رات لائے تھے؟"

"ابھی دکھاتا ہوں"

"ہے کہاں وہ؟"

"گھر میں رکھا ہے"

"تو لاؤ ابھی"

"ابھی لاتا ہوں"

"نہیں ابھی لاؤ"

"گھر میں رکھا ہے۔ چل کے دیکھ لو نہ اندر"

"نا بھئی ہم نہیں جانے کے تمہارے گھر۔ اس دن تمہاری امی خفا ہوئی تھیں ہم پر"

"واہ تم پر تھوڑا ہی خفا ہوئی تھیں۔ وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھیں"

"تو تم یہیں لے آؤ نہ ہوائی جہاز"

"اچھی بات۔ تم یہیں ٹھہرو۔ جانا نہیں میں ابھی لاتا ہوں" اور وہ گھر کی طرف دوڑا۔ منیر ٹکٹکی باندھے بیری کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مگر بیری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ نیچے وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

عین اس وقت وہ شخص جو صبح کمبل اوڑھے تھیلا لے کے گیا تھا۔ کاٹھ کے زینے پر چڑھتا دکھائی دیا۔ اور بیری مارے خوشی کے "ابا جان" "ابا جان" چلاتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

جس وقت اکبر ہوائی جہاز لے کر گھر سے باہر آیا۔ تو بیری اپنے ابا کے تھیلے کو جو پھل اور سبزی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف سے پکڑے ان کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

پانچ منٹ گزر گئے اکبر اور منیر بنچ کے پاس کھڑے بیری کی راہ دیکھا کئے۔ مگر وہ باہر نہ آئی۔ اکبر نے منیر کو ہوائی جہاز دے کر کہا "یہ ہوائی جہاز لے جا کر بیری کو دکھا دو"

"آپ نہیں چلتے؟"

"نہیں۔ میں یہیں ٹھیرتا ہوں۔ کہنا تمہیں بھائی جان بلا رہے ہیں" نیا باتش لکڑی کا یہ ہوائی جہاز جس پر ہلکا آسمانی رنگ چڑھا تھا۔ خاصا بڑا تھا۔ منیر بڑی مشکل سے اسے سنبھالتا ہوا بیری کے دروازے پر پہنچا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اسے اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

"بیری" اس نے باہر ہی سے چلا کر کہا "لو دیکھو یہ ہے ہوائی جہاز"

بیری آم چوستی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔

"چیخ کیوں رہے ہو" اس نے کہا "اچھا تو یہ ہے ہوائی جہاز جو کل تمہارے ماموں لائے تھے۔ اوہ کتنا بڑا ہے"

"بھائی جان سامنے کھڑے ہیں۔ تمہیں بلا رہے ہیں"

بیری اور اکبر کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اکبر اسے دیکھ کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔

"منیر میاں" بیری نے کہا "اپنے بھائی جان سے کہو یہیں ٹھہریں آؤں گی ہم آم چوس رہے ہیں اس وقت"

منیر ہوائی جہاز لے کر اکبر کے پاس پہنچا۔ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے اور وادی کی سیر دیکھنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے مگر بیری نہ آئی۔

آسمان پر رفتہ رفتہ بادل پھر چھا گئے تھے۔ ایکا ایکی بادل بہت گھنے اور قریب تھے چنانچہ ہر طرف بھاپ ہی بھاپ پھیل گئی جس نے ہر چیز کو اوجھل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم زور کا جھالا پڑنے لگا۔ چنانچہ اکبر اور منیر کو ہوائی جہاز اٹھا گھر میں گھستے ہی بنی۔

بارش کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ تک رہی اور اس کے بعد پھر دھوپ نکل آئی

"بیری" اکبر ایک ہاتھ میں ایک بڑی سی گیند لئے جس پر انگریز بچوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور دوسرے میں ایک بڑی سی انگریزی کتاب تھامے بیری کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"بیری" اس نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔

"کیا ہے اکبر میاں؟" بیری نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو آئیں ہی نہیں!"

"کب؟"

"اس وقت"

"واہ مینہ جو پڑ رہا تھا موسلا دھار۔ کہاں ہے ہوائی جہاز؟"

"وہ تو میں نے رکھ دیا لو دیکھو یہ تصویروں کی کتاب"

"اسی لڑکی کی کہانی ہو گی جو چلیا نہیں کرانی تھی؟"

"ہاں"

"واہ۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں" اس نے تنک کر کہا۔

"اچھا تو آؤ گیند سے کھیلیں"

"ہم گیند سے نہیں کھیلتے بھئی۔ امی کہتی ہیں گیند کیچڑ میں بھر جاتی ہے۔ تو کپڑے گندے ہو جاتے ہیں"

"اچھا چلو اس بنچ پر بیٹھیں"

"ابھی ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ امی کہتی ہیں ڈھلوان ہو رہی ہے وہاں نہ جانا۔ پاؤں رپٹ گیا تو کھڈ میں گر گے تو ہڈی پسلی چور چور ہو جائے گی"

"اچھا تو ہم تمہارے برآمدے ہی میں کھیلیں گے"

"ابھی شام کو کھیلیں گے۔ اس وقت تو ہم ابا اور امی کے ساتھ کپڑا لینے جا رہے ہیں"

دور بنچ پر تھوڑی ہی دیر بعد بیری ابا کی انگلی پکڑے تینوں سے اس وقت انگریزی کوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ کے رینے سے اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے اس کی امی سفری وضع کا سیاہ ریشمی برقعہ پہنے ان جیسی ہوتی آ رہی تھیں۔ اکبر بنچ پر بیٹھا ان لوگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر بار بار بیری پر پڑتی تھی جس نے آج کلی دار پاجامہ اور دھیلا دھالا زرد کوٹ پہن لیا تھا۔ دور سے اس کی گوری گوری بھری بھری بانہیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان کے پاس بھورے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑ اڑ کے بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی تھی جسے وہ اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے ہٹا ہٹا رہی تھی۔

اکبر اسی بنچ پر بیٹھا دیر تک اس چھوٹے سے سست گام قافلے کو پگڈنڈی کی بھول بھلیوں میں ابھرتے اور غائب ہوتے دیکھا کیا۔ آخر جب وہ پہاڑی کے سب سے نچلے موڑ پر آخری جھلک دکھا کر اوجھل ہو گیا تو اس نے اپنی نظریں اس طرف سے ہٹائیں۔

بارش کبھی کی تھم چکی تھی۔ مگر ہوا کا کوئی تیز جھونکا چلتا تو دیودار کے درختوں سے بوندیاں جھڑنے لگتیں۔ دور کہیں کوئی نالہ بہہ رہا تھا جس کا پانی بارش کی وجہ سے زیادہ تیزی سے بہنے لگا تھا۔ اس کی شائیں شائیں کی آواز یہاں ایسی صاف سنائی دے رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا نالہ کہیں آس پاس ہی بہہ رہا ہے۔ ایک درخت پر ایک بڑا سا نیل کنٹھ اپنی کھوکھلی آواز سے چیخا پر تولے۔ ہوا میں ایک قلندری اور پھر دوسرے درخت پر جا بیٹھا۔ بظاہر اس نقل مکانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

دور افق کے پاس وہ پہاڑیاں جو عموماً بادلوں کے غبار میں کھوئی رہتی تھیں۔ اچانک مطلع صاف ہو جانے سے اب واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ سے کر جھانک رہی ہوں بعض پہاڑیاں ہری بھری تھیں۔ اور بعض لنڈ منڈ۔ مگر وہ آپس میں ایسی خلط ملط ہو رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بستر سے لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ اور کہیں تو لحاف کی اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہو۔ اور کہیں اندر کا خاکستری استر۔

اکبر اس نظارے کو ایسی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ اس کے تین ہم جماعت اس کی بنچ کو گھیرے کھڑے ہنس رہے ہیں۔

"ادھر تم لوگ کدھر؟" وہ چونک اٹھا۔ "تم کب آئے؟"

"اکبر میاں" ان میں سے ایک نے کہا "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ چلو ہمارے ساتھ فٹ بال کھیلنے"

"تم جاؤ مجھے کام ہے بھئی"

"ارے کام وام کبھی نہیں۔ تمہیں چلنا ہوگا۔ دیکھو ہم نے آج ہی تو یہ نیا فٹ بال خریدا ہے"

"نہیں میں آج نہیں جاؤں گا"

"آخر کیوں؟"

"مجھے کام ہو رہا ہے بھئی"

"کیسا کام؟"

"کیسا کام......... واہ اسکول کا کام تو دیا تھا ماسٹر صاحب نے"

"تو تم بالکل نہیں چلوگے؟"

"نہیں آج نہیں کل" اور وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔

"رہنے دو بھئی" ایک لڑکے نے کہا "نہیں چلتا تو نہ چلے" اور وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

شام کے کوئی پانچ بج چکے تھے کہ بیری اپنے ابا اور امی کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔ ابا جیب سے چابی نکال کر گھر کا دروازہ کھولنے لگے۔ امی برقعہ اتار کر برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں بیری گھر میں بقچہ چھوڑ کر باہر بنچ کے پاس آ گئی جہاں اکبر بیٹھا ہوا تھا۔

"بیری تم آ گئیں" اور وہ جلدی سے بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں" بیری نے جواب دیا۔

"کپڑا خرید لیا؟"

"ہاں۔ میرا بڑا اچھا ریشمی سوٹ بنے گا۔ اس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول ہیں۔ پھر ابا نے مجھے بنارسی اوڑھنی بھی لے دی۔ اور نئی سینڈل بھی۔ پھر ہم نے سینٹ بھی خریدا۔ لپ اسٹک بھی اور نیل پالش بھی" اس کی آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

"بیری تم........."

"مجھے بیری نہ کہا کرو جی" ایک لمحہ ہی میں وہ بگڑ گئی۔

باقی صفحہ ؟

جب ہمارے زمانے کی نامکمل اور ناقص تہذیب کسی آدمی کے ذمے یہ بے تکا کام لگا دیتی ہے کہ وہ سر پر ایک لمبی سیڑھی اٹھائے۔ لمپ کے ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک پھرتا رہے اور پھر ہر کھمبے پر دن میں تین مرتبہ یعنی صبح کو تو لمپ بجھانے اور بعد دوپہر اس کو صاف کرنے اور شام کو اس کو جلانے کے لئے چڑھے اترے تو یہ آدمی خواہ اس کا دماغ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو یا وہ بکا شرابی ہی کیوں نہ ہو اپنے آپ سے الجھے بغیر نہیں رہ سکتا اور جب وہ اپنے آپ سے الجھتا ہے تو اپنے ساتھ اپنی سیڑھی جیسی اونچی دلیلیں پیش کرتا ہے۔

اس قصبہ کے لمپ صاف کرنے اور جلانے والے کا نام کاکو تھا۔ ایک روز شام کو یہ شراب کے نشے میں سیڑھی پر سے نیچے گرا اور اس کا سر پھٹ گیا اور ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ بس یہ ایک معجزہ سمجھئے کہ اس کی جان بچ گئی۔ بہر حال دو مہینے اسپتال میں رہنے کے بعد جب وہ نکلا تو ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی ہو گئی تھی اور ماتھے پر زخم کا ایک بدنما نشان تھا۔ سر کے بال اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے پھر پہلے کی طرح اسی نیلی قمیص میں سر پر سیڑھی لیکر لمپ کے ایک کھمبے سے دوسرے تک پھرنا شروع کر دیا جب وہ اس بلندی پر پہنچا جہاں سے گرا تھا تو اس کے دل میں برابر یہ خیال آتا کہ انسان کی بعض ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں کہ نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ہوتی ہیں مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کی تمام خرابیوں کا خیال نہ کرے لیکن اس کے باوجود اس کا فرض ہے کہ اپنی بیوی کی طرف سے غافل نہ رہے۔ اور اگر وہ اپنی بیوی کا خیال نہیں کرتا تو تمام لوگ اور یہاں تک کہ بچے بھی اس کا مذاق اڑائینگے اور اس پر آوازے کسیں گے۔

"کاکو! یہ لمپ کب صاف کرکے رکھے جاتے ہیں؟"

"ابے تنے کے بچے یہ بات تو اس وقت مجھ سے پوچھتا ہے جب میں تمام قصبہ روشن کرنے جا رہا ہوں"! کاکو سیڑھی پر سے چیخا۔

بیوی کی بدتمیزیوں اور بدکرداریوں سے چشم پوشی کرنے کیلئے قصبہ کو روشن کرنے کا بہانہ بھی کیا خوب ہے۔ مگر کیا اس کو ساری باتیں معلوم ہیں؟ کیا وہ مٹی کے تیل سے جلنے والے چراغ کی روشنی میں وہ منظر دیکھتا ہے جب لوگ زبردستی دروازے کو دھکا دیکر کھولتے اور اندر آتے ہیں اور اس تنگ و تاریک گلی میں ایک دوسرے پر چھرے سے حملہ کرتے ہیں۔

وہ سب چور ہیں! بے حیا ہیں!! قاتل ہیں!!!

ایک روز کاکو میونسپلٹی کے دفتر میں اسسٹنٹ بستی (DISSI) کے پاس سلام کرنے گیا۔ بستی ہی نے یہ ملازمت کاکو کو دلائی تھی اور آمدنی کی کچھ صورت بھی بتائی تھی جس کی وجہ سے کاکو اپنا کام بڑی محنت اور تندہی سے کرتا تھا۔ کاکو نے بستی کے سامنے اپنا معروضہ پیش کیا اور پوچھنے لگا کہ کیا میں روشنی جلاتے وقت سرکاری ملازم نہیں ہوں جو اپنا فرض ادا کر رہا ہو۔

"بے شک تم سرکاری ملازم ہو" بستی نے جواب دیا۔

"اس لئے جو میری ہتک کرتا ہے وہ گویا ایک سرکاری ملازم کی اپنے فرائض کی انجام دہی کے وقت ہتک کرتا ہے۔ کیا یہ بات بالکل ٹھیک نہیں ہے؟"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز گفتگو بستی کو کچھ پسند نہیں آیا خصوصاً جب اس کو کاکو کی شکایتوں کی حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے نہایت خوش مزاجی اور اچھے انداز سے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان شکایتوں کا تعلق اس کی ملازمت سے بالکل نہیں ہے۔

"نہیں، جناب عالی، آپ یقین مانیئے جو میں عرض کر رہا ہوں"

"جناب عالی" کہتے وقت کاکو کی پلکیں اس طرح حرکت کرنے لگیں جیسے وہ کوئی عمدہ شراب چکھ رہا ہو۔ اس حالت میں وہ برابر پوری فراخدلی کے ساتھ جناب عالی کا لقب استعمال کرتا جاتا تھا۔ شاید سچ کے طور پر بستی کو حق نہیں کہ اس کو اتنے اونچے لقب سے خطاب کیا جائے مگر کاکو اس کو برابر اسی لقب سے مخاطب کرتا رہا۔ گو بستی کے پاس یہ خطاب نہیں مگر اور دوسرے خاصے اونچے خطابات ہیں۔

کاکو ان تمام خطابات اور مخاطبت کے درجے سے بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔ آداب سے بھی وہ بے خبر نہیں۔ اگر بات کرتے وقت اس کی ناک سے ذرا ایک قطرے ٹپک پڑتے ہیں تو وہ ہتھیلی کی پشت سے پوچھ لیتا ہے مگر پوچھتے وقت اپنی نیلی آستین منہ کے سامنے کر لیتا ہے۔

پھر بڑے نرم لہجہ میں اور خوش انداز سے مگر ذرا الجھاؤ کے ساتھ بستی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر اس

ہتک ہیں جس کی وہ شکایت لیکر آیا ہے کوئی اصلیت ہے تو اس کو وہ صرف اسی وقت برداشت کر سکتا ہے جب وہ لیمپ کے کام میں لگا ہوتا ہے کیونکہ جب وہ سرکاری کام نہیں کرتا تو اُس وقت اس کی حیثیت محض شوہر کی ہوتی ہے اور پھر اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی بھی اس سے کسی قسم کی اہانت آمیز بات نہ کرے اُس کی بدبیت اور نہ اس کی بیوی کی بابت کرے اس کی طرح اس کی بیوی بڑی عقلمند وفا شعار اور ناقابل ملامت ہے۔ اور اس کو اپنی بیوی کی کسی لغزش کا علم نہیں۔

"جناب عالی، جب میں قصبہ کو روشن کرتا ہوں تو لوگ میری ہتک کرتے ہیں اسی طرح جب میں کھمبے کے سہارے سیڑھی رکھے اس پر کھڑا ہو کر اور دیوار پر دیا سلائی رگڑ کر لیمپ روشن کرنا چاہتا ہوں تو لوگ میری بے عزتی کرتے ہیں کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ میں قصبہ کو اندھیرا چھوڑ کر گھر یہ دیکھنے نہیں جا سکتا کہ میری بیوی گھر پر کیا کر رہی ہے اور کس کے ساتھ سرگرم اختلاط ہے اور نہ اس حرامزادے کی تکہ بوٹی کر سکتا ہوں جو میرے گھر میں موجود ہو۔ تو جناب عالی، یہ ہے سارا معاملہ"

جب کاگو "اس حرامزادے کی تکہ بوٹی" کے لفظ پر پہنچا تو اس پر اس نے ایک بے بسی کی مسکراہٹ کے ساتھ زور دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بہ حیثیت ایک ایسے خاوند کے جس کی توہین ہوئی ہو ایسا کرنا اس کا حق ہے حالانکہ وہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر کیا کیا جائے کہ صورت حال ایسی ہی ہے۔

"کیا جناب عالی کوئی اور ثبوت چاہتے ہیں؟ چاندنی راتوں میں جب لیمپ نہیں جلائے جاتے تو مجھے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ آخر کیوں؟ اسی لئے نا کہ ان شاموں کو میں سرکاری ملازمت پر نہیں ہوتا"

کاگو کے دلائل خوب ہوتے ہیں لیکن اچھی دلیل کافی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ واقعات کا بھی ذکر کیا جائے۔ اور جب واقعات بیچ میں آتے ہیں تو اکثر اچھی اچھی دلیلیں دھری رہ جاتی ہیں اور منہ کے بل اوندھی گر پڑتی ہیں جیسے وہ خود مدہوش سیڑھی پر سے گرا تھا۔

بسی نے پوچھا کہ "اس قسم کی دلیلوں سے تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری متاہلانہ زندگی کی بدبختی تمہاری سرکاری ملازمت پر قائم ہے تو تمہارے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ تم سرکاری ملازمت چھوڑ دو اور اگر نہیں چھوڑنا چاہتے تو خاموش رہو اور لوگوں کو بکنے دو"

کاگو:- بالکل درست فرمایا آپ نے

بسی:- ہاں بالکل درست ہے۔

کاگو نے اس کے بعد ایک فوجی سلام کیا اور یہ کہکر کہ "یہ خادم ہر خدمت کے لئے حاضر ہے" واپس چلا آیا۔

سیڑھی سر پر لئے پھرتے اب اسے تکلیف ہونے لگی اور ہر روز اس کی تکلیف میں اضافہ ہونے لگا۔ مدتوں کے استعمال سے سیڑھی کے ڈنڈے گھس گئے ہیں اور کاگو ان پر اپنی ایک ٹانگ چھوٹی اور ایک بڑی ٹانگ سے چڑھتا ہے اور جب وہ ٹیلے کی چوٹی والی ڈھلوان سڑک کے آخری لیمپ کے کھمبے پر چڑھتا ہے اور سیڑھی پر ذرا اس انداز سے لیمپ کے نیچے والے دو طرف نکلے ہوئے لوہے کو پکڑ کر سر ایک کندھے کی طرف پھیرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لٹکا ہوا ہے ایک روز اسی حالت میں تھا کہ اس کے دل میں طرح طرح کے عجیب اور دردناک خیالات آنے لگے۔ وہ ان پر غور کرنے لگا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ ستاروں کا جھنڈ اکثر راتوں کو بڑا ہو جاتا ہے اور آسمان میں چھید کرتا ہے مگر اس میں اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ زمین کو روشن کر سکے۔

اس کی ساری روشنی دنیا والوں کے لئے بیکار ہے۔ لیکن کیا خوبصورت روشنی ہے! پھر سوچتا ہے کہ ایک رات میں نے خواب دیکھا تھا کہ ان ستاروں کو روشن کرنے کا کام بھی میرے ہی ذمے پڑا تھا اور اس رات کو میرے پاس ایک ایسی لمبی سیڑھی تھی جس کے دوسرے سرے کا پتہ ہی نہیں تھا اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ اتنی لمبی سیڑھی کیسے اور کس جگہ لگائی جائے۔ اُف! اس سیڑھی کا بوجھ کتنا تھا کہ میں اس سے بے قابو ہوا جاتا تھا وہ اتنی اونچی سیڑھی پر بھلا میں کیسے ستاروں تک چڑھتا۔ مگر یہ تو سب خواب تھا! مگر خواب میں مجھے کتنی پریشانی اور وحشت تھی۔

پھر سوچتا ہے کہ لیمپ جلانے کا پیشہ دراصل بڑا قابل رحم ہے کم سے کم میرے ایسے شخص کے لئے جو لیمپ جلاتے وقت دل ہی دل میں ہزاروں چیزوں کا خیال کرتا ہے اور ان پر بحث کرتا ہے۔ لیکن کیا ممکن ہے کہ اندھیرے کو روشنی سے دور کرنے کی عادت سے سخت اور تاریک سے تاریک دماغ میں خیال کی چمک پیدا ہو جائے۔

سوچتے سوچتے کاگو کا خیال بعض شاموں کو یہاں تک پہنچتا کہ بیشک وہ روشنی تو جلاتا ہے مگر وہ اندھیرا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کہ کوئی چیز بغیر اپنی ضد کے نہیں ہوتی۔ جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا۔ اور اندھیرا موت کی طرح ہے جو ہر جاندار جسم کا سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی زور سے اس کے کان میں چیخ کر یہی باتیں کر رہا ہو لیکن یہ دراصل خود اس کے خیال کی بازگشت تھی جس کا نتیجہ یوں معلوم ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ "ٹھہر! میں ابھی تیری خبر لیتا ہوں! اور موت کو تیرے پیچھے لگاتا ہوں!"

آخر میں کاگو سوچتا ہے کہ میرا پیشہ بھی کتنا اونچا اور اہم ہے کیونکہ یہ قدرت کی کمی کو پورا کرتا ہے لیکن آخر یہ کمی کس چیز کی ہے؟ یہ کمی سورج کی ہے۔

اور اس کو پورا کرنے والے اس دنیا میں بس دو ہی ہیں۔ ایک چاند اور دوسرا میں۔ اور ہم دونوں باری باری اپنا کام کرتے ہیں۔ جب چاند چمکتا ہے تو میں آرام کرتا ہوں لیکن میرے کام کی اہمیت ان شاموں کو خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے جب چاند کو چمکنا چاہیئے مگر نہیں چمکتا کیونکہ بادل اس کو چھپا لیتے ہیں اور دنیا کو روشن کرنے کا جو فرض اس کے ذمے ہے اسے پورا نہیں ہونے دیتے۔ چاند کا یہ فرض شاید چاند کو پسند نہ ہو مگر اس کے ذمے بہر حال ہے۔ اور بادل کی موجودگی میں زمین پر اندھیرا ہوتا ہے۔

رات کے وقت اندھیرے میں ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے روشن نقطے دور سے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شام کو جب کالو ٹیلے کی چوٹی پر آخری لیمپ جلاتا ہے تو آس پاس کے بہت سے قصبوں اور گاؤں کو روشن دیکھتا ہے اور پھر بڑی دیر تک سیڑھی پر کھڑے اور دکھتی ہوئی لوہے کی سلاخوں کو پکڑے ذرا سہارا لیکر دم لیتا ہے۔

ہاں یہ دور کی تمام روشنیاں ایسی ہیں جیسے موم بتیوں کی بارات سجی کھڑی ہو۔ اور یہ روشنیاں تمام رات اندھیرے میں تنگ و تاریک گلیوں کی نگہبانی کرتی ہیں جو بہ نسبت اس کے گاؤں کی گلیوں کے مفلسی اور تنگدستی سے زیادہ پُر ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ دور سے یہ روشنیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں ایک طرح کی دلکشی اور دلبستگی کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ اس اندھیرے میں کبھی ہوا کا ایک جھونکا سن سے گذر جاتا ہے اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جھونکے کے ساتھ یہ تمام روشنیاں بھی ایک ساتھ سانس لے رہی ہیں۔

دور سے ان روشنیوں کی طرف دیکھنے سے خیال بار بار انسانوں کی طرف جاتا ہے جو روئے زمین پر گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر کھوئے گئے ہیں اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش! وہ یکجا ہو کر ایک دوسرے کی ہمدردی اور مدد کرلتے مگر افسوس! صورت حال اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ایک جگہ کوئی نیا مکان بنتا ہے تو پاس دوسرے مکان کی جو دیوار اٹھتی ہے اس کی حیثیت ہمسائے کی نہیں بلکہ دشمن کی ہوتی ہے تاکہ پہلے مکان سے ہوا کے راستے بند کردئے جائیں اور منظر کی تمام خوش نمائیاں کم کردی جائیں۔ اگر لوگ یکجا ہوتے ہیں تو ہم سائگی، خوش طبعی اور ایک دوسرے کی مدد کے لئے جمع نہیں ہوتے مگر دراصل ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے کے لئے یکجا ہوتے ہیں۔ اور کالو کو ان تمام باتوں سے خوب واقف ہے کہ ہر گھر کے اندر لوگوں میں جنگ جاری ہے حالانکہ ان کا فرض ایک دوسرے سے محبت کرنا اور دشمنوں سے ایک دوسرے کی حفاظت کرنا ہے۔

اور کیا اس کے گھر میں اس کی بیوی خود اس کی شدید ترین دشمن نہیں ہے؟ اگر کالو شراب پیتا ہے تو محض اس لئے کہ اس سے ایک بے خودی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کو بعض ایسے فرائض کے تصور سے باز رکھتی ہے جس کو شاید وہ پوری طرح ادا نہیں کرسکتا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بالکل درست ہے کہ ان کے علاوہ بعض ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کا نہ ہونا اچھا تھا مگر اسکو کیا کیا جائے کہ وہ بہرحال ہیں اور انسان کو ان سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر تیل نہیں ہے تو بھلا لیمپ کیا جلے گا خاک!

معلوم ہوتا ہے کہ آج رات کو تمام قصبے میں اندھیرا رہیگا کیونکہ روشنی کے محکمے داروغہ میونسپلٹی میں تنخواہ نہیں ہے۔ کئی مہینے سے اس کو ایک پیسہ نہیں ملا ہے اور وہ اپنے پاس سے کوئی بارہ ہزار پیسہ خرچ کرچکا ہے اور وہ اب اس کام سے تنگ آکر الگ ہونا چاہتا ہے۔ دوپہر بعد آج کالو نے لیمپوں کو صاف نہیں کیا مگر شام کے وقت سیڑھی لیکر ادھر ادھر پھرنا شروع کیا تاکہ پچھلی رات کا جو تیل لیمپوں میں بچ رہا ہے اسی سے ان کو روشن کردے۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد اس نے لیمپوں کو روشن کرکے بجھا دیا اور پھر اس نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ لیکن اس کا یہ داؤ تو قصبہ کے تمام لوگ بگڑ بیٹھے اور اس لیمپ جلانے والے بیچارے کو قصوروار ٹھہرانے لگے۔ اگر وہ اس کو اس وقت پکڑ پاتے تو اس کی خوب ہی مرمت کرتے۔

مگر بعض لوگ اور سڑک کے لونڈے برابر کالو کو بیچ میں چھیڑتے جاتے ہیں کہ "ارے تم کیا ہوا! آج لیمپ کیوں نہیں جلا! کیا آج اندھیرا ہی رہے گا!!!"

یہ ہنگامہ اس طرح بڑھتا رہا اور کالو کا مارے غصے کے یہ حال تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ آخر کس کس کو جواب دے۔ ان سوالوں کی بوچھاڑ سے تنگ آکر اور لوگوں کی جملہ بازیوں سے بچنے کے لئے وہ عام سڑک کو چھوڑ کر سر پر سیڑھی لئے ایک گلی میں ہو رہا لیکن یہاں بھی لوگ [illegible] پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کچھ دور چلتے چلتے اور کچھ سیڑھی کے بوجھ سے وہ تھک کر ذرا دم لینا چاہتا ہے۔ اس وقت وہ صرف تھکا ہوا نہیں بلکہ دنیا سے بیزار بھی ہے۔ اس نے سامنے والے کھمبے [illegible] سیڑھی [illegible] اس پر چڑھ کر لیمپ کے نیچے کے لوہے کو پکڑا اور سیڑھی کے [illegible] پیٹھ ٹیک دی لیکن لوگ اب بھی باز نہیں آئے۔ اس پر نہ صرف [illegible] کہتے ہیں بلکہ کسی نے اس کی سیڑھی نیچے سے کھینچ لی۔ اب وہ بیچارہ لٹکا ہوا ہے اور لوگ ادھر ادھر اچھل کود مچا رہے ہیں۔

ہاں لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ آج کالو نے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کی توہین کی گئی ہے کیونکہ آج شام کو اپنا سرکاری فرض ادا نہیں کیا؟ یا پھر لوگوں نے اس کو ٹھہرا...

پکڑ پایا جب وہ قصبہ کو روشن کرنے کا بہانہ نہیں پیش کر سکتا تھا؟ بہر حال کچھ دیر بعد اس کی سیڑھی واپس مل گئی اور وہ اوپر سے نیچے اترا اور لوگ برابر دیکھ رہے ہیں کہ وہ اترنے کے بعد کیا کرتا ہے۔

جن آدمیوں نے سیڑھی لگائی تھی وہ برابر قہقہے لگا رہے ہیں اور کاکو کو چڑاتے بھی جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بولا۔

ارے تیرے پاس چاقو ہے؟

ہاں، یہ دیکھو (چاقو نکالتے ہوئے)

یہ کہہ کر کاکو نے اپنی قمیص کا دامن اٹھایا اور پتلون کی جیب سے ایک بےصوت چاقو نکالا اور اسے کھول کر لہرانے لگا۔

حضرت مریم کے خون کی قسم! (چاقو دکھا کر) یہ اچھا ہے؟

تو کیا تو اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالے گا؟

ہاں اس کا گلا تو کاٹوں گا ہی مگر اس حرامزادے کا بھی کام تمام کر دونگا اگر میں نے دونوں کو یکجا پایا۔ تم سب گواہ رہنا۔ اچھا میرے ساتھ آؤ۔

یہ کہہ کر کاکو بڑی تیزی سے لنگڑا کر آگے بڑھا اور سب اس کے پیچھے ہو لئے اور اس کے ساتھ اس تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو گئے۔

ارے تو کیا واقعی تو اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالے گا؟

اس پر کاکو ذرا رکا اور بھیڑ میں سے ایک چڑانے والے شخص کی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

آہ! کیا تم بعد کو پچھتاؤ گے؟ اس وقت تو تم لوگوں نے مجھے گھیر لیا ہے اور اب بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے مسلح ہوں۔ اس لئے تم سب خدا کے واسطے ذرا ٹھہر جاؤ۔

کاکو کے اس فقرہ پر بعض لوگ ڈر گئے اور اس کے ساتھ چلنے میں ان کے قدم بھی بدحواسی اور پریشانی کے ساتھ اٹھنے لگے۔ بعض لوگ اپنی آستینیں کھینچنے لگے اور بہت سے پیچھے رہ گئے۔

اس طرح ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ لے دے کے صرف چار آدمی اور دو ورندے رہ گئے جو اس کے پیچھے پیچھے گھر تک گئے مگر یہ لوگ بھی کچھ ڈرے سے تھے اور ڈر کے مارے اپنی فقرہ بازی بھول گئے تھے اور اب تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ کاکو کو اپنے خطرناک ارادے سے باز رکھنے کیلئے تیار نظر آتے تھے۔ جیسے ہی کاکو دروازے کے سامنے پہنچا ان لوگوں نے اسے مذاق کے بہانے سے پکڑ لیا اور اس کو کسی قریب کے شراب خانہ میں کچھ پلانے کے لئے لیجانے کی ترغیب دینے لگے۔ لیکن کاکو کا حال ہی کچھ عجیب تھا اس نے بڑے زور سے اپنے کو ان کی گرفت سے چھڑا کر چاقو سے ان لوگوں پر حملہ کرنے کی دھمکی دی اور اسی حالت میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچکر دو چار ٹھوکریں کواڑ پر ماریں اور اپنی بیوی کو آواز دی۔

کھول! حرامزادی! دروازہ کھول!! لے آج تو نے تمام کرتوتوں کا خمیازہ بھگتیگی۔ ...... مجھکو چھوڑ دو..... چھوڑ دو۔ ..... خون ......

مجھکو چھوڑ دو، نہیں تو میں تمہیں بھی دو ٹکڑے کر ڈالوں گا۔

جو لوگ اسے پکڑے ہوئے تھے انہوں نے اس دھمکی پر اسے چھوڑ دیا اور راستے سے ہٹ گئے۔ اب اس نے قمیص کی اوپر والی جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے بڑے زور سے دروازہ بند کر دیا جو لوگ ابھی ابھی ہٹ گئے تھے پھر دروازے کو دھکا دیکر کھولنے کی کوشش کرنے لگے اور ساتھ ساتھ مدد کے لئے لوگوں کو چیخ چیخ کر بلانے لگے۔ اب اندر سے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔

ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے سے اپنی بیوی کا جھونٹا پکڑ کر اس نے اسکو زمین پر کھینچ دیا اپنے کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے میں وہ ننگی بھی ہو گئی۔ اس بدحواسی کی حالت میں کاکو برابر "قتل! قتل!!" چیختا جاتا تھا اور چارپائی کے نیچے اس کو تلاش کرتا جاتا تھا اور جو چیز اس کے سامنے آتی اسکو ٹھوکر مار کر لوٹ دیتا۔ پھر اس نے کپڑوں کی الماری کھولی اور بنچ کے نیچے تلاش کیا۔ اور آخر میں باورچی خانے میں گیا۔ مگر اس دوران میں برابر یہی چیختا رہا۔

کہاں ہے وہ روسیاہ؟ بتا کہاں ہے وہ حرامزادہ؟ تو نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟

اس کی بیوی نے جواب دیا۔

کیا تو بالکل پاگل ہو گیا ہے یا آج روزے نے یا زہ پی گیا ہے؟ آخر آج تجھکو کیا ہو گیا ہے؟ کیا بات تیرے ذہن میں آئی ہے؟ مجھ کو کہیں کا!

باہر گلی میں وہ چار آدمی جو اس کے پیچھے پیچھے آئے تھے اب تک کھڑے ہیں اور کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے ہیں یہ سب لوگ اندر کے ہنگامہ کی آہٹ پا کر شور مچا رہے ہیں۔ اس شور سے آس پاس کے رہنے والوں نے بھی اپنی کھڑکیاں کھول کر پوچھنا شروع کیا۔

کون ہے! کیا بات ہے؟

باہر اب دروازے پر دھکم دھکا ہو رہا ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اندر کاکو اپنی بیوی کے سر پر سوار ہے اور پوچھ رہا ہے

"بتا وہ لنگور کہاں ہے" نہیں تو میں ابھی تیرا خاتمہ کئے دیتا ہوں۔ آج میرے اوپر خون سوار ہے! خون .... خون .... خون۔

کاکو ہر جگہ دیکھ چکا مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں تلاش کرے۔ اتنے میں اس کی نظر باورچی خانے کی کھڑکی پر پڑی یہ کھڑکی اونچی ہے اور گلی کے پیچھے ایک ٹیلے کی طرف کھلتی ہے۔ یہ کھڑکی ہمیشہ بند رہتی ہے اور اس کے برابر بند رہنے سے اس کی چٹخنی اندر

کواڑ دھوئیں سے کالے ہوگئے ہیں۔

"ایک کرسی لے اور کھڑکی کھول! کھولتی کیوں نہیں؟ کیا بات ہے؟ چڑیل کہیں کی! اچھا تو نہیں کھولتی تو میں کھولتا ہوں۔" پھر اس نے ایک تپائی پر چڑھ کر کھڑکی کھولی ...... دہشت۔ کاکو کھڑکی کھولتے ہی ششدر رہ جاتا ہے اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ ہاتھ سے چاقو گر پڑتا ہے

کھڑکی کے آگے جو ذرا سی جگہ باہر نکلی ہوئی ہے اس پر جناب بتی براجمان ہیں۔

"جناب عالی، اگر آپ کا ہاتھ چھوٹ جائے تو آپ نیچے گر جائیں گے" کاکو نے ذرا اپنے ہوش وحواس سنبھال کر اور اپنی مٹھی کو منہ پر رکھ کر کہا۔ (اور اس وقت تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی اترنے میں مدد کی جائے۔

"آہستہ... بہت آہستہ جناب! ایک پاؤں وہاں رکھئے اور دوسرا میرے کندھے پر۔ مگر عالی جاہ آپ اپنے کو اس جگہ چھپانے پر کیسے راضی ہوگئے۔ میں تو اس کا کبھی خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور وہ بھی اتنی اونچی اور خطرناک جگہ۔ صرف اپنی الہڑ عورت کی خاطر۔ آپ تو وہ ہیں جن کو حکومت کی طرف سے عالی جناب کا خطاب ملا ہے۔ مگر واقعی بتائیے معاملہ کیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا" پھر کاکو اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہوکر اس کے منہ پر ایک مکا جماتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے۔

"آخر اتنے اونچے...... وہاں.... تو نے آخر کیسے چھپایا؟ کیا اور کوئی جگہ صاف ستھری نہیں تھی؟ حرامزادی (دانت پیس کر) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ میں نے گھر کا کونا کونا چھان ڈالا مگر دیوار والی بھی الماری کا پردہ نہیں اٹھایا۔ اچھا، جناب عالی کے لئے جلدی سے برش لا۔ جناب عالی، کیا آپ میرے اوپر اتنی مہربانی کریں گے کہ پانچ منٹ کے لئے اس دیوار والی الماری کے اندر کھڑے ہو جائیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ باہر لوگ مجھ پر کس طرح زبان تیز کر رہے ہیں آپ خوب جانتے ہیں کہ انسان کی بعض ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا مگر کیا کیا جائے کہ ہوتی ہیں۔ صرف پانچ منٹ کے لئے۔ آئیے تشریف لائیے۔ میں ان لوگوں سے ذرا نپٹ لوں۔

جب عالی جناب بتی الماری میں چھپ گئے تو کاکو نے کھڑکی کھول کر گلی میں مجمع کو اوپر سے آواز دی۔

یہاں کوئی نہیں ہے۔ دروازہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے اوپر چلا آئے۔ آؤ، آؤ، اگر معلوم کرنا چاہتے ہو تو اوپر آتے کیوں نہیں لیکن یہاں تو کوئی نہیں

(براہ راست اطالوی سے ترجمہ کیا گیا)

ہمسائے

بقیہ صفحہ ۸۳

"پھر کیا کیا کروں؟"

"میرا نام ہے امیر النساء بیگم"۔ اس کے لہجہ میں بڑوں جیسی سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

"مگر تمہاری امی تو تمہیں بیری ہی کہتی ہیں؟"

"ادہنہ"

"اور تمہارے ابا بھی"

"انہیں کہنے دو"

"ہم بھی تو تمہیں بیری ہی کہیں گے......"

"دیکھو جی میں پھر کہے دیتی ہوں مجھے بیری نہ کہا کرو"

"اور اگر کہوں تو ——"

"ہم تم سے نہیں بولیں گے...... جاؤ میں تم سے نہیں بولتی میں گھر جاتی ہوں"

اس شام بیری گھر سے باہر نہیں نکلی۔

رات کو اکبر کے ابا نے اس کی امی سے پوچھا:۔

"اکبر کہاں ہے بیگم؟"

"سو رہا ہے میں جانوں"

"ہائیں ابھی سے سو گیا

کھانا بھی تو نہیں کھایا"

"اکبر" ابا اس کے بستر کے پاس جاکر بولے۔ "اٹھو کھانا کھاؤ۔ ارے بیگم یہ تو رو رہا ہے"

"کیوں خیر تو ہے میرے لعل" یہ کہہ کر امی نے اس کا ماتھا چھوا۔

"کچھ نہیں امی جان" اکبر نے ہچکیوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ائے ہے ساری چادر آنسوؤں سے گیلی ہو رہی ہے" امی نے فکرمندی سے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹے" ابا پچکار کر بولے۔

کئی منٹ کے بعد امی اور ابا کے بار بار اصرار کرنے پر اکبر نے ہچکیاں لیتے ہوئے بمشکل کہا:۔

"دن کو...... دن کو مجھے کھیل میں یاد نہیں رہا میں نے...... میں نے سوال نہیں نکالے صبح ماسٹر جی...... ماسٹر جی مجھے پیٹیں گے"

ایجنٹا کے فرسکو

ایجنٹا کے غار جو اورنگ آباد سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں، آج سے سینکڑوں سال پہلے پہاڑوں کو اندر ہی اندر کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ ان میں نقاشی اور مصوری کے ایسے ایسے کمالات دکھائے گئے ہیں کہ اس زمانے کے ماہرینِ فن بھی انھیں دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ ان کی شہرت ساری دنیا میں اس درجہ پھیلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کی سیر کرنے والے غیر ملکی سیاح اُن کی زیارت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان غاروں کی ہلکی سی جھلک پروفیسر محمد مجیب صاحب کے مقالے میں ملاحظہ کیجیے جو اس شمارے میں شامل ہے۔

بھارتیندو ہریش چندر

ہندی کے بہت سے شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن کی لکھی ہوئی چیزوں کو اگر دیوناگری رسم الخط کے بجائے اُردو کے مروجہ رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو پڑھنے والے کے لئے بھی ہندی اُردو بن جاتی ہے۔ اور ہندی اور اُردو کے ایسے لکھنے والوں کی موجودگی میں ہم اپنی زبان اور ادب کے متعلق صرف ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جس زبان کو کچھ لوگوں نے ایک خاص فرقہ کی زبان سمجھ رہا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ زبان نہ کسی ایک کی میراث ہے نہ کسی دوسرے کا اجارہ۔ یہ تو آپس کے میل محبت سے پیدا ہوئی اور اسی میل محبت نے اسے پال پوس کر اس قابل بنایا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس مشترکہ ورثہ پر فخر کر سکیں۔

بھارتیندو ہریش چند ہندی کے ان چند لکھنے والوں میں سے ایک [illegible] کی تحریریں ملک کی ایک مشترک زبان کے مسئلہ کا حل پیش کرتی [illegible] سے متعلق جناب حامد اللہ افسر کا مقالہ اس

لوہسون

لوہسون قلمی نام تھا چنو شو جن کا جو ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ مانچو خاندان کے عہد حکومت میں چین کے صوبہ چیکیانگ کے شہر شاؤ ہسنگ میں پیدا ہوا۔ اس نے طبی تعلیم پانے کے باوجود طبابت کا پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی توجہ ادبیات کی طرف مبذول کر لی۔ وہ چینی ادب کی نئی تحریک کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے بہت سے ناول، افسانے اور مضامین مختلف قلمی ناموں سے لکھے جن میں سے لوہسون سب سے زیادہ مشہور قلمی نام تھا چونکہ عقیدے کے لحاظ سے وہ اشتراکیت پسند تھا، اس لئے حکومت کی مہر احتساب اسکی ہر نقل و حرکت پر لگی رہی اور اسے بار بار اپنی سکونت بدلنی پڑی ۱۹۳۶ء میں اسکا انتقال ہو گیا۔ مفصل مضمون اسی شمارے میں ملاحظہ فرمایئے

مشرقِ وسطیٰ میں موسیقی کے ساز
مصری قانون - یہ تصویر اصل نمونے کو دیکھ کر بنائی گئی ہے۔
مصری بربط اور بربط نواز - یہ تصویر ایک قدیم دیوار پر بنے ہوئے نقش و نگار سے لی گئی ہے۔
اس موضوع پر جناب شاہد احمد دہلوی کا لکھا ہوا مفصل مضمون اسی شمارے میں ملاحظہ کیجئے۔
۱- ایرانی ستار
۲- ایرانی بربط
۳- ایرانی بربط
۴- ایرانی قانون
۵- عربی رباب
۶- عربی رباب
کھڑے ہو کر بجانے کا مصری بربط اور بربط نواز - یہ تصویر بھی دیوار پر بنے ہوئے نقش و نگار سے لی گئی ہے۔
عربی قانون - یہ بھی ایرانی قانون کی طرح
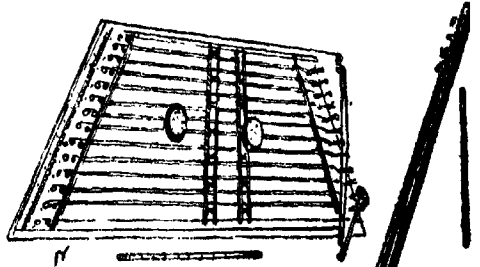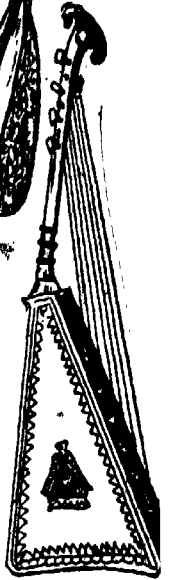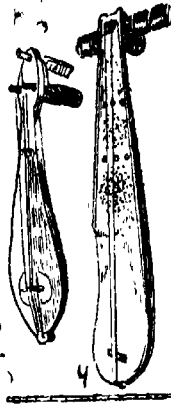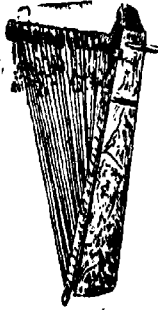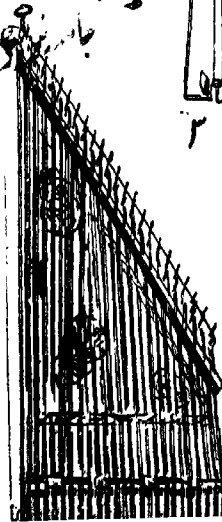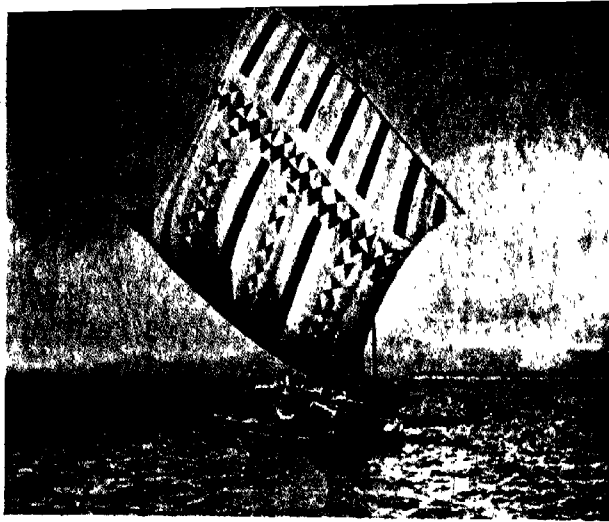
قریباً پچاس سال تک امریکہ کے
کین رہنے کے بعد فلپائن کو اب
، آزادی ملی ہے اور اسلئے خط
ا کے شمال میں بسے ہوئے ان
.ون کا ذکر اب لوگوں کی زبانوں
لے لگا ہے۔ فلپائن کے جزیروں میں
۷۰۰۰ کے قریب جزیرے شامل
، ان میں سے بعض تو بڑے ہیں
بعض اتنے چھوٹے کہ ان میں
آبادی ہے اور نہ انکا کوئی نام ہے

کھلے ہوئے پانی میں ایک کشتی اور اسکا خوبصورت بادبان۔

فلپائن کے جنوبی مسلمان

درخت کی چھال سے ربڑ کا پانی نکال رہے ہیں

طالب علموں کے ایک جشن میں لڑکے اور لڑکیاں۔

☆

«منیلا» ان میں سے زیادہ مشہور ہے
یہاں آٹھ یونیورسٹیاں ہیں۔ سب سے
پرانی ۱۶۱۱ء میں قائم ہوئی تھی
فلپائن کے جزیروں کی مشہور پیداوار
اور صنعت ربڑ ہے۔

کافرستان کی ایک وادی

وادئ کافرستان کی چند حسین لڑکیاں جن کا جمال دلفریب صحرا میں کھلنے والے شاداب پھول کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے دور رہتا ہے ۔

«کافرستان کی ایک وادی» پر ڈاکٹر اختر حسن رائے پوری کا لکھا ہوا مقالہ اسی شمارے میں ملاحظہ کیجئے۔ نیچے کی تصویر میں مصنف اور انکے ساتھی کافرستان کے چند لوگوں کے ساتھ موجود ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے ٹکڑے پیٹھوں پر لاد کر دامن میں لائے جارہے ہیں۔

ہندوستان میں سائنس کی ترقی

ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو سائنس اور اس کی ترقیوں کو کوئی غیر معمولی اہمیت دیتے ہوں۔ ہمارے لئے سائنس کی ایجادوں کی حیثیت بھی زندگی کے ایک معمولی واقعہ کی سی ہے اس لئے کہ ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں کہ سائنسداں کیسے اپنا خون جگر صرف کرکے ہماری زندگی کو بہتر بنانے میں لگے رہتے ہیں۔

ہندوستان اور اس کے سپوتوں نے بھی سائنس کی دنیا میں جو کارنامے دکھائے ہیں ان کی بدولت ہمارا ملک دوسرے ملکوں کے سامنے فخر اور ناز سے اپنا سر اونچا کر سکتا ہے ہندوستان کے سپوتوں میں سر سی۔ وی۔ رمن، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ کرشنن، ڈاکٹر ایم۔ این۔ سہا، سر شانتی سروپ بھٹناگر، سر جگدیش بوس، ایسے نام ہیں جو سائنس کے آسمان پر ہمیشہ روشن ستاروں کی طرح چمکیں گے۔ ان دو صفحوں پر آپ "ہاف کین" انسٹی ٹیوٹ کی کچھ تصویریں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۳۲ء سے مختلف طرح کی دواؤں کی تیاری کا بیحد مفید کام کر رہا ہے۔ اور اب اس کا سارا خرچ اسکی بنائی ہوئی دواؤں ہی سے پورا ہوتا ہے۔ (یہ تصویریں ہمارے ادارے کی طرف سے اسٹین ہارڈنگ نے لی ہیں) ٭

٭

اوپر۔ ہاف کین انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کرشنا پیچی وٹامن "اے" کی ٹکیوں کیلئے شارک مچھلی کا تیل نکال رہے ہیں ٭
نیچے۔ ہاف کین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کرنل سہاجب سنگھ سوکھے اور ان کے ایک اسسٹنٹ ٭

ہاف کین انسٹی ٹیوٹ میں شعبہ حشریات کے مہتمم ڈاکٹر شریف۔

پلیگ کے ٹیکے کے لئے دوا تیار کی جا رہی ہے۔

اس گھوڑے نے اب تک دوائیں بنانے کے لئے اپنے جسم سے ۳۹۲ لٹر خون دیا ہے۔
ڈاکٹر ساٹھے اس شعبہ کے انچارج ہیں۔

ڈاکٹر موہن ایک زہریلے سانپ کا زہر نکال رہے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنا راؤ چوہے پر ایک غذا کی طاقت کا اثر دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر منجوارا دُ کتے کے کاٹے کا انجکشن تیار کر رہے ہیں۔

ترکی کی قدیم سنگ تراشی کا ایک نمونہ
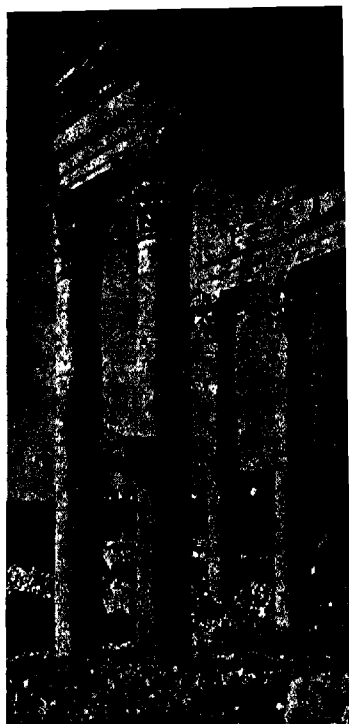
ترکی کی ایک یونانی عمارت کا کھنڈر

ترکی میں آثار قدیمہ

ترکی کی ایک پرانی قبر کا کتبہ

ایک اور پرانا کتبہ
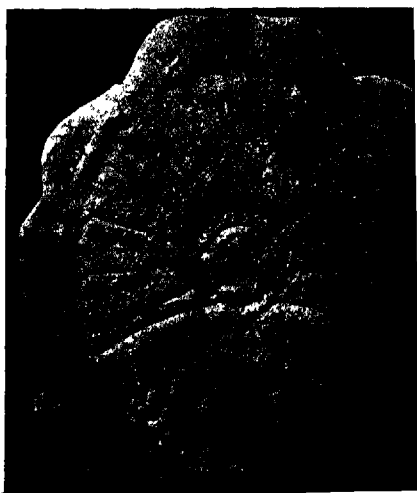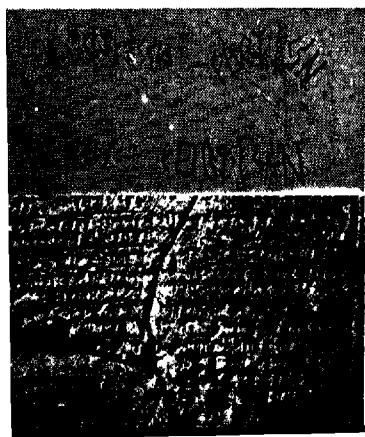
نہالِ وطن کے غنچے

اُدھر تو فطرت کے سادہ جلوے نظر کو رنگیں بنا رہے ہیں
اِدھر نہالِ وطن کے غنچے کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں

نظر ہے فطرت کی سادگی پر لبوں پہ رقصاں حسیں تبسّم
جبیں پہ عقل و خرد کے تارے جمالِ تاباں دکھا رہے ہیں

انھیں کے دم سے خزانِ وطن کی بنے گی رشکِ بہارِ جنّت
جو آج اپنی محبّتوں سے اسے بہاراں بنا رہے ہیں

یہی کریں گے جہاں میں جنسِ گرانِ اُلفت کو عام اک دن
جو آج فطرت کی گودیوں میں ترانے اُلفت کے گا رہے ہیں

چینی تھیٹر

چین کی مشہور ایکٹرس سوین فو جوہم

ڈراما چینی زندگی کا قومی فن ہے اور چینیوں کا ایک دلچسپ مشغلہ۔ یہی وجہ ہے کہ چینی ڈرامے عموماً بڑے طویل ہوتے ہیں اور شام کو چار بجے سے رات کے بارہ بجے یا اس کے بعد تک بھی جاری رہتے ہیں۔ آپ اگر کسی چینی تھیٹر میں جائیں تو وہاں آپکو بہت سی نئی نئی اور انوکھی باتیں نظر آئینگی۔ تھیٹر پہنچنے سے بہت پہلے دور ہی سے آپکو ڈھولوں نفیریوں اور گھنٹوں کی آوازیں سنائی دینگی۔ یہ آوازیں گویا آپ کو تھیٹر آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ جب آپ وہاں پہنچ جائیں گے تو آپ کو ایک بالکل سادہ اسٹیج نظر آئیگا۔ جو تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور جہاں کسی قسم کا کوئی پردہ یا ساز و سامان نہیں۔ بس بانسوں کو کاٹ کر اور باندھ کر اسٹیج تیار کر لیا گیا ہے۔ اب ڈراما شروع ہوتا ہے اور آپ کو کچھ عجیب عجیب باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کردار کو ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانا ہے وہ گھوڑے کی طرح اُچھل کود کر چلتا ہے۔ اپنا چابک ہلاتا ہے اور پھر رک کر کہتا ہے کہ "اب میں فلاں ملک پہنچ گیا۔" اسٹیج پر ایک آدمی ہے جو ایکٹروں کو برابر وہ چیزیں

ایک تاریخی ڈرامے کا منظر

ایک تاریخی ڈرامے کا منظر
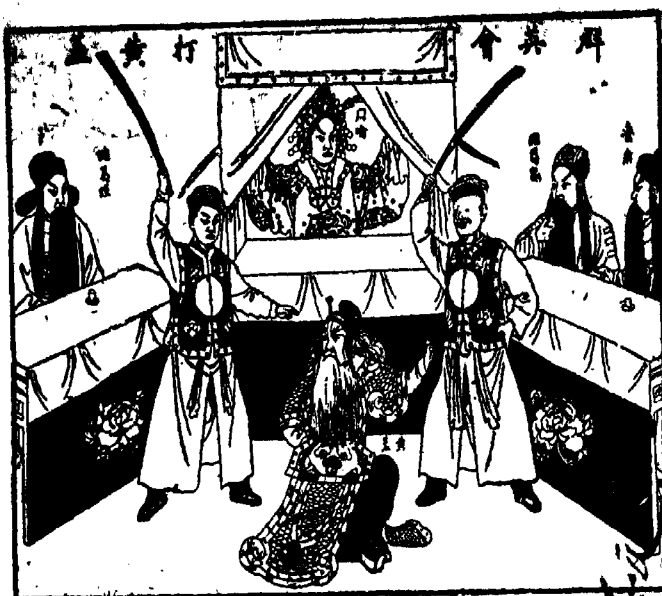
دے رہا ہے جن کی اُنہیں کھیل میں ضرورت ہے ۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ آپ اسے دیکھ نہیں رہے ایکٹر اپنا کام ختم کرکے اسٹیج پر چاء پی رہے ہیں جو آدمی ابھی اسٹیج پر مرگیا تھا وہ اپنا کام ختم کرچکنے کے بعد فوراً ہی کھڑا ہوجاتا ہے ۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن کوئی پردہ نہیں گرتا ۔ اسٹیج پر ایک طرف جو کرسی پڑی ہے وہ گویا پہاڑی ہے ۔ دوسری طرف پڑی ہوئی میز شہر پناہ ہے ۔ اب ایکٹروں کو دیکھئے ۔ جس ایکٹر کا چہرہ بالکل سفید ہے وہ "ولین" ہے جس آدمی کے ہاتھ میں چھوٹا سا پنکھا ہے وہ طالب علم ہے ۔ جن صاحب کے سر پر بالوں وار ٹوپی ہے وہ جنرل ہیں ۔ یہ سب نشانیاں ایسی ہیں جنہیں ہر چینی اچھی طرح جانتا ہے ۔

چینی تھیٹر کی دو خصوصیتیں آپ کو ہر ڈرامے میں ملیں گی ۔ ایک تو یہ کہ اسکا مقصد اخلاقی ہے ۔ دوسرے اسکے تفریحی عناصر میں موسیقی کو سب سے زیادہ دخل ہے ۔

ایک مشہور ایکٹر وینگ سیا چن

بصرہ

اور

طہران

شط العرب کے دونوں جانب
بصرے کی گنجان آبادی

بصرے کا ایک پر رونق بازار۔ اگلے حصہ میں
مسجد سپہ سالار کا گنبد دکھائی دے رہا ہے۔

بصرے سے طہران تک مشہور شہروں اور دلکش عمارتوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ اسی لئیے دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ اسی طرف مبذول ہوتی رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے کچھ عرصے پہلے ڈاکٹر محمد باقر نے ان مقامات کی سیر کی اور ایک سفرنامہ قلمبند کیا جس کا ایک حصہ اسی شمارے میں شامل ہے۔
ملاحظہ کیجئے۔

طہران ریلوے اسٹیشن کی دلکش عمارت

اندھی بچیا

افسانہ

صالحہ عابد حسین

نذیر بڑا اچھا باورچی تھا۔ اسے ہندوستانی انگریزی دونوں طرح کے کھانے پکانے آتے تھے۔ اس کے ہاتھ کا کھانا جس کے منہ کو ایک مرتبہ لگ گیا پھر کسی دوسرے کا پکایا ہوا کھانا اس کے لئے بالکل پھیکا اور بدمزہ ہو جاتا تھا۔ مگر نذیر کا مزاج بہت نازک تھا کسی کی کڑوی بات یا ٹیڑھی نظر وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ فوراً اپنا بوریا بستر باندھ اپنا راستہ گھر چلا جاتا۔ پھر چاہے کوئی کتنا ہی سمجھائے وہ کسی کی ایک نہ مانتا تھا۔ اسی لئے ہمیشہ اس کے مالک سب گھر والوں کو منع کرتے رہا کرتے تھے کہ دیکھو نذیر کو کچھ نہ کہنا۔ آپ جانتے زبان کا مزہ بری چیز ہے۔ انسان شاید اپنے پیٹ سے بھی زیادہ اپنی زبان کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

جب نذیر کی پہلی شادی ہوئی تو وہ تیرہ چودہ برس کا کم عمر چھوکرا تھا۔ اور اس کی بیوی مشکل سے سات آٹھ سال کی ہوگی۔ دونوں ہر وقت ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آپس میں مار پیٹ روٹھنا منانا ہوتا رہتا۔ نذیر کی بیوی راجو بڑی بھولی صورت کی بچی تھی اور جوان ہو کر تو ایسی خوبصورت نکلی کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ نذیر دل و جان سے اس پر فدا تھا۔

نذیر کا باپ بھی باورچی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا موروثی فن بڑی محنت سے سکھایا اور بیس برس کی عمر میں اسے کھانے پکانے میں ماہر کر دیا۔

بیس برس کی عمر میں نذیر کے پہلا بچہ ہوا۔ خوب موٹا تازہ اور خوبصورت بالکل راجو کا ہمشکل۔ دادا دادی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ نذیر ہمیشہ سے بچوں کا دلدادہ تھا اپنے بچے پر تو پروانہ وار نثار رہتا۔ دو سال بعد اس کے ایک لڑکی اور ایک سال بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ سب کے سب خوبصورت تندرست اور ہنس مکھ۔ نذیر کی خوشی کا کیا پوچھنا؟ وہ ایک "صاحب" کے ہاں باورچی ہو گیا تھا۔ اپنی ساری تنخواہ بچوں کے لئے کھلونوں، "بیبی ایل" کپڑوں اور بیوی کے زیور اور ریشمی کپڑوں میں صرف کر دیتا کھانے پینے کا سارا خرچ ماں باپ اٹھاتے تھے اور وہ گھر کی سب فکروں سے آزاد بے فکری اور مسرت کی جنت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ آٹھویں دن وہ صاحب سے ایک دن کی چھٹی لے کر گھر آتا اور بیوی بچوں اور بڈھے ماں باپ سے جن کا وہ اکلوتا بچہ تھا مل جاتا۔ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا۔ اسکے آنے سے گھر میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی اور سب گھر والے چھ دن اس کے آنے کی گھڑیاں گن گن کر کاٹتے تھے۔

اچانک گاؤں میں فصلی وبا پھیلی اور تین چار دن کے اندر اندر اس کا باپ ماں اور بڑا لڑکا چٹ پٹ ہو گئے۔ نذیر کو خبر ملی تو روتا پیٹتا گھر آیا۔ راجو کا صدمے سے برا حال تھا پہلے بیوی سے مل کر خوب رویا۔ پھر اسے تسلی تشفی دی، گھر بند کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لیکر اپنے "صاحب" کی کوٹھی پر آ گیا جہاں اسے ایک کوٹھری اور برآمدہ رہنے کو مل گیا۔

اب نذیر کے سر ساری ذمہ داریاں اور خرچ آ پڑے۔ اس پر ماں باپ اور بچہ کا صدمہ سوہان روح۔ ہر وقت رنجیدہ اور متفکر رہتا۔ راجو کو بھی اب وہ آرام و بے فکری کہاں نصیب ہوتی جو ساس سسر کے زمانے میں میسر تھی۔ دن بھر گھر کا کام کاج بچوں کی پرورش کھانا پکانا کرتی رہتی اور رات کو جب تھکا ہارا نذیر بچا کھلا کر واپس آتا تو گھنٹوں اس کے پاؤں دباتی۔ راجو کے پیٹ میں پھر بچہ تھا... اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ ادھر دونوں بچے روز کچھ نہ کچھ بیمار رہنے لگے تھے۔ اسی حالت میں راجو کے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا... نذیر نے بہت دوڑ دھوپ کی، صاحب نے ڈاکٹر کو بلایا مگر راجو کے زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں چار بچوں کی پیدائش نے یونہی صحت زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ اب جسم میں زہر پھیلنے کا بہانہ ہو گیا اور وہ ننھے بچوں اور عاشق زار شوہر کو تڑپتا چھوڑ کر ناشاد نامراد دنیا سے چل دی۔

نذیر بیچارا اس صدمہ سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پہلے پانچ برس کی بلی بلائی لڑکی نمونیہ کی نذر ہوئی اور بیس پچیس دن بعد چھوٹا لڑکا چیچک کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نذیر گنوار اور جاہل، بچہ کا علاج دوا کچھ نہ کیا ٹونے ٹوٹکے کرتا رہا اور اس ڈر سے صاحب اور میم صاحب سے بھی چھپایا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھائیں گے اور ڈاکٹر نے جیسے اس کی بیوی اور بچی کو مار دیا اس بچے کو بھی مار دے گا۔ بچے کے مرنے کے بعد اس کی حالت بالکل پاگلوں کی سی ہو گئی۔ کس کا پکانا کہاں کا کھانا۔ اس پر ایک مدہوشی کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ سارے دن بیوی بچوں کی قبروں پر پڑا روتا اور سرد ھنتا رہتا۔ میم صاحب نے ہفتے بھر انتظار کیا کہ شاید اس کی حالت سنبھلے اور وہ پھر پکانا شروع کرے۔ آخر انہوں نے بیرے کو بلا کر نذیر کا حال پوچھا۔ بیرا مدت سے نذیر کا مخالف تھا۔ نذیر ایماندار تھا اور بیرے کو سودے میں روپیہ رکھنے کا موقع بہت کم دیتا تھا۔ اس نے میم صاحب کو کہا کہ نذیر تو باؤلا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی جڑ دیا کہ اس کے بچے کو چیچک ہو گئی تھی مگر اس نے آپ سے چھپایا۔ یہ سنکر میم صاحب کے حواس غائب ہو گئے وہ ان کے بنگلے میں چھوت والی بیماری سے موت ہو گئی اور وہ بے خبر رہیں؟ پہلے تو انہوں نے بیرے کو خوب ڈانٹا کہ تو نے ہمیں اطلاع کیوں نہ کی۔ بیرے کو الٹی اپنی فکر پڑ گئی بڑی مشکل سے جھوٹی سچی باتیں بنا کر اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر معاملہ سیدھا کیا۔ میم صاحب نے نذیر کو قبرستان سے بلایا اور اس کا حساب کر دیا اور اسی وقت ہیلتھ آفیسر کو بلا کر تمام کوٹھی اور شاگرد پیشہ کو "ڈس انفکٹ" کرایا پھر بھی میم صاحب کئی دن تک بدحواس رہیں۔

نذیر نے لاپروائی بلکہ بے حسی سے برطرفی کا حکم سنا اور سلام کر کے اپنے گاؤں چلا آیا۔ وہ اب نوکری کرے تو کیوں اور کس کے لئے؟

وہ دن رات گھر میں منہ اوندھائے پڑا رہتا۔ اکثر گاؤں والے آکر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کبھی کوئی بڑھیا آکر زبردستی کچھ کھلا پلا دیتی کبھی خود نذیر دو موٹی موٹی روٹیاں پکا کر پیٹ کے دوزخ میں ڈال دیتا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ نذیر کی پھوپی کو گاؤں میں سے کسی نے نذیر کا حال لکھا وہ بچاری بہت دور رہتی تھی مگر کسی نہ کسی طرح بھتیجے کے پاس پہنچی۔ اسکے ساتھ اس کی سوتیلی نواسی بھی تھی جس کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔

پھوپی پہلے تو بھتیجے سے مل کر بہت روتی پیٹی پھر رفتہ رفتہ اسے تسلی دلاسا دیکر اور سمجھا بجھا کر راہ پر لائی۔ نذیر بھی اب اس اداس، اجاڑ اور تنہا زندگی سے اکتا گیا تھا۔ ذرا پھوپی کے آنے اور سمجھانے بجھانے سے دل بہلا۔ دس پانچ دن بعد پھوپی نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلا کر ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ اب نذیر کا دوسرا بیاہ ہونا چاہئے۔ نذیر پہلے تو انکار کرتا رہا مگر آخر میں سب کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنی رضامندی دیدی۔ پھوپی نے زیادہ انتظار نہ کیا اگلے ہی دن اپنی سوتیلی نواسی سے نذیر کا نکاح کر دیا۔ وہ بچاری بہت دن سے اس فکر میں تھی کہ کوئی بر ملے تو اس لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ مگر غریب لاوارث بیٹی نہ کچھ لینے کو نہ کچھ دینے کو بر کیسے جڑتا؟ اب ایسا اچھا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔

نئی بہو ہنس مکھ محنتی اور اطاعت گزار لڑکی تھی۔ سانولا رنگ معمولی ناک نقشہ۔ نذیر کی نظروں میں رآجو کی صورت بسی ہوئی تھی بھلا اس کی شکل اسے کیا پسند آتی۔ پھر وہ انہی بے کیف زندگی سے اس قدر تھک گیا تھا کہ زندگی کی یہ نئی تبدیلی اسے خوشگوار اور پر سکون محسوس ہوئی۔ پھر بہو خوبصورت نہ ہو مگر چڑھتی جوانی نے اسے دلکش ضرور بنا دیا تھا۔ نذیر کچھ دن کے لئے اس میں کھو گیا۔ پھوپی نے اطمینان کا سانس لیا اور بھتیجے کا گھر بسا کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔

نذیر کا مزاج صدموں نے بالکل بدل دیا تھا۔ اب وہ ذرا ذرا سی بات پر جھلا جاتا، مارنے پر تل جاتا۔ بیوی کو حکم تھا کہ اس کی بغیر اجازت کہیں آنا جانا تو کیا ملے بھی نہیں۔ مگر بہو ایسی اطاعت گزار اور بے زبان لڑکی تھی کہ سب باتیں خاموشی اور خوشی سے برداشت کرتی اور شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہ لاتی۔

کچھ دن بعد نذیر نے ایک جگہ نوکری کر لی اور بیوی کو ساتھ لے گیا۔

نذیر کی نئی بیوی کا نام کبھی کسی کو معلوم نہ ہوا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ بڑی سادگی سے جواب دیتی "بیگم صاحب ہم کا جانیں ہمارا نام کا تھا! جب ہم لڑکوری تہن تو سب بیٹیا بیٹیا کہت رہن۔ جب سادی ہوئی تو سب بہو بہو کہن، اب کھنسا ماں بتا ہیں کھنسامن کہت ہیں" چنانچہ اسے خود نذیر اور سب لوگ خانساماں بلکہ "کھنسامن" کہتے تھے۔

شادی کے دو برس بعد نذیر کے ایک بچی پیدا ہوئی، سانولے رنگ موٹے ناک نقشہ کی دبلی پتلی بچی۔ نذیر اسے دیکھ کر بے اختیار رونے لگا۔ اسے اپنے موٹے تازے خوبصورت بچے یاد آ گئے۔ ان بچوں کے کھلونے اور کپڑے نذیر نے ایک صندوق میں بند کرکے رکھ چھوڑے تھے۔ کبھی کبھی انہیں نکال کر دیکھتا اور رویا کرتا۔ "کھنسامن" کو ظاہر ہے کہ فطری طور پر اس سے رنج ہوتا تھا۔ اب اس نے چاہا کہ یہ کپڑے اور کھلونے اس کی بچی کو مل جائیں کہ اس سے زیادہ ان کا حقدار کون ہوگا؟ مگر نذیر کو یہ کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ اپنے خوبصورت بچوں کے کھلونے اور کپڑے اس بدصورت سوکھی سہی لونڈیا کو دیدے۔ بچوں کا عاشق زار باپ اس قدر دل شکستہ ہو گیا تھا کہ بچی کی صورت دیکھ کر اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

بچی جب مسکراتی، یا ہاتھ پاؤں چلاتی، آغوں آغوں کرتی تو ماں بیقرار ہو کر اسے سینے سے لگا لیتی اور بے تحاشا اس کا منہ چومتی۔ اسے اپنی ننھی سے بے انتہا محبت تھی مگر نذیر پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ بچی اس کی نہیں کسی غیر کی ہے۔ بھلا ایسی بدصورت بچی اس کی کیسے ہو سکتی ہے، اور اس کی نظروں میں اپنے خوبصورت بچوں کی تصویر پھر جاتی۔ بچارے نذیر کو کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اس کے پہلے بچے خود اس سے ذرا بھی نہ ملتے تھے اور یہ بچی ہو بہو اسی کی صورت ہے۔

جب ننھی ذرا بڑی ہوئی اور پیارے پیارے تماشے کرنے لگی تو کبھی کبھار نذیر اسے گود میں لے کر پیار کر لیتا۔ ماں کو اب ذرا اطمینان ہو گیا تھا کہ کچھ دن بعد یہ باپ کی لاڈلی بن جائے گی۔

"کھنسامن" کے رشتے داروں میں شادی تھی اور وہ کئی برس سے میکے گئی بھی نہیں تھی۔ نذیر نے بیوی کے اصرار پر اسے گاؤں بھیج دیا۔ قسمت کی خوبی کہ یہاں آتے ہی ننھی کی آنکھیں دکھنے آ گئیں اور اس بری طرح کہ آٹھ دس دن اس نے آنکھ نہ کھولی۔ بچاری ماں بہت گھبرائی۔ پہلے تو بڑی بوڑھیوں کے بتائے ہوئے لیپ ویپ کرتی رہی جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو لوگوں نے کہا دوسرے گاؤں میں ایک بڑا اچھا وید ہے اسے لے جا کر دکھاؤ۔ ماں غریب چار میل پیدل بچی کو گود میں لے کر وید کے پاس پہنچی۔ خدا جانے وید بالکل اناڑی تھا، یا اس کا دماغ خراب تھا، یا ننھی کی بدنصیبی اس وید ہی کی صورت میں سامنے آئی کہ اس کمبخت نے ماں سے کہا کہ آکھ کا دودھ نکال کر بچی کی آنکھوں میں لگا دو دو دن میں ٹھیک ہو جائیں گی نا تجربہ کار کم سن ماں نے اس کا انتظار بھی نہ کیا کہ اپنے گاؤں پہنچ کر اس علاج کو آزماتی بلکہ وہیں جنگل سے آکھ کے پتے لا اس کا دودھ نکال بچی کی آنکھوں میں لگا[illegible]

جب "کھنسامن" بچی کو لیکر نذیر کے پاس واپس آئی تو بدنصیب ننھی کی آنکھوں کی جگہ دو بھیانک گڑھوں کے سوا کچھ نہ تھا!!!

نذیر نے یہ دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ بیوی کو خوب مارا، بہت رویا پیٹا،

بد کو دو رگاؤں والو کو ہزار ہا گالیاں دیں مگر جو ہونا تھا ہو چکا تھا اب دنیا کی کوئی طاقت اس معصوم بچی کی بصارت کو واپس نہیں لا سکتی تھی۔

اس واقعے کے بعد سے نذیر کے مزاج میں اور بھی زیادہ تلخی آگئی۔ اگرچہ اسے بیوی سے خاص لگاؤ بلکہ محبت تھی۔ اس کے کپڑے لتے کھانے پینے کا ہر طرح خیال رکھتا تھا مگر مزاج پر بالکل قابو نہ تھا۔ بات بے بات جھڑکنا اور اکثر مار بیٹھنا۔ بچی کے پاس دو تین کرتا پہننے کو نہ تھا۔ ٹوپی، صدری جوتے یا جامے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ نذیر سے اگر بیوی یا کوئی اور کہتا کہ بچی بیچاری کے کپڑے کیوں نہیں بناتے تو وہ بگڑ کر جواب دیتا "اس اندھی دھندی کو کپڑے پہنا کر کیا کروں؟ یہ میری جان کا عذاب جی کر کیا کرے گی۔ بد نصیب اندھی مر جائے تو مجھے سکون ملے۔" اور ماں یہ سکر اپنی بچی کو جو دن رات اس کے گلے کا ہار بنی رہتی زور سے کلیجے سے چمٹا لیتی جیسے موت سے بچا رہی ہو۔

میں نے اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں جو دہلی میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھے سب سے پہلے نذیر کو دیکھا۔ کوئی چالیس سال کی عمر، دبلا پتلا لمبا کالا، چہرے سے کچھ مریض سا معلوم ہوتا تھا۔ ماتھے پر بل پڑے رہتے۔ کبھی ہنستا تو معلوم ہوتا جھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

"کھنسامن" ہمیشہ بہت سا چاندی کا زیور اور رنگ برنگ لال کپڑے پہنے رہتی۔ ہنس مکھ اور محنتی عورت تھی۔ کوئی کام کہتا تو ہنسی خوشی کر دیتی اور موقع ملتا تو گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی۔ اس کی کمزور، دبلی اندھی بچی ہر وقت اس کے گلے سے چمٹی رہتی تھی۔ اگر ماں ذرا دیر کو بٹھا کر ادھر ادھر ٹل جاتی تو وہ ہاتھوں سے اسے چاروں طرف ٹٹولتی اور چیخیں مارتی رہتی۔ بصارت جانے سے اس کی عام سمجھ بہت تیز ہو گئی تھی۔ پیاری پیاری حرکتیں کرتی اور ہر بات جلدی سمجھ لیتی۔ ماں کو جب زیادہ دیر کام کرنا ہوتا تو ایک ستلی اس کے پاؤں میں باندھ کر پلنگ کے پائے سے باندھ دیتی اور بچی بے کسی سے چاروں طرف ٹٹول کر رو دیا کرتی۔ اس کی صورت سے کچھ ایسی بے چارگی، مظلومی اور بے بسی ٹپکتی تھی کہ جو اسے دیکھتا اس کا دل لرز جاتا۔

ایک دن ہم نے کھنسامن سے کہا دیکھو یہ بیچاری بچی کتنی کمزور ہے۔ تم اسے کچھ کھانے کو کیوں نہیں دیتیں؟ اس نے بے بسی سے جواب دیا "مجبور ہیں کیا کریں۔ کھنسا ماجی ہمیں اس کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنے نہیں دیتے۔ اگر کچھ خرچ کر دیں تو مارتے ہیں۔" اس دن سے بیگم صاحب چپکے سے اسے بلا کر اپنے بچے کا بچا ہوا دودھ، کھچڑی سالن وغیرہ دیدیا کرتیں اور اپنے سامنے بٹھا کر بچی کو کھلوا دیتی تھیں۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ ننھی ریشمی شلوار اور داونی ٹوپا اوڑھے ہوئے مسکرا رہی ہے کسی نے کہا "کھنسامن آج تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔ کہاں سے آئے یہ کپڑے کیا خانساماں لایا ہے؟" مسکرا کر بولی "یہ کپڑے کھنسا ماجی کے پہلے بچوں کے ہیں۔ آج بڑی سردی تھی ہم نے چپکے سے نکال کر اسے پہنا دئے۔ دیکھیں گے تو بڑے کھپا ہونگے۔"

کچھ دیر بعد شاگرد پیشہ کی طرف سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ نذیر غصے میں بدحواس ایک لکڑی سے بے زبان بیوی اور معصوم سی بچی کو مار رہا تھا اور وہ دونوں چیخ رہی تھیں۔ بیگم صاحب نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر پرے پھینک دی اور غصے سے چلا کر کہا "خانساماں دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔" نذیر نے ایک نظر بیگم صاحب پر ڈالی، اور تو کچھ بس نہ چلا غریب معذور بچی کو پکڑ کر اس کا منہ زور زور سے زمین پر رگڑنے لگا "بد نصیب، بد بخت، اندھی اب بھی روئے گی؟ لے اور رو لے اور روئے گی؟ اچھا اور لے....."

معلوم ہوتا تھا بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ بیگم صاحب نے بچی کو اس سے چھین لیا اور ماں کے ساتھ کوٹھی میں بھیج دیا اور نذیر کو بہت ڈانٹا۔ اور سب لوگ بھی نذیر کو برا بھلا کہہ اور لعنت ملامت کر رہے تھے۔ کھنسامن الگ پڑی سسک رہی تھی اور نذیر سر جھکائے چپ چاپ بیچ میں بیٹھا سب کی سخت ملامت سن رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب سب اٹھ کر چلے گئے اور میں نے دیکھا کہ نذیر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے تو بچی کو لا کر اس کی ماں کو دیدیا۔ اس نے روتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بیوی یہ تو بے بات کی بات پر گتھے ہو جاتے ہیں۔ کمبخت سردی میں مری رہتی ہے میں نے اسے سلوار اور ٹوپا پہنا دیا تو کیا غضب ہوا؟"

میں نے کہا "خانساماں تمہیں اس ننھی سی معصوم جان، اور پھر اندھی اپاہج بچی کو مارتے نہ شرم آتی ہے نہ خدا کا خوف، کیسے باپ ہو؟"

شاید نذیر کو میرے لہجے میں ہمدردی کا شائبہ نظر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو اور بھی بے قابو ہو گیا اس نے سسکیوں کے درمیان کہا "بیوی یہ کمبخت جانتی ہے کہ میں اپنے خوبصورت پیارے پیارے بچوں کے کپڑے اس منحوس اندھی کو پہنے نہیں دیکھ سکتا۔ پھر بھی یہ مجھے جلانے کے لئے ان کپڑوں کو اس بے نصیب کو پہناتی ہے۔ میں نے کہا "نہیں نہیں خانساماں تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ آخر یہ معصوم بھی تو تمہاری بچی ہے۔ اس پر تو تمہیں اور زیادہ رحم آنا چاہیئے نہ کہ تم اتنا غصہ کرتے ہو؟"

اس نے دلدوز لہجے میں جواب دیا "آپ ہی سوچئے اس اندھی بچی کا کیا ہوگا؟ اللہ نے میرے ایسے ایسے تندرست اور پیارے بچے تو چھین لئے اور ان کے بدلے یہ اندھی اپاہج لڑکی مجھے دیدی جو عمر بھر میرے گلے کی پھانسی بنی رہے گی۔ میں نے کونسا ایسا گناہ کیا تھا جس کی مجھے یہ سزا ملی۔ بیوی جب میں مر جاؤں گا تو کون اسے پوچھے گا..... اس کا کیا بنے گا۔ کیا اس سے یہ اچھا نہیں کہ یہ مر جائے؟"

نذیر کے یہ الفاظ نہیں اس کے دکھے دل کی پکار تھی۔ اس کے جذبات کا اندازہ کرکے میرا دل کانپ گیا۔ میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور سوچنے لگی خدایا تیرے کھیل نیارے ہیں۔ تیری مشیت

کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں مگر آخر اس بدنصیب اندھی بچی کی زندگی سے کیا فائدہ؟ اس کا انجام کیا ہوگا سوائے اس کے کہ گلی گلی بھیک مانگ کر پیٹ کے دوزخ کو بھرے گی اور جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرے گی۔ اور پھر اس کی غریب ماں جو بچی کی ماتا کے جرم میں ہر وقت پٹتی رہتی ہے؟؟

میں اس سوچ میں افسردہ بیٹھی تھی کہ میرے کان میں میٹھی ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ بنی کوٹھڑی کے سامنے نذیر چارپائی پر بیٹھا کھنسا من کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے منا رہا تھا اور وہ شرما شرما کر ہنس رہی تھی اور ان دونوں کے بیچ میں اندھی بچی بیٹھی مسکرا مسکرا کر اندھی آنکھوں سے ماں باپ کو دیکھ رہی تھی....

میں چپ کی چپ رہ گئی۔

دوسرا کنارہ

بقیہ صفحہ ۶۹

تک گئے۔ گرین فر کے قریب تیزی سے بینڈ بج رہا تھا اور سمندر کی سیاہی مائل گہری سبز موجیں گیٹ وے کی سیڑھیوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ تھکا ہوا، اکتایا ہوا چاند ناریل کے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔ اور کولابہ کی طرف سے ہوا کے خنک اور نم جھونکے آرہے تھے۔

پھر اس لمحے سفید جہاز نے سیٹی دی۔ وہ عرشے پر کھڑی رہی۔ ساحل آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتا گیا۔ شام ہوتی عرشے پر ڈانس شروع ہوگیا۔ وہ تھک کر اپنے کیبن میں آکر سو گئی۔ اور سمندر اور آسمان کی تاریکی گھل مل کر سب گہری ہوگئی۔ موجوں کی سطح پر بہت سی آوازیں تیر رہی تھیں۔ مانوس، پرانی آوازیں۔ اور وہ آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ لائٹ ہاؤس کی سرخ روشنیاں رفتہ رفتہ افق میں کھو کر اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ دور۔ سب دور۔ لیکن وہ اس سے دور نہیں تھا۔ وہ جو اس وقت اس کے برابر والے کیبن میں سو رہا تھا۔ اور وہ خود ایک غیر ملکی شخص کے ساتھ ایک اجنبی سرزمین کی طرف جا رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ اور بڑے بڑے چینی کے گلدانوں کے سائے دیوار پر پھیل گئے۔

اور ایلمر بریڈلے اپنی برف جیسی سفید برتھ پر لیٹا خالص انگریزی اور امیر بلیشنگ انداز سے خراٹے لے رہا تھا۔ اور برابر والے کیبن میں دوسرا شخص بھی سو رہا تھا۔ وہ کمبخت دوسرا شخص سفید پردوں کی دوسری جانب۔ سفید ریشمی پردے جو آدھی رات کی سمندری ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ جہاز موجوں کے سفید جھاگ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اور اندھیرا گہرا ہوگیا۔ بہت گہرا۔ بہت گہرا۔

طلسمِ خیال

حبیب اشعر دہلوی

یہ ایک شخص کی کہانی ہے، جس نے برف سردی اور ہواؤں سے کانپتی رات میں ہمیں اپنے گھر بلایا، جو آبادی سے دور — وادیٔ قادیشا کے کنارے تنہا واقع تھا۔

لکڑی کی نوک سے — جو اس کے ہاتھ میں تھی — آتش دان کی راکھ کریدتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرے دوستو! تم چاہتے ہو کہ میں اپنے غم کا راز تم پر ظاہر کروں، وہ ٹریجیڈی تمہیں سناؤں، جسے ایک تصور، شب و روز میرے سینہ میں برپا کرتا رہتا ہے۔

تم میرے سکوت اور اخفائے راز سے اکتا چکے ہو۔ میری لمبی اور ٹھنڈی سانسوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے اور تم ایک دوسرے سے کہتے ہو، جب یہ شخص ہمیں اپنے درد و غم کے ہیکل میں داخل نہیں ہونے دیتا، تو ہم اس کی دوستی کے گھر میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں"

تم سچ کہتے ہو! میرے دوستو! جو کوئی ہمارے غم میں شریک نہیں ہوتا، وہ کبھی اور کسی حال میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اچھا! تو اب میری کہانی سنو! سنو! لیکن ہمدردی دکھانے کی کوشش نہ کرنا، اس لئے کہ ہمدردی کمزوروں کے لئے جائز ہوتی ہے اور میں اپنے غم کے ہر پہلو میں طاقتور ہوں۔

ابھی میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ نیند اور بیداری کے خوابوں میں ایک انوکھی شکل اور نرالی وضع کی عورت کی پرچھائیں مجھے نظر آنے لگی۔ میں اسے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر کے قریب کھڑے دیکھتا اور رفتار کی خاموشیوں میں اس کی آواز سنتا تھا۔ کبھی کبھی، جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا، تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی انگلیاں میری پیشانی کو مس کر رہی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک دم اٹھ بیٹھتا اور اپنی سماعت کی تمام تر قوتوں کے ساتھ "لاشے" کی سرگوشیوں پر کان لگا دیتا۔

میں اکثر اپنے دل میں پوچھا کرتا۔

"کیا میری آوارگیٔ خیال مجھے کہیں گم کر کے ہی دم لے گی؟ کیا میں نے اپنے خوابوں کے بخارات سے ایک خوبصورت، خوش آواز اور نرم و نازک عورت بنائی ہے کہ وہ اس عالم مادی سے تعلق رکھنے والی جیتی جاگتی عورت کی جگہ لے لے؟ کیا میرا دماغ چل گیا ہے، کہ میں نے عقل کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ کی تخلیق کی ہے، جسے میں چاہتا ہوں، جس سے مجھے انس ہے، جس پر میں بھروسہ کرتا ہوں، جس سے قریب ہونے کے لئے میں لوگوں سے دور ہو رہا ہوں، جسکی صورت دیکھنے اور آواز سننے کے لئے میں دنیا کی ہر صورت اور ہر آواز کی طرف سے اپنی آنکھ اور کان بند کر رہا ہوں؟ — تو کیا میں دیوانہ ہوں؟ سودائی ہوں؟ جس نے عزلت پسندی پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ تنہائی کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ — ایک شریکۂ حیات بھی پیدا کر لی؟

میں نے "شریکۂ حیات" کہا ہے، اور تم لوگ اس لفظ پر تعجب کر رہے ہو۔ لیکن اس عالم ہستی سے ماوراء کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جن سے ہم صرف متعجب ہی نہیں ہوتے بلکہ انکار بھی کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ ہمیں ناممکنات میں سے نظر آتی ہیں۔ نہیں ہمارا یہ تعجب اور انکار ان کی حقیقت کو محسوس کر سکتا، جو ہمارے نفس میں ایک مستحکم عمارت کی طرح قائم ہے۔

یہ خیالی عورت میری شریکِ حیات تھی، جو زندگی کی ہر خواہش، ہر کوشش، ہر خوشی اور ہر رغبت میں میرا ساتھ دیتی۔ میں صبح اٹھتا، تو دیکھتا کہ وہ میرے سرہانے تکیوں سے ٹیک لگائے، مجھے ان نگاہوں سے تک رہی ہے، جو بچپن کی پاکیزگی اور ماں کی مامتا سے لبریز ہیں۔ کوئی کام کرنا چاہتا تو وہ میرا ہاتھ بٹاتی۔ کھانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھتا تو وہ میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کرتی اور جب شام ہوتی، تو میرے قریب آتی اور کہتی۔

"اب ہمیں یہاں بہت دیر ہو گئی۔ آؤ ٹیلوں اور وادیوں کی سیر کریں!!"

میں فوراً کام چھوڑ دیتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیر کے لئے چل کھڑا ہوتا۔ یہاں تک کہ ہم جنگل میں جا پہنچتے، جس پر طلسم سکوت کے تاروں سے بنی ہوئی شام کی نقاب پڑی ہوتی، اور ہم ایک بلند چٹان پر پہلو بہ پہلو بیٹھ کر دور افق پر نگاہیں جما دیتے۔ وہاں کبھی تو غروب ہوتے سورج کی شعاعوں سے سنہری بادلوں کی طرف اشارہ کرتی اور کبھی اس پرندہ کی چہکار کی طرف توجہ دلاتی، جو شب گزاری کے لئے شاخوں میں پناہ لینے سے پہلے خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے کمرہ میں بے قرار و مضطرب بیٹھا ہوں کہ وہ آ گئی اور جونہی میری نگاہ اس پر پڑی، بے قراری سکون سے بدل گئی اور اضطراب، انس و یگانگی سے۔

بارہا میں لوگوں سے دوچار ہوا ہوں اور میری روح باغیانہ انداز میں ان کی فطرت کے برے پہلوؤں کے خلاف صف آرا ہوتی ہے۔ لیکن جہاں ان کے چہروں میں مجھے اس کا چہرہ نظر آیا، میرے باطن کا تمام طوفان، سماوی نغموں میں تبدیل ہو گیا۔

بسا اوقات یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ میں تنہا بیٹھا ہوں۔ میرے دل میں زندگی کے مصائب و آلام کی تلوار ہے اور گردن میں ہستی کی مشکلوں اور

دقیانوسیوں کی زنجیریں۔ لیکن مڑکر جو دیکھتا ہوں، تو وہ میرے سامنے کھڑی، مجھے ان نگاہوں سے دیکھ رہی ہے جن سے رونق ونور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی غم کے سارے بادل چھٹ گئے، دل خوشی کے راگ الاپنے لگا اور زندگی چشم بصیرت کے سامنے عشرتوں اور مسرتوں کی جنت بن کر جلوہ گر ہوگئی۔

تم مجھ سے سوال کروگے، میرے دوستو! کہ میں اس انوکھی حالت پر کیسے قانع رہا؟ پوچھوگے کہ انسان عنفوان شباب میں اس چیز پر کیسے اکتفا کر سکتا ہے، جسے وہم اور خیال، خواب —— بلکہ دیوانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اپنی عمر کے چند سال، جو میں نے اس حالت میں گذارے، اس حسن، سعادت، لذت اور اطمینان کا نچوڑ تھے۔ جن سے میں اپنی زندگی میں آشنا ہوا۔ کیوں کہ میں اور میری یہ اثیری رفیقہ ایک آزاد اور مجرد فکر تھے، جو سورج کی روشنی میں طواف کرتی ہے، سمندر کی سطح پر تیرتی ہے۔ چاندنی راتوں میں دوڑتی ہے اور وہ نغمے گنگناتی ہے، جنہیں کسی کان نے نہیں سنا، اس منظر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔

زندگی —— تمام وکمال زندگی —— ہمارے روحانی تجربات میں ہے اور ہستی —— تمام تر ہستی —— وجود کے عرفان وتحقیق میں، جس سے ہم خوش ہوتے ہیں یا اس کی وجہ سے دردناک۔ اور مجھے ایک روحانی تجربہ ہوگیا تھا —— شب وروز ہوتا رہتا تھا، یہاں تک کہ میں تیس برس کا ہوگیا۔

کاش! میں تیس برس کا نہ ہوتا! کاش! اس عمر کو پہنچنے سے پہلے مجھے ایک ہزار ایک بار موت آجاتی، جس نے میرا جوہر حیات سلب کر لیا اور میرے دل کا سارا خون نچوڑ کر مجھے شب وروز کے سامنے ایک تنہا، خشک اور بے برگ وبار درخت کی طرح کھڑا کر دیا، جس کی شاخیں نہ ہوا کے نغموں پر رقص کرتی ہیں، نہ پرندے اس کے پتوں اور پھولوں کے درمیان اپنے آشیانے بناتے ہیں۔

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں اس کی دونوں کلائیاں ڈھیلی پڑ کر کرسی کی پتھیوں پر لٹک گئیں اور وہ یاس ونومیدی کا مجسمہ معلوم ہونے لگا۔ ہم سب خاموش بیٹھے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں، جو مجروح ہستی کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی، کہا۔

بیس برس کا ذکر ہے: میرے دوستو! لبنان کے حاکم نے ایک علمی مہم کے سلسلہ میں مجھے وینس بھیجا اور وہاں کے محافظ کے نام ایک خط میرے ساتھ کر دیا، جس سے اس کی ملاقات قسطنطنیہ میں ہوئی تھی۔

میں لبنان کو خیرباد کہہ کر اطالوی جہاز میں سوار ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا، روح بہار ہوا کی تہوں میں سرسرا رہی تھی۔ سمندر کی موجوں کے ساتھ اٹھلا رہی تھی اور آسمان پر سفید بادلوں کے ہجوم میں قلابازیاں کھانے والی دلفریب صورتوں کے پیکر میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ان شب وروز کی تعریف، جو میں نے جہاز میں گزارے، تم سے کس طرح بیان کروں؟!

جو کلام انسان سمجھتا یا کہتا ہے وہ اس کے ادراک واحساس کی حدوں سے متجاوز نہیں ہو سکتا، اور روح میں ایک ایسی بات ہے جو ادراک سے کہیں زیادہ بعید اور شعور سے کہیں زیادہ رقیق ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں اس زمانہ کی تصویر، الفاظ میں، کیسے کھینچ سکتا ہوں؟!

وہ چند سال، جو میں نے اپنی اس اثیری رفیقہ کی معیت میں بسر کئے، انس والفت سے ہم کنار تھے اور مسرت وسکون سے لبریز۔ چنانچہ کبھی خواب میں بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میری سعادت کے پردوں میں غم چھپا بیٹھا ہے اور میرے ساغر کی گہرائیوں میں تلخی کی تلچھٹ نہیں! میں اس پھول کے مرجھانے سے کبھی نہیں ڈرا، جو بادلوں کے ماوراء اگا تھا اور اس نغمہ کی موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا، جو صبح کی پریوں نے گایا تھا۔

جب میں ان ٹیلوں اور وادیوں سے رخصت ہوا، تو میری رفیقہ اس گاڑی میں میرے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، جو مجھے ساحل پر چھوڑنے گئی تھی۔

وینس جانے سے پہلے میں تین روز بیروت میں مقیم رہا۔ اس دوران میں میری شریکۂ حیات مجھ سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوتی، جہاں میں جاتا، وہ میرے ساتھ جاتی اور جب ٹھہرتا، وہ بھی ٹھہر جاتی۔ میں اپنے کسی دوست سے ملتا، تو اسے بھی اس سے مسکراکر پیش آتے دیکھتا، کسی تفریح گاہ میں جاتا، تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں محسوس کرتا، اور اپنے کمرہ کی کھڑکی میں بیٹھ کر شہر کی آوازوں پر توجہ صرف کرتا، تو وہ فکر وتامل میں میرا ساتھ دیتی۔ لیکن جب کشتی نے مجھے بیروت کی بندرگاہ سے جدا کیا اور میں نے جہاز پر قدم رکھا تو اسی لمحہ اپنی فضائے روح میں ایک تغیر اور ایک طاقت ور مخفی ہاتھ کو اپنا بازو پکڑتے محسوس کیا۔ میں نے ایک گہری آواز سنی، جو سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"واپس ہوجا جہاں سے آیا ہے، وہیں واپس ہوجا! کشتی میں بیٹھ! اور جہاز چلنے سے پہلے اپنے ملک کے ساحل کی طرف لوٹ جا!"

آخر کار جہاز روانہ ہوا اس کی پشت پر میں ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے فضائے بسیط میں اڑتے ہوئے باشہ کے چنگل میں چڑیا۔ شام ہونے پر، جب لبنان کی چوٹیاں سمندر کی لہر کے پیچھے روپوش ہوگئیں، تو میں نے خود کو جہاز کے اگلے حصہ پر تنہا کھڑے پایا۔ میرے خوابوں کی پری —— وہ عورت، جسے میرا دل پیار کرتا تھا —— وہ عورت جو میری رفیقۂ شباب تھی، میرے ساتھ نہ تھی۔ وہ نوخیز حسینہ، وہ شیریں

کلام محبوبہ، جس کا چہرہ، جب بھی میں فضا پر نگاہیں جماتا تھا، مجھے نظر آتا تھا۔ جس کی آواز، جب بھی میں خاموشی پر کان لگاتا تھا، مجھے سنائی دیتی تھی اور جس کا ہاتھ، جب بھی میں آگے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، میرے [illegible] مس ہوتا تھا، جہاز میں نہ تھی، اور پہلی مرتبہ —— ہاں! بالکل پہلی مرتبہ میں نے خود کو رات، سمندر اور فضا کے سامنے یکہ و تنہا محسوس کیا۔

جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا اور میں اپنی رفیقہ کو دل ہی دل میں پکارتا رہا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی موجوں کو تکتا رہا کہ شاید کف سمندر کی سفیدی ہی میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دے جائے۔

جب رات بھیگی، تو جہاز کے مسافر اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن میں جہاں کھڑا تھا، سرگشتہ و تنہا، حیران و مضطرب وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہے۔ مجھے جھرجھری سی آگئی، اور میں نے اس طرف ہاتھ بڑھا کر بلند آواز میں کہا:

"مجھے نہ چھوڑ، خدارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ! تو کہاں چلی گئی تھی؟ تو کہاں تھی؟ میری محبوبہ! میرے پاس آ! آ، میری جان! میرے پہلو میں آ، اور مجھے کبھی نہ چھوڑ!"

لیکن وہ میرے پاس نہ آئی، بلکہ بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ رنج والم کی شدت سے اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس سے زیادہ خوفناک منظر میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ گھٹی ہوئی پست آواز میں اس نے کہا۔

"میں تجھے ایک نظر —— ہاں! صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے سمندر کی گہرائیوں سے آئی ہوں۔ اور اب پھر وہیں واپس جا رہی ہوں۔ تو بھی جا اور اپنی خوابگاہ میں آرام سے سو!"

یہ کہکر وہ کہر میں تحلیل ہو گئی۔ میں اسے بھوکے بچے کی طرح لجاجت سے پکارتا، اور اس کو پکڑنے کے لئے ہر طرف بازو پھیلاتا رہ گیا، لیکن شبنم شب سے گراں بار ہوا کے سوا اور کچھ میرے ہاتھ نہ آیا۔

مجبور و مایوس میں اپنے کمرے میں واپس آیا، عناصر میری روح میں سر پٹک رہے تھے، کبھی گرتے تھے، کبھی اٹھتے تھے۔ بالفاظ دیگر میں اس جہاز میں ایک دوسرا جہاز تھا، جو شک و شبہ اور یاس و نومیدی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ جونہی میں نے تکیہ پر سر رکھا، پلکوں پر ایک بوجھ اور جسم میں ایک کسل محسوس ہوا۔ چنانچہ فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔ اسی دوران میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری رفیقہ سیب کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت میں، پھانسی پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے تلووں اور ہتھیلیوں سے خون کے قطرے بہہ بہہ کر درخت کی شاخوں اور پتوں پر ٹپک رہے ہیں اور وہاں سے گھاس پر گر گر کے زمین پر بکھرے ہوئے پھولوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

جہاز شب و روز کی مسافتیں طے کرتا رہا۔ میں اس میں سوار تھا لیکن اس سے بے خبر کہ میں انسان ہوں، جو ایک انسانی مہم کے سلسلہ میں اتنے طول طویل سفر پر جا رہا ہے، یا ایک پرچھائیں، جو کہر کے سوا ہر چیز سے خالی فضا میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ چنانچہ نہ میں نے اپنی رفیقہ کی قربت محسوس کی، نہ بیداری یا خواب میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں بے سود محض قوتوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ مجھے اس کے منہ کی کوئی بات سنوا دیں، یا اس کی ایک جھلک دکھوا دیں۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو کم از کم مجھے اس قابل کر دیں کہ میں اپنی پیشانی پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر سکوں۔

چودہ دن تک میری یہی حالت رہی۔ بالآخر پندرھویں دن دوپہر کو دور سے اطالیہ کا ساحل نظر آیا اور اسی دن شام ہوتے جہاز وینس کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ لوگ مسافروں اور ان کے سامان کو جہاز سے اتار کر شہر میں پہنچانے کیلئے بہت سی کشتیاں لیکر آ گئے، جو مختلف رنگوں اور طرح طرح کی تصویروں سے مزین تھیں۔

تم جانتے ہو! میرے دوستو! وینس بہت سے چھوٹے چھوٹے قریبی جزیروں پر قائم ہے، اس کے مکانوں اور عمارتوں کی بنیاد پانی میں رکھی گئی ہے۔ وہاں سڑکوں کی بجائے نہریں ہیں اور گھوڑے گاڑیوں کا کام کشتیوں سے لیا جاتا ہے۔

جب میں جہاز سے اتر کر کشتی میں آیا تو ملاح نے مجھ سے پوچھا!

"کہاں جائیں گے؟ حضور!"

میں نے شہر کے محافظ کا نام لیا تو اس نے نہایت اہتمام و احترام کے ساتھ مجھے دیکھا، اور کشتی کھینے لگا۔

کشتی مجھے لیکر روانہ ہوئی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی اور اس نے سارے شہر کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ عظیم الشان عمارتوں، عبادت گاہوں اور عشرت کدوں کی کھڑکیاں بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں اور اس روشنی کا عکس متحرک پانی میں پڑ کر ایک ایسا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ ذہین شاعر کا خواب معلوم ہونے لگا تھا۔

کشتی ابھی پہلی ہی نہر کے موڑ پر پہنچی تھی کہ میں نے بے شمار گھنٹوں کی جھنکار سنی، جو فضا کو غمناک اور پُردرد آوازوں سے لبریز کر رہے تھے۔ گو اس وقت میری ذہنی بے خبری نے مجھے تمام خارجی مظاہر سے بے تعلق کر رکھا تھا، لیکن گھنٹوں کا وہ شور نیزوں کی طرح میرے سینے کو چھیدے ڈال رہا تھا۔

کشتی ایک سنگین زینہ کے پاس جا کر رک گئی، جس کی سیڑھیاں سطح آب سے شروع ہو کر ایک پختہ راستہ پر تمام ہوتی تھیں۔ ملاح نے مڑ کر مجھے دیکھا

اور ایک شاندار مکان کی طرف اشارہ کر کے جو باغ کے وسط میں تھا، کہنے لگا۔

"یہی ہے وہ جگہ!"

میں کشتی سے اترا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ملاح اپنے کندھے پر میرا سوٹ کیس رکھے، پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب میں مکان کے دروازہ پر پہنچا، تو ملاح کو اس کی اجرت دیکر رخصت کیا اور اس کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ کھلا تو خمیدہ سر خادموں کا ایک گروہ میرے سامنے تھا جو رو رہا تھا، نالہ ماتم کر رہا تھا گھٹی گھٹی آہیں بھر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا خادم میری طرف بڑھا اور مجھے مجروح نگاہوں سے دیکھکر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"فرمائیے! کیا ارشاد ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیا دمشق کے محافظ صاحب کا دولت خانہ یہی ہے؟"

اس نے ایجابی طور پر اپنا سر جھکا دیا۔

میں نے حاکم لبنان کا خط نکال کر اسے دیا۔ پہلے تو اس نے خاموشی سے اس کا پتہ دیکھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دروازہ کی طرف چلا، جو ڈیوڑھی کے آخری سرے پر تھا۔

یہ سب کچھ ہوا، لیکن جہاں تک فکر و ارادہ کا تعلق ہے، میں بالکل خالی الذہن تھا۔ اس کے بعد میں ایک نوجوان خادمہ کے قریب گیا اور ان لوگوں کے نوحہ ماتم کا سبب معلوم کیا۔ دردناک لہجہ میں اس نے جواب دیا۔

"تعجب ہے! آپ نے نہیں سنا کہ آج محافظ صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا!"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

میرے دوستو! اس شخص کی حالت پر غور کرو! جس نے ایک مبہم فکر کی مثال سمندر کا سفر طے کیا اور اس فکر کو فضا کی ایک قہرمانی قوت نے کف آگیں موجوں اور خاکستری کہر میں تلف کر دیا۔ اس نوجوان کی کسمپرسی و بے چارگی کا اندازہ کرو! جو یاس و نومیدی کی آہ و زاری اور سمندر کی چیخ پکار کے درمیان دو ہفتہ تک مصروف سفر رہا اور جب منزل مقصود پر پہنچا، تو خود کو ایک ایسے مکان کے دروازہ پر دیکھا جس کے گوشوں میں درد و الم کی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں اور جس کی فضا رنج و غم کی آہ و کراہ سے لبریز تھی۔ اس غریب الوطن انسان کا تصور کرو! میرے دوستو! جو ایک ایسے محل میں مہمان ہونے کے لئے پہنچا، جس پر موت کے سیاہ بازو سایہ فگن تھے۔

وہ نوکر جو میرا خط لے کر اپنے آقا کے پاس گیا تھا واپس آیا اور سر جھکا کر کہنے لگا۔

"تشریف لائے! سرکار آپ کا انتظار فرما رہے ہیں!"

یہ کہکر وہ میرے آگے آگے ہو لیا۔ جب ہم اس دروازہ پر پہنچے، جہاں راستہ ختم ہوتا تھا۔ تو اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا، اور میں ایک وسیع کمرہ میں داخل ہو گیا جس کی چھت اونچی اور فضا شمعوں سے روشن تھی۔ وہاں کچھ باوقار و معزز و معتقد حضرات بیٹھے تھے جن پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میں بمشکل دو چار ہی قدم چلنے پایا تھا کہ صدر سے ایک سفید ریش بوڑھا، جس کی کمر و فور غم سے جھک گئی تھی اور جس کا چہرہ شدت الم سے بے رونق ہو گیا تھا، اٹھا اور میری طرف بڑھکر یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے سخت اذیت ہے کہ آپ اتنا طول طویل سفر طے کر کے یہاں تشریف لائے اور ہمیں اپنی عزیز ترین متاع کے غم میں مبتلا پایا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری یہ ابتلا، اس غرض کی تکمیل میں حائل نہ ہو گی جس کیلئے آپ نے اتنی زحمت گوارا فرمائی ہے، لہذا آپ کو بالکل پریشان نہ ہونا چاہیئے!"

میں نے چند بے ربط الفاظ میں اس کی مصیبت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس مہربان کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے ایک کرسی کی طرف لے گیا، جو دیوان کے قریب رکھی تھی اور میں بھی حاضرین کی طرح ساکت و صامت بیٹھ گیا۔ نگاہیں بچا کر کبھی تو میں ان کے غمگین چہروں کو دیکھتا تھا اور کبھی ان کی سرد آہیں سنتا تھا، جو میرے دل کے پرخچے اڑائے دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے لوگ وہاں سے چلے گئے اور اس خاموش کمرہ میں میرے اور غمزدہ باپ کے سوا، اور کوئی نہ رہا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا اور اس کی طرف بڑھ کر کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے!"

التجائی لہجہ میں اس نے جواب دیا۔

"نہیں! اتنی جلدی نہ تشریف لے جائیے! اگر آپ ہمارے رنج و غم کو دیکھنے اور ہماری آہ و فریاد سننے کی تاب رکھتے ہیں، تو ابھی ہمارے مہمان رہئے!"

اس کے ان الفاظ نے مجھے شرمندہ کر دیا اور میں نے امتثال امر کے طور پر سر جھکا دیا۔ اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مہماں نوازی کے سلسلہ میں اہل لبنان دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم سے ممتاز ہیں۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں قیام فرمائیں تاکہ ہم بھی — گو پورے طور پر نہ سہی، لیکن آپ کے لئے وہ آسائش بہم پہنچانے کی کوشش کریں جو ایک پردیسی کو آپ کے ملک میں ملتی ہے!"

تھوڑی دیر کے بعد غمزدہ بوڑھے نے نقرئی گھنٹی بجائی اور ایک ملازم زرکار لباس پہنے کمرہ میں داخل ہوا۔ بوڑھے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے معزز مہمان کو مشرقی کمرہ میں پہنچا دو اور آپ کے اکل و شرب کا خیال رکھو۔ دیکھو! آج سے تمہارا کام بس یہی ہے کہ آپ کے راحت و آرام میں رتی برابر خلل نہ آنے پائے۔"

ملازم مجھے ایک کشادہ اور خوش وضع کمرہ میں لے گیا، جس میں قیمتی فرش بچھا تھا اور جس کی دیواریں تصویروں اور ریشمی پردوں سے مزین تھیں۔ وسط میں ایک نفیس مسہری تھی اور مسہری پر ایک قیمتی کمبل اور کرسی پر خوش نما تکئے رکھے تھے۔

دو گھنٹے اسی بے قراری کے عالم میں گذر گئے کہ میں کبھی تو کمرے میں ٹہلنے لگتا اور کبھی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر فضا کو تکنے لگتا، یا ملاحوں کی آوازوں اور پانی میں چپوؤں کی جنبشوں پر کان لگا دیتا۔ یہاں تک کہ بیداری نے مجھے تھکا دیا اور میری فکر زندگی کے مظاہر و اسرار میں گم ہو گئی۔ میں مسہری پر گر پڑا اور خود کو ایک نیم شعوری کیفیت کے حوالے کر دیا، جو نیند کی مدہوشی اور بیداری کی ہوشیاری سے مرکب تھی جس میں یاد اور فراموشی اس طرح گردشیں لے رہی تھی، جیسے ساحل پر سمندر کا مدو جزر۔ اس وقت میں ایک خاموش میدان کارزار کی مثال تھا جس میں فوجیں خاموشی کے ساتھ مصروف پیکار تھیں۔ موت کا دیو سپاہیوں کو برابر زمین پر دے مار رہا تھا، اور وہ خاموشی سے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتے تھے۔

میرے دوستو! مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اس حالت میں کتنے گھنٹے گذارے۔ زندگی میں بہت سے میدان ہیں جنہیں ہماری روحیں طے کرتی ہیں۔ لیکن ہم انہیں مادی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے، جن کی ایجاد انسانی فکر و نظر کی مرہون ہے۔

نہیں! میں نہیں جانتا کہ میری یہ حالت کب تک رہی؟ مجھے تو اس وقت بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا اور آج بھی صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نیم شعوری کیفیت کے دوران میں، میں نے اپنے بستر کے قریب ایک زندہ ہستی محسوس کی — ایک قوت محسوس کی، جو کمرہ کی فضا میں مرتعش تھی۔ — ایک ابھری وجود محسوس کیا، جو بغیر کسی آواز کے مجھے پکار رہا تھا اور بغیر کسی اشارہ کے مجھ میں جوش و ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک ہمہ گیر و قوی اثر کے تحت کمرہ سے نکل باہر آگیا۔ میرے قدم غیر ارادی طور پر اٹھ رہے تھے۔ میں اس شخص کی طرح چل رہا تھا، جو سوتے میں چلتا پھرتا ہے، اور اس عالم میں چل رہا تھا، جو وقت اور فاصلہ کی قیدوں سے یکسر آزاد تھا۔ یہاں تک کہ میں نے سامنے ڈیوڑھی طے کر لی اور ایک بہت بڑے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

کمرہ کے وسط میں ایک لاش رکھی تھی، جس کے دائیں بائیں دو لمپ روشن تھے اور چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میں نے قدم بڑھایا اور مجلس کو دیکھا۔ اُف! وہ میری محبوبہ کا چہرہ تھا — میرے خوابوں کی پری کا چہرہ تھا، جس پر موت نے اپنی باریک نقاب ڈال رکھی تھی۔ آہ! میری آنکھوں کے سامنے وہ عورت تھی، جس سے میں محبت سے بڑھ کر محبت کرتا تھا، سفید پھولوں کے درمیان، سفید کفن میں، وہ سفید و بے جان جسم تھا جس پر زمانے کی خاموشی اور ازل کی دہشت طاری تھی۔

اے خدا! اے محبت، زندگی اور موت کے مالک! تو ہی ہے جس نے ہماری روحوں کو پیدا کیا اور نور و ظلمت کے اس ہجوم میں پھینک دیا۔

تو ہی ہے، جس نے ہمارے دلوں کی تخلیق کی اور انہیں امید والم کی دھڑکنیں عطا فرمائیں۔

ہاں! تو ہی ہے، جس نے میری رفیقۂ حیات سے مجھ کو ملایا، لیکن اس وقت جب اس کا تاب ناک جسم سرد و بے جان ہو چکا تھا۔

تو ہی ہے، جس نے مجھ پر ظاہر کرنے کے لئے کہ موت زندگی سے کیا چاہتی ہے اور غم خوشی سے کیا غرض رکھتا ہے مجھے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچایا۔

تو ہی ہے جس نے میری وحدت و تنہائی کے جنگل کو ایک سفید چنبیلی کے پھول سے زینت بخشی اور اس کے بعد مجھے — دور ایک وادی میں پھینک دیا، تاکہ میں وہاں اس پھول کو مرجھایا ہوا دیکھوں۔

ہاں میرے دوستو! میری عزلت و تنہائی کے رفیقو! اللہ نے چاہا اور اپنی مشیت کے لئے مجھے اندوہ کا تلخ جام پلا دیا۔

ہم انسان، ہم لا محدود فضا کے مرتعش ذرے، اطاعت و فرماں برداری کے سوا، کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اگر محبت کرتے ہیں تو وہ محبت ہماری طرف سے ہوتی ہے، نہ ہمارے لئے ہوتی ہے۔ ہم اگر خوش ہوتے ہیں، تو وہ خوشی ہماری ذات میں نہیں ہوتی، بلکہ نفس حیات میں ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم درد ناک ہوتے ہیں، تو وہ درد ہمارے زخموں سے نہیں پھوٹتا، بلکہ منشائے فطرت سے پھوٹتا ہے۔

دوستو! میں نے نہیں کہانی شکایتاً نہیں سنائی۔ اس لئے کہ جو کوئی شکایت کرتا ہے، وہ زندگی پر شک کرتا ہے اور میں صاحب ایمان ہوں، اس تلخی کی صلاحیت پر ایمان رکھتا ہوں، جس کا حاصل ہر وہ گھونٹ ہے۔ جو میں ساغر شب کے ذریعہ پیتا ہوں، ان میخوں کے حسن و دلکشی پر ایمان رکھتا ہوں، جو میرے سینہ کو چھیدے ڈالتی ہیں۔ ان فولادی انگلیوں کی نرمی و ملائمت پر ایمان رکھتا ہوں جو میرے دل کے پردہ کو چھیر چھیر کئے دیتی ہیں۔

"دوستو! یہ ہے میری کہانی! میں اس کا انجام کیا بیان کروں، جبکہ اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ میں اس نوخیز حسینہ کی میت کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا رہا، جیسے میرا دل خواب و خیال کی دنیا میں جا پہنچا تھا۔ اور میری نگاہ ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے سے نہ ہٹی۔ یہاں تک کہ صبح نے

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

یہ دُکھی لوگ

شمشیر سنگھ نرولا

بستر سے اٹھتے ہی رائے بہادر کو خبر ملی کہ بیبی ڈبلا، غسل خانہ میں پانی کے بڑے ڈول میں ڈوب کر مر گیا ہے۔ وہ ادبیات سے اپنے شوق کا اظہار کرتا ہوا کہانیوں کا ایک رسالہ منہ میں دبائے کھیلتا کودتا نہ جانے کس طرح اس میں جا گرا تھا۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے وہ مدد کے لئے بھونک بھی نہ سکا کوئی اور دن ہوتا تو اس دلپسند بیلے کے لئے وہ ایک آدھ آنسو ضرور بہا! لیکن اس وقت وہ بہت پریشان تھا۔ البتہ اس خبر نے اسکی پریشانی میں اضافہ ضرور کر دیا۔

رائے بہادر نے اپنے دکھی چہرے کو سامنے کے قد آدم آئینہ میں دیکھا۔ رولڈ گولڈ کے فریم والا حسین آئینہ جو حال ہی میں اس نے چور بازار سے ڈیڑھ ہزار میں خریدا تھا۔ اس نے دیکھا کہ حقیقتاً اس کا چہرہ نہایت پژمال ہے۔ آئینہ کے قریب تر ہو کر وہ چہرہ کے عکس کو بغور دیکھنے لگا۔ آغاز دوپہر کی ایک گرد آلود شعاع سے اس کے چہرہ کو اجال دیا تھا، اس نے ناک سکیڑ کر اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ انتہائی آزردہ ہے۔ اور رات ہی بھر میں اس کا چہرہ بہت اتر گیا ہے۔ اس کے کشادہ مساموں والے گال آڑی ترچھی لکیروں سے بھر گئے گویا وہ اپنے آپ کو منہ چڑا رہا ہو۔ یہ باریک مگر گہری جھریاں اس کے چہرہ پر گڑی ہوئی نامکمل شکلوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں واقعی جو ذلیل حادثہ اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس پہ مغموم ہونا ہی چاہیے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلاتے ہوئے سوچا۔

کل رات کلب میں اسے بیحد ذلت اور کوفت اٹھانی پڑی تھی۔ پیرس سوسائٹی کے ایک افسر نے جو کلب کا ممبر تھا ان سب سے ہندوستانی اسیران جنگ کے لئے پرانے کپڑوں کی فرمائش کی تھی۔ کسی سے انکار نہیں بن پڑا۔ اور سب کو ایک ایک سوٹ ریڈ کراس ڈیپو میں پہنچا دینے کا اقرار کرنا پڑا۔

وہ خاندانی رئیس تھا۔ اس لئے امیر ہی نہیں بلکہ نرم دل بھی تھا، تاہم کپڑے دان کرنا خارج کا کھیل نہیں۔ اس کے پاس کپڑے تو بہت تھے۔ لیکن کسی کو پرانا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک سے ایک بڑھیا تھا۔ بالآخر اس نے ٹویڈ کے اوورکوٹ کا انتخاب کیا جسے ابھی اس نے صرف دو دفعہ پہنا تھا۔ جی کڑا کر کے اس نے یہ اوورکوٹ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیپو میں بھجوانے کیلئے دے دیا

پرائیویٹ سیکرٹری نے اپنے کمرہ میں جا کر اس کوٹ کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اتنا عمدہ کوٹ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل للچایا اس نے کوٹ سنبھال کر رکھ لیا اور اپنا قدرے پرانا اور نسبتاً سستا اوورکوٹ چپڑاسی کو دینے کے لئے خانساماں کے حوالے کیا اور ساتھ ہی ڈیپو کا پتہ پرچی پر لکھ کر دے دیا۔

اتنا نفیس اوورکوٹ دیکھ کر خانساماں کی نیت میں فرق نہ آتا۔ اس نے وہ اوورکوٹ چھپا لیا اور ایک پرانا دھرانا اوورکوٹ جو اس نے لڑائی سے پہلے سیکنڈ ہینڈ کوٹوں کی دوکان سے خریدا تھا سر پرچی کے چپڑاسی کے حوالہ کیا۔ چپڑاسی کے کوٹ سے یہ کوٹ ہزار جا بہتر تھا۔ اس کے کوٹ کے کالر کا وجود تو عدم کے برابر تھا۔ صرف ایک جیب سلامت تھی آستینوں کے کنارے بالکل ادھڑ چکے تھے۔ کہنیاں بالکل پھٹی تھیں۔ یہ ثابت کوٹ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے وہ کوٹ پہن لیا اور اپنا چیتھڑے والا ساکوٹ کاغذ میں لپیٹ کر ڈیپو میں دے آیا۔

کچھ عرصہ تو وہ کوٹ اسیران جنگ کو رائے بہادر اقبال چند کا تحفہ، کے کارڈ کے ساتھ نمائشی کھڑکی میں لٹکتا رہا اور کل شام کو یک بیک ریڈ کراس کا وہی افسر اس کوٹ کو مرے ہوئے چوہے کی طرح چھڑی سے لٹکائے کلب میں آ پہنچا۔ آدھا گھنٹہ قہقہے لگتے رہے اور رائے صاحب کی یہ حالت کاٹو تو لہو نہیں۔ سب سے اذیت خیز بات تو یہ تھی کہ ان کمینے نوکر لوگوں میں سے کسی کو برطرف بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ایام جنگ میں اتنے سستے نوکروں کا دوبارہ ملنا ناممکن تھا۔

رات کی اس رسوائی کا اثر ابھی اس پر باقی تھا۔ اس پر جاگتے ہی پہلی خبر بیبی کی موت کی ملی اس کے دونوں بچے بیبی سے دل و جان سے محبت کرتے تھے وہ انہیں رو رو کر جان ہلکان کرنے سے کیسے روک سکے گا؟ اس خیال سے وہ اور بھی کبیدہ خاطر ہو گیا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک ایسا کلاک ہے جس کی چابی عرصہ دراز ہوا ختم ہو چکی ہے اور جس کے ایک ایک پرزے اور سپرنگ پر میل اور گرد کی تہیں جم گئی ہیں اس کا حلق ان روئے آنسوؤں سے گھٹنے لگا۔ وہ پسماندہ ہی نہیں بلکہ شکست خوردہ سا محسوس کر رہا تھا۔

سچ پوچھئے تو اس کی ہر صبح شکست سے شروع ہوتی تھی۔ اس کی زندگی ہی ایک مسلسل شکست تھی۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھا صبح سات بجے اٹھنا باغیچہ کے برابر والی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر ورزش کرنا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور باتھ کے بعد ہوم منڈ ٹیپ میں سندھیا اور بعد ازاں بیوی بچوں کے ساتھ شامل ہو کر ناشتہ کی میز پر صدارت کے فرائض انجام دینا اور بیٹر کا رزلٹ لے جاتے ہوئے بچوں کو کانونٹ دانگریزی اسکول) چھوڑنے جانا۔ لیکن فی الواقع جو ہوتا تھا وہ یہ تھا۔ نیند لانے کے لئے رات کو اسے نیند لانے کی دو ٹکیاں کھانی پڑتی تھیں۔ اس کی بیوی تو پلنگ پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگتی تھی۔ بخود میں بھی کئی عمر ہیں جب ان سے باتیں کرتے کرتے دل چاہتا ہو تو یہ سو جاتی ہیں۔ اور جب اپنے آپ غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔ تو وہ زبان تینچی کی طرح

جلا کر نیند حرام کر دیتی ہیں۔ وہ رانوں کی ٹکیہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہ بہت دیر تک بیوی کی گہری سانسیں گنتا رہتا۔ اسے یہ ٹکیہ کھانے سے اسی طرح کراہت ہوتی جیسے وہ کوئی انتہائی قبیح گناہ کر رہا ہو جار و ناچار وہ پانی کی ایک دو گھونٹ کے ساتھ ٹکیہ نگل گیا۔

اب اس دوا کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ نیند اکھڑی اکھڑی سی رہتی اور وہ ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہا ہوتا کہ صبح کی بیداری کا خوف اسے پریشان کرنے لگتا۔ جیسے جیسے لوٹنے کا سماں قریب آتا ویسے ہی ویسے اس کا نیم خوابیدہ سر بھاری ہوتا جاتا۔ نوکر گھر کا کام کاج شروع کر دیتے اور ان کی کھٹ پٹ کی آوازیں خواب کی آوازیں بن جاتیں۔ اسے نیند ہی میں کارخانے کی مشینوں کا پوری رفتار سے چلنے کا شور سنائی دینے لگتا۔ وہ آنکھیں اور بھی زور سے موند کر اور رضائی تان کر ٹانگیں پھیلا دیتا۔ اسے محسوس ہونے لگتا کہ دنیا کی بہترین چیز مر جانا ہے۔ آرام سے لیٹ کر زندگی عزیز الحیات کو خیر باد کہہ دینا چاہئے لیکن اُف اس سے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا بیدار ہو کر روزمرہ کا عمل شروع کرنا اس کے لئے کم مشکل نہ تھا قریب کے کمرے میں بچے اس کی ماں کہا کرتی رہتی تھی اور وہ سمجھا کرتا تھا کہ کسی وجہ سے نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن ماں کو لڑکوں کے کوارٹروں میں بھجوا دینے پر بھی اس کی نیند اچاٹ رہتی تھی اور ابھی ایک آدھ ہی جھپکی آئی ہوتی کہ دھنگا رکھنے میں ان بیلنگ مشینوں نے گرا پہنچتا۔ اس کی بیوی کا حکم تھا کہ خادم ٹھیک نو بجے اسے لے کر کمرے میں پہنچ جائے۔ زیادہ سگرٹ پینے کی وجہ سے اس کے گلے میں کانٹے چبھتے رہتے تھے۔ اور اگر جاگتے ہی وہ اس آلہ سے بھاپ کے سانس نہ کھینچتا تو اس کی آواز تک نہیں نکل سکتی تھی۔ اب اس کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا تھا غالباً اس وجہ سے کہ نوکر اب پانی اور صنوبر کے تیل کا مناسب مرکب تیار نہیں کرتا تھا۔

بھاپ لینے کے فوراً ہی بعد وہ پلنگ سے اٹھ جاتا۔ کئی بار تو وہ گھنٹہ گھنٹہ بھر پلنگ پر بیٹھا خالی نظروں سے سامنے کی طرف دیکھتا رہتا۔ بالآخر وہ باتھ روم میں جا کر نیم سے کر نہانے کی تیاری شروع کر دیتا اسے پانی سے اتنا ڈر محسوس ہوتا تھا جتنا اور لوگوں کو آگ سے بھی نہیں ہوتا ہاتھ میں صابن لگائے وہ بجس بیٹھا رہتا۔ اور انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر بچوں کی طرح صابن کا "شیشہ" بنانے میں لگ جاتا۔

اسے ہر چیز غیر حقیقی پر کوئی تیز رفتار اور ہر کام وقت طلب معلوم ہوتا تھا اسے افسوس ہوتا کہ کیوں خدا کے پاس صرف اس کے ہی لئے کوئی خوشگوار دن نہیں۔ بارش اس کی آزردگی میں اضافہ کر دیتی دھوپ اس کے ذہن کو اور بھی خالی اور سونا کر دیتی۔ یہ دوپہر سے پہلے کا وہ وقت تھا جب پانی گنگنا ہوتا ہے۔ اور دھوپ کھڑکی کے شیشوں میں سے ہوتی ہوئی ستاروں کی طرح پانی میں جھلکنے لگتی ہے۔

لیکن اس دن اس نے غسل خانہ میں بھی زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا۔ وہ بے حد بےچین تھا اور اضطراب کے عالم میں قدِ آدم آئینہ کے بالمقابل کھڑا اپنے اداس اور بگڑے ہوئے چہرے کے عکس کا جائزہ لگاتا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اس سے کوئی اور کام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے خیال میں غمگین ہونا دن بھر کے لئے کافی کام تھا۔

اس کی آنکھیں آئینہ میں اپنے عکس پر بدستور جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ بند کر کے مسکراہٹ کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے جبڑے اکڑے ہوئے تھے۔ وہ قہقہہ بھی نہیں لگا سکا البتہ اس کوشش میں اس کے لبوں کے کونے بڑے عجیب طریقے سے لٹک گئے اور چہرہ مغموم تر ہو گیا۔ ٹکٹکی لگانے سے اس کی آنکھ میں پانی کا ایک قطرہ نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھ جھپک کر اسے گرا دیا اور زور سے چھینک ماری۔

ساتھ ہی پیچھے سے بیوی کی آواز آئی "آپ تو بچوں سے بھی بڑھ کر ضدی ہیں لاکھ کہا کہ ربڑ کی سلیپر بغیر جرابوں کے پہننے سے سردی لگ جاتی ہے"

بیوی کی غیر متوقع موجودگی سے وہ بھونچکا ہو گیا وہ اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھا چند لمحات کے لئے ان میں وہی باتیں ہوئیں جو خاوند بیوی کے درمیان عموماً ہوتی ہیں۔ اس بار فروری میں ہی بلا کی گرمی پڑنے لگی ہے۔ تمہارا زکام ابھی اچھا نہیں ہوا۔ مونگی کی دال کا بھاؤ آسمان سے پر چڑھ گیا ہے۔ "کاکے کو ٹھنڈا دودھ نہ پینے دے دیا دست آ رہے ہیں؟" "بیبی کو آیا نے زیادہ گرم دودھ پلا دیا مروڑ ہو رہے ہیں۔"

اس کی بیوی ایک باتصویر فلمی رسالے کے ورق الٹنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ وہ پڑھ نہیں رہی ہے اور نہ تصویریں دیکھ رہی ہے صرف ورق گردانی کر رہی ہے۔ اس کی بیوی نے عمدہ کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے یقیناً کہیں باہر جانے کی تیاری تھی۔ پشمینے کا جیکٹ دلی و ڈیلائنگ شاپ والوں نے کچھ ایسی استادی سے سیا تھا کہ اس کا سوکھا ہوا سینہ بھی ابھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا رومال تھا جس میں وہ بار بار کھانس رہی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ پیلا اور تیکھا سا تھا۔ اس کی موٹی موٹی بے حد کالی آنکھیں اس قدر غم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یاس اور تمنا کی دو گہری جھیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ اس ہیٹھی بیٹھی دلکش ادا سی نے اس کے میٹراپ چہرہ کو بیحد کشش انگیز بنا دیا تھا۔

یہ خوبصورتی اس کی بیوی کو بغیر سعی اور کاوش کے نہیں حاصل ہوئی تھی اس کے لئے بہت روپیہ اور وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ اکثر ان مقامات پر جانا پڑتا تھا۔ جہاں مختلف چیزوں سے چہرے کو خوبصورت بنایا جاتا ہے ورنہ حسن ماند پڑ جاتا ہے اور اصل چہرہ چھپائے نہیں چھپتا سب سرخی یا پوڈر بیکار رہتا ہے۔ بیوٹی ایکسپرٹ نے اسے چھ شکلوں میں سے ایک کا انتخاب

کرنے کے لئے کہا تھا سنجیدہ، شرمیلی شرارتی، شوخ، ہنس مکھ یا مغرور، اس نے شوخ بننا پسند کیا تھا۔ اسے چہرہ پر ایک خاص طریقے سے ایک خاص کیفیت کے رنگ والے پاؤڈر کی تہیں جمانا سکھایا گیا تھا۔

غازے کے بلیتھن کے باوجود اس کی بیوی کی آنکھیں سوجی سوجی سی معلوم ہو رہی تھیں، شاید اس نے بچی کے غم میں بہت زیادہ آنسو بہائے تھے

"کہاں کی تیاری ہے ڈارلنگ" اسے اور کوئی بات نہ سوجھی۔

"دگلیمر" اس کی بیوی نے فوراً جواب دیا اور فاتحانہ انداز سے مسکرائی گلیمر جوہری کی دوکان پر بیچی سیپیوں کا ایک ہار تھا جس پر "میڈ اِن نیپلز" لکھا ہوا تھا۔ لڑائی کے دنوں میں اس کی قیمت کا پانچ سے پانچ ہزار ہو جانا چنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرا آدمی کتنا ہی فراخدل کیوں نہ ہو۔ کبھی نہ کبھی مکھی چوس بن ہی جاتا ہے۔ ہفتہ بھر "خانہ جنگی" ہوئی اور حسب معمول اسے ہی بیوی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس کی بیوی اٹھ کر چلی گئی اور وہ پتلی ساڑھی میں اس کی جھلکتی ہوئی پنڈلیاں دیکھتا رہ گیا۔

بیوی کو جلدی ہی واپس آتے دیکھ کر اس کی حیرانی کی حد نہ رہی اس کے ہاتھ میں وہ ہار بھی نہیں تھا جس کے لئے ہفتہ بھر اس نے ناک میں دم کئے رکھا تھا۔ اس نے سوچا ہار بک چکا ہوگا۔ ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ بچی غم میں کہیں اسے دل کی بیماری کا دورہ نہ پڑ جائے۔

"بک چکا تھا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں، وہ وہیں نمائشی کھڑکی میں رکھا ہوا تھا۔ اگر اتنے عرصے میں کسی اور نے اسے خریدنے کے لائق نہیں سمجھا تو میں ہی کیوں اسے لے آتی؟"

رائے بہادر نے اطمینان کا سانس لیا اور خاموش رہنے میں مصلحت سمجھی۔

بلا مبالغہ اس کی بیوی شیشے کے اس پارسل کی طرح تھی جس پر لکھا ہوتا ہے "شیشہ ہے احتیاط برتئے" وہ اتنی دبلی اور کمزور تھی کہ بات کرتے کرتے تھک جایا کرتی تھی۔ ننھے ننھے کیوٹیکس کے "ریڈ ڈیلیشیس" رنگ والے ہاتھوں کو پروں کی طرح تول کر وہ عموماً اپنا مطلب واضح کیا کرتی تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ کم دُبلی نہ تھی اسے ذہین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن امیر لوگوں کے بچوں کو ذہانت کی ضرورت ہی کیا ہے ان کو کونسا پروفیسر بننا ہوتا ہے۔ مگر جسم میں کچھ تو جان ہونی چاہیئے تاکہ خدا کی عطا کی ہوئی دولت کو کسی کام میں لایا جا سکے۔ وہ اکلوتی بیٹی تھی۔ زیادہ محبت کئے جانے کی وجہ سے وہ ہمیشہ بیمار رہتی تھی یا سدا بیمار رہنے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت کی جاتی تھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال کیلسیم کی ولائتی ٹکیاں روز کھانے کے باوجود اس کی کیلشیم کی کمی کبھی پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اور نہ لوہے کے مرکب اس کے خون میں سرخ کارپسلز کی تعداد بڑھا سکتے تھے۔ بچپن میں چار پانچ بیماریوں کا ایک ساتھ حملہ ہو جانے کی وجہ اس کا دل بیحد کمزور ہو چکا تھا۔

اس لئے اس کو بہنی بیحد نگہداشت رکھنی پڑتی تھی۔ اس کی زندگی کے چند سال باقی تھے اس میں اس کے والدین اسے ہر قسم کا آرام بہم پہونچانا چاہتے تھے جب رائے بہادر نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اسے پہلے رد کر دیا گیا کیونکہ لڑکی کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اگرچہ ڈاکٹر اب بھی یہی کہتے ہیں کہ اس کی بیوی صرف چند مہینے کی مہمان ہے تاہم رائے بہادر کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بھی اپنے سسر اور ساس کی طرح اس کی تیمارداری کرنے میں دم توڑ دے گا۔

وہ ضلع بھر میں ٹینس کا چیمپین تھا اس نے اس دلپسند کھیل سے اب کنارہ کشی کر لی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ بیوی منع کرتی تھی بلکہ اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ جب کبھی وہ ٹینس کھیلنے جاتا تھا اس کی بیوی کو دل کی بیماری کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس سے زیادہ فرمانبردار اور اطاعت شعار بیوی کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اختلاف رائے پیدا ہوتے ہی وہ فوراً مان جایا کرتی تھی لیکن ساتھ ہی اسے دل کی بیماری کا دورہ پڑ جاتا۔ رائے بہادر کا دل پتھر کا نہیں تھا جو ایسی حالت میں بھی نہ پسیجتا۔ آخر کار اسے بیوی کی منتیں کرنی پڑتیں کہ از راہِ کرم وہ اپنی من مانی کرے۔

دونوں کے دل میں یہی بات کھٹک رہی تھی کہ بچوں کو کیسے بتایا جائے کہ پپی مر گیا ہے۔ اسی موضوع پر باتیں شروع ہوئیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ جب بچے اسکول سے لوٹیں تو ان کا "پاپا" دوسرے کمرے میں چلا جائے اور "ممی" پیار دلار سے یہ خبر انہیں سنائے۔

بچوں کے آنے پر یہ خبر ان کی ماں نے ادھر اُدھر کی ہزار باتیں بنا کر انتہائی پیار دلار سے انہیں سنائی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ وہ روئے چلائے نہیں۔ بچوں نے صرف ایکدوسرے کا منہ تاکا اور اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

والد بھی حیرانی میں منہ لٹکائے باہر نکلا "ان لڑکے بالوں کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو اور بیوی کو تسکین دی۔ پپی سے ان کا اتنا میل جول اور سنگ ساتھ تھا اور اب اس کی موت پر ان کی ہر وقت ٹپکتی رہنے والی آنکھوں میں آنسو کی ایک بھی بوند نہیں تھی۔ اس کی بیوی نے حیرانی میں آنکھیں اور بھی پھیلا دیں۔

رائے بہادر نے بچوں کو انتہائی مٹھاس اور پیار سے آواز دی "ڈیر اندو، سویٹ بھاشی" پیارے اندو میٹھے بھاشی۔ لحظہ بھر کیلئے سکون چھا گیا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر یک بیک ان دونوں کی پوری شدت سے رونے چیخنے دہاڑنے کی آوازیں آنے لگیں" وہ دونوں آنکھوں میں مٹھیاں ٹھونس ٹھونس کر زار و قطار روتے ہوئے اس کمرہ میں آ گئے۔ ان کی ماں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے ان کو باہوں میں لے کر پوچھا۔

(باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

میر کے لطیفے

مسعود حسن رضوی

میر تقی میر نے اپنی کتاب ذکر میر میں کچھ اپنے اور زیادہ تر اپنے زمانے کے حالات لکھے ہیں اور کتاب کے خاتمے پر کچھ لطیفے شامل کر دئے ہیں۔ اس قابل قدر کتاب کو مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۸ء میں اورنگ آباد (دکن) سے شائع کیا۔ اس مطبوعہ نسخے میں لطیفے موجود نہیں ہیں۔ فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں ان کے متعلق لکھا ہے:۔

"کتاب کے آخر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی جمع کر دئے ہیں بعض پرانے اور تاریخی ہیں اور بعض خود ان کے زمانے کے ہیں اور پر لطف ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض ان میں سے ایسے فحش ہیں کہ ان کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس سے اس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہے۔ اس وجہ سے نیز اس لئے کہ یہ ایک بے متعلق چیز تھی ہم نے یہ لطیفے اس کتاب سے خارج کر دئے ہیں"

ذکر میر کا ایک قدیم قلمی نسخہ جو میرے کتب خانے میں موجود ہے اس کے آخر میں بھی یہ لطیفے درج ہیں۔ ان کی کل تعداد پچپن ہے۔ ان میں سے کچھ لطیفے فحش ہیں[1] کچھ گمنام لوگوں سے متعلق ہیں کچھ ایران و توران سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ میرے بہت پہلے کے ہیں۔ کچھ لطیفے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کے ان مشاہیر سے تعلق رکھتے ہیں جو میر کے ہم عصر تھے۔ یا ان سے کچھ ہی پہلے گزرے تھے۔ ان لطیفوں کا ذکر غالباً میر کے سوا اور کسی نے نہیں کیا ہے۔ یہ لطیفے اگرچہ کچھ بہت دلچسپ نہیں ہیں مگر متعلق اشخاص کے بارے میں ہماری معلومات میں ذرا ذرا سا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اسی افادی نقطۂ نظر سے ہم ان کو یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اصل لطیفے فارسی میں ہیں مگر ہم ان کو اردو کے لباس میں پیش کریں گے۔

برہان الملک اور اعظم خاں

اعظم خاں (ککلاں) کے یہاں چنبیلی پلاؤ بہت عمدہ پکتا تھا۔ گھی میں چنبیلی کے پھول دو تین دن پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ اس میں پھولوں کی خوشبو آنے لگتی تھی۔ اس گھی میں پلاؤ پکایا جاتا تھا جو خوشبودار ہوتا تھا۔ برہان الملک نے پلاؤ کی تعریف سن کر اس کی فرمائش کر دی۔ اعظم خاں نے پلاؤ پکوا کر دو تین قابیں بھجوا دیں برہان الملک نے اسے کھایا تو بہت خوش ہوئے اور دل لگی میں بولے کہ یہ پلاؤ کی قاب نہیں ہے حضرت نظام الدین اولیا کی مرقد مبارک ہے۔ چونکہ زائر اس بزرگوار کے مزار شریف پر چنبیلی کے پھول چڑھاتے ہیں جس سے وہ مزار پھولوں کا انبار نظر آتا ہے اور آدھر سے گزرنے والوں کو دور سے خوشبو آتی ہے اس لئے اس بات نے بہت لطف دیا۔

برہان الملک اور مرتضی خاں

ایک دن مرتضی خاں میر تزک برہان الملک کے یہاں گئے اور وہاں کچھ کھایا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں بہت تکلف کیا۔ تین چار مرتبہ بیسن لگایا اور دو تین مرتبہ پسی ہوئی خوشبودار کھلی ملی۔ برہان الملک نے کہا مرتضی خاں ہاتھ دھونے میں اتنے اہتمام کے کیا معنی ہیں۔ کیا میرے یہاں گو پکا تھا؟

برہان الملک اور احمد علی خاں

ایک دن برہان الملک کا مصاحب احمد علی خاں کمخواب کا پاجامہ پہن کر آیا نواب نے دیکھا اور .... [2] . احمد علی خاں شرمندہ ہو گیا۔ دوسرا مصاحب جس کا نام میں بھول گیا، بولا کہ یہ رات کو شراب کے نشے میں غلطی کر گیا۔

امیر خاں انجام اور اس کا بھائی

امیر خاں انجام بہت بڑا امیر تھا۔ اس کی طاقت لسان اور نستعلیق گوئی مشہور ہے۔ اچھا سلیقہ رکھتا تھا۔ اس کا بھائی ہمیشہ شراب کے نشہ میں سرشار رہتا تھا۔ جب وہ بہت بدنام ہونے لگا تو امیر خاں نے اس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا کہ اے خانہ خراب کون مرد آدمی گھر کے اندر تفنن طبع کے لئے یہ شغل نہیں کرتا، لیکن نہ اس رسوائی کے ساتھ۔

امیر خاں اور نوربائی کا لڑکا

نوربائی طوائف لسانی میں مشہور تھی۔ ایک مرتبہ اس کا لڑکا امیر خاں کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے اس کا حال دریافت کیا۔ امیر خاں نے کہا کہ یہ نور چشم عالم ہیں۔ تعجب ہے کہ تم ان کو نہیں جانتے۔

مرزا مظہر اور ایک طوائف

ایک طوائف نے جو خوش سلیقگی کے لئے مشہور تھی، ایک مرتبہ مرزا جان جاں مظہر سے کہلا بھیجا کہ آپ کی ملاقات کے لئے دل تڑپتا ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ چار یاری ہیں میں اس مذہب کو اختیار نہیں کر سکتی۔

---

[1] فحش لطیفے زیادہ تر مشہور و معروف لوگوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً خاقانی۔ ملا سعد اشرف، خواجہ شمس الدین، ناصر علی سرہندی، شاہ عباس صفوی۔

[2] یہاں دو لفظ پڑھے نہیں جاسکے

کیونکہ عورت کے لئے بیمار یا بیمار ہونا عیب ہے۔ انھوں نے بے تکلف جواب دیا کہ شاید اثنا عشری ہونا منظور ہے۔

مرزا مظہر اور ایک شخص

ایک شخص نے مرزا جان جاناں مظہر کے پاس آکر کہا کہ "با دبرآوردہ ام" ایک ظریف نے پوچھ دیا "از کجا؟" مرزا نے جواب دیا "از جائے کہ برمی آید"۔

مرزا بیدل اور حکیم شیخ حسین شہرت

مرزا بیدل نے اپنے ایک شعر میں "التوید" کا لفظ استعمال کیا۔ حکیم شیخ حسین شہرت[1] نے ان کے یہاں جاکر اعتراض کیا کہ نوید فارسی لفظ ہے۔ اس پر عربی لفظوں کی طرح الف لام لگانا کیا معنی رکھتا ہے۔ مرزا کو کسی استاد کا قصیدہ یاد تھا جس کے ہر شعر کے فقرہ میں "التوید" کا لفظ آتا تھا۔ اس کا ایک مصرع مجھے (یعنی نیر کو) بھی یاد رہ گیا ہے "التوید آفتاب عالمتاب" مرزا نے ایک شخص کو مخاطب کرکے وہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ حکیم حیران رہ گیا۔ اس کو خاموش دیکھ کر مرزا صاحب نے کہا حکیم صاحب ہمارا حال تو یہ ہے کہ "ہیچ شاعر حکیم نیست حکیم شاعر ہیچ ہیچ مردود ہیچ مرد دہیچ"۔

حکیم شیخ حسین شہرت اور ایک مریض

ایک دن حکیم شیخ حسین شہرت شاہی خواجہ سرا کے یہاں گئے۔ وہاں ایک شخص کو نقرس کا مرض تھا حکیم نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اس کا علاج تو آسان ہے مگر یہ چیز اس گھر میں راس نہیں آتی۔

ناصر علی اور مرزا بیدل کا ایک شاگرد

ایک دن ناصر علی نے مرزا بیدل کے ایک شاگرد سے پوچھا کہ مرزا کیا کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ آجکل چار عنصر لکھ رہے ہیں۔ کہا میرا پیام ان کو پہنچا دینا کہ وقت عزیز کو کیوں ضائع کرتے ہو۔ یہ چار عنصر کل ہی برباد ہو جائیں گے۔ جو لوگ پنج روزہ زندگی کی حقیقت سے واقف ہیں ان کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔

محمد شاہ اور صفدر محمد خاں

عراقیوں کے لہجے میں ہر الف کو جس کے بعد نون آتا ہے واو سے بدل دیتے ہیں۔ صفدر محمد خاں عراقی ایک دن محمد شاہ کے مجرے کو گیا۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ اس قسم کے بعض الفاظ عراقیوں کے لہجے میں قباحت پیدا کرتے ہیں اس کو مخاطب کرکے شیخ سعدی کا یہ مصرع پڑھا "اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز" خان مذکور فوراً بات کی تہ کو پہنچ گیا اور بولا جی ہاں "کون سوختہ را جون شد و آواز نیامد"۔

قزلباش خاں امید اور صفدر محمد خاں

ایک مرتبہ صفدر محمد خاں قزلباش خاں امید کے یہاں مہمان ہوا۔ ان کا گھر شہر کے باہر نہر کے کنارے تھا۔ ادھر کے محلوں کے مہتر اکثر وہاں کوڑا ڈالتے تھے۔ چنانچہ ان کے گھر کی دیوار کے پاس مزبلہ بن گیا تھا کھانے کے وقت ادھر سے ہوا آئی اور بدبو کے قافلے ساتھ لائی۔ مہمان چیں بہ جبیں ہوکے بولا "امروز عجب آتش در کاسہ است" میزبان چونکہ بڑا بذلہ سنج تھا جواب دیا "درخانہ ہر چہ مہمان ہر کہ"

نجم الدولہ اسحٰق خاں اور ان کا بکا دل

نجم الدولہ اسحٰق خاں اکثر فردوس آرامگاہ (یعنی محمد شاہ) کے لئے چیزیں پکوا کر بھیجا کرتے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے کلیجی اور دل کی فرمائش کی۔ اسحٰق خاں نے اپنے گھر آکر حکم دیا کہ چند کلیجیاں مع دل کے قصابوں سے خرید کر مجھے دکھائی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اتفاق سے ایک جگر (کلیجی) ایسا تھا جس کے ساتھ دل نہیں تھا۔ اسحاق خاں نے غصے میں بکا دل کی طرف دیکھا۔ وہ ظریف آدمی تھا کہنے لگا اس میں نہ میرا قصور ہے نہ قصابوں کا۔ یہ مرزا بیدل کا جگر ہے۔

حکیم علوی خاں اور میر معصوم

علوی خاں بہت بڑا حکیم تھا۔ کمال شہرت کے باعث تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا ایک ندیم تھا میر معصوم نام۔ ایک دن وہ بہت دیر کرکے حاضر ہوا۔ حکیم نے پوچھا میر معصوم تم کہاں چلے گئے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ آج اطراف شہر کی سیر کے لئے چلا گیا تھا۔ پوچھا وہاں کیا دیکھا؟ کہا جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی قبریں ہی قبریں دکھائی دیتی تھیں اور ان کی لوحوں پر لکھا ہوا تھا "عمل علوی خاں صاحب" "عمل علوی خاں صاحب"۔ حکیم نے کہا کہ اب بھی دل لگی سے باز نہیں آتے ہو۔ جواب دیا

---

[1] شیخ حسین شہرت اصلاً عرب تھا۔ مگر ایران میں نشو و نما پائی تھی اس لئے شیرازی مشہور ہوگیا۔ وہ عالمگیر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا اور فن طبابت کے وسیلے سے محمد اعظم شاہ کی سرکار میں نوکر ہوگیا۔ شاہ عالم کے عہد میں اس کا اعزاز بڑھا اور فرخ سیر کے زمانہ میں حکیم الممالک خطاب ملا۔ محمد شاہ کے عہد میں حجاز کا سفر کیا اور حرمین شریف کی زیارت کرکے شاہ جہاں آباد واپس آگیا اور چار ہزاری منصب پر ممتاز ہوا۔ ۱۱۴۹ھ میں انتقال کیا۔

{ تذکرۂ بے نظیر صفحہ ۰۰ — تذکرۂ حسینی صفحہ ۱۸۴ }

شکر کرنے کا محل ہے نہ کہ پریشانی کا۔ خدا کے فضل سے نواب کے ہاتھ کی برکت اپنے لئے نواب کے والد مرحوم سے زیادہ پاتا ہوں۔

شاہ گلشن اور عبدالرحمن ملحد

ایک ملحد عبدالرحمن قدمگاہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ کے صحن میں اکثر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی بداعتقادی کے سبب سے لوگ اس سے ناخوش رہتے تھے۔ شاہ گلشن جن کی درویشی کمال پر تھی زیارت کی سعادت حاصل کرکے جا رہے تھے کہ اس ملحد نے آواز دی۔ درویش ملتفت نہ ہوا۔ اس کو غصہ آگیا اور بولا اے گلشن میں تجھ کو آدمی سمجھتا تھا تو تو گدھا نکلا۔ درویش نے کہا کہ اگر تمہارے سب خدا یدا سی قسم کے نکلیں گے تو افسوس کی جگہ ہے۔

سید حسن رسول نما اور ایک سفیہ

ایک سفیہ سید حسن رسول نما کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھ کو خدا کا راستہ دکھاؤ۔ فرمایا کہ یہ راستے شاید تمہاری خالہ صاحبہ نے بنوائے ہیں۔

محمد حسین کلیم اور اسد یار خاں

محمد حسین کلیم مرزا بیدل کے انداز میں ریختہ کہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے نواب بہادر کے بخشی اسد یار خاں کے سامنے اپنے بہت سے دور کے پھیکے اشعار پڑھے۔ وہ ایک خوش طبیعت آدمی تھے سنتے سنتے پریشان ہوگئے اور مجھ سے (یعنی میر سے) مخاطب ہوکر بولے کہ رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیسا خواب؟ انھوں نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ایک فقیر دروازے پر شور کر رہا ہے۔ آپ نے مجھے اشارہ کیا کہ جاؤ دیکھو۔ میں گیا اور دیکھا کہ ایک مسنڈا فقیر لنگوٹا باندھے ایک بڑا سا ڈنڈا کندھے پر رکھے کھڑا ہے۔ میں نے کہا اے بے جگر و بزدل، اس تن و توش پر تجھ کو کس نے مارا ہے کہ مسلسل فریاد کر رہا ہے؟ وہ بولا کہ میں بیدل ہوں ایک ریختہ گو کلیم نام روزانہ میرے دیوان سے دو سو مضمون چراتا ہے اور اپنی پوچ عبارت میں ان کو باندھ کر اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ یہ بات میرے لئے سوہان روح ہے۔ خدا کے لئے اس بے درد سے کہو کہ میرے دیوان سے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے کہا اچھا تم جاؤ میں اسے سمجھا دوں گا۔ کلیم بے چارہ شرمندہ ہوکر چلا گیا۔

خان آرزو اور میرزا محمد علی

اسحاق خاں کلاں کے چھوٹے بیٹے میرزا محمد علی نے شریفہ نام ایک عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ ایک دن شراب کے نشے میں وہ سراج الدین علی خان آرزو سے اپنے والد کے اوصاف بیان کرنے لگا۔ وہ اس سے دل لگی کرتے تھے، بولے کہ والد شریف کی خوبیاں کیا بیان کرتے ہو۔ وہ بے چارے تو چل بسے۔ نہ وہ رہے نہ ان کی باتیں رہیں۔ اب والدہ شریفہ کے اوصاف بیان کرو کہ وہ ابھی بر سر کار ہے۔

دارا شکوہ اور ایک فقیر

مرزا رضی دانش شاہزادہ دارا شکوہ کا مصاحب تھا۔ ایک دن وہ اور شہزادہ دونوں ایک فقیر کو دیکھنے گئے۔ اس مسنڈے نے پوچھا کہ اے بابا دارا شکوہ جب تیمور اور شاہ مدار میں جنگ ہوئی تھی تو تم کتنے برس کے تھے۔ شاہزادے نے مرزا رضی کی طرف دیکھا۔ وہ بولا کہ ادرکمالوں سے قطع نظر حضرت بے مثل تاریخ دان ہیں۔

سادات بارہہ

بارہہ کے سادات کی باتیں جو لطف سے خالی نہیں اور لوگوں کی زبانوں پر ہیں بہت ہیں۔ ان میں سے دو تین یاد ہیں ان کو لکھتا ہوں۔ (قول میر)

ایک سید اور "قل یا"

ایک مفلس سید وطن کو ترک کرکے معاش کی تلاش میں شاہ جہاں آباد آئے اور فاقوں سے ضعیف و نحیف ہوگئے۔ انھوں نے اپنے وطن میں "قل یا ایہا الکافرون" کو ایک لڑکے کی تختی پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اتفاقاً ان کا گزر ایک مکتب میں ہوا وہاں اسی سورے کو خفی خط میں لکھا دیکھا۔ کہنے لگے سبحان اللہ زمانے کی گردش نے بے چارے "قل یا" کو بھی نہ چھوڑا۔ اس قدر لاغر ہوگیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔

ایک سید اور ان کا لڑکا

ایک سید اپنے لڑکے کو لایا۔ لوگوں نے پوچھا اس کا کیا نام رکھا ہے۔ بولے ابوجہل، آخر خدا اس کی جہالت بھی اسے نصیب کرے۔

ایک سید اور بارہے کی آبادی

ایک سید سے پوچھا گیا کہ تمہارا بارہہ کتنی مدت سے آباد ہے۔ کہنے لگے پانچ ہزار سال ہوئے ہوں گے۔ کہا گیا کہ سیادت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ سے چلی ہے اور ان کے عہد کی مدت دنیا جانتی ہے۔ بولے وہ اور سادات ہیں ہم اور سادات ہیں۔

یہ دکھی لوگ

بقیہ صفحہ ۱۰۲

"کیا بات ہے ڈیرونز؟"

"بیبی ٹل گیا" وہ دونوں ایک تیز سی چیخ کے درمیان بڑبڑائے

"میں نے تو تمہیں بتایا تھا" ممی نے ان کے بوسے لیتے ہوئے انہیں چمکارتے دُلارتے ہوئے کہا۔

"ہم نے تو پاپا سمجھا تھا" یہ کہتے کہتے بچوں نے پاپا کی طرف آنکھ اٹھا کر تصدیقاً دیکھا۔

رائے بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ اس طرح لٹک گیا۔ گویا وہ بھی بچوں کی طرح ڈاڑھیں مار کر رو دے گا۔

ادارۂ اشاعت اردو کی ہردلعزیز مطبوعات

جناح کی تقریریں۔ عثمان سحرائی۔ تین روپے چار آنے
فیصلۂ ہندوستان۔ عبدالقدوس ہاشمی۔ چار روپے آٹھ آنے
افادات محمد علی۔ رئیس احمد جعفری۔ تین روپے بارہ آنے
نگارشات محمد علی۔ " " تین روپے بارہ آنے
مقالات محمد علی۔ " " تین روپے بارہ آنے
مقالات محمد علی۔ حصہ دوم تین روپے بارہ آنے
مکاتیب محمد علی۔ رئیس احمد جعفری۔ دو روپے آٹھ آنے
مکالمات ابوالکلام۔ عقیل جعفری۔ تین روپے بارہ آنے
ان کے ہندوستان۔ ظفر الحسن۔ تین روپے بارہ آنے۔
تدریسی طریقے۔ عبدالحکیم۔ چار روپے
اسلامی معاشیات۔ مناظر احسن گیلانی۔ پانچ روپے
اسلامی تہذیب کیا ہے۔ رشید۔ دو روپے آٹھ آنے
قصص و مسائل۔ عبدالماجد دریابادی۔ ایک روپے بارہ آنے
حضرت ابوذر غفاری۔ مناظر احسن گیلانی۔ دو روپے بارہ آنے
یقین و عمل۔ عبدالقدوس ہاشمی۔ دو روپے آٹھ آنے
تاریخ اسلام۔ عبداللہ العمادی۔ پانچ روپے۔
تاریخ عالم۔ تسنیم ضیائی۔ تین روپے۔
مسلمانوں کی معاشیات۔ مناظر احسن۔ دو روپے بارہ آنے
روح اقبال۔ ڈاکٹر یوسف حسین۔ پانچ روپے بارہ آنے
مقام اقبال۔ اشفاق حسین۔ تین روپے چودہ آنے

آثار اقبال۔ دستگیر رسید۔ تین روپے بارہ آنے
تنقیدی جائزے۔ سید احتشام حسین۔ تین روپے بارہ آنے
تنقیدی حاشیے۔ مجنوں گورکھپوری۔ تین روپے بارہ آنے
تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ چار روپے بارہ آنے
روایت و بغاوت۔ سید احتشام حسین۔ تین روپے بارہ آنے
داستان اردو۔ نواب خیال۔ ایک روپے بارہ آنے
ٹیگور لوازمی شاعری۔ مخدوم۔ ایک روپے آٹھ آنے
یورپین شعراء۔ سردار علی۔ بارہ آنے
خواتین دکن کی اردو خدمات۔ ہاشمی۔ دو روپے
تعمیر حیات۔ برزجی۔ چار روپے
نفسیات زندگی۔ شیر محمد اختر۔ ایک روپے بارہ آنے
بچوں کی نفسیات ...... ایک روپے بارہ آنے
شخصیت و کردار ...... دو روپے
لال کوٹھی۔ ناول مبہم۔ تین روپے چار آنے
کردار۔ ناول۔ ماہر القادری۔ دو روپے چار آنے۔
دھوپ۔ ناول قیسی۔ رامپوری۔ تین روپے چار آنے
پریم پجارن۔ ناولٹ۔ قدوس صہبائی۔ پندرہ آنے
تصویریں۔ منظور بخاری۔ ایک روپے
زندگی کی ٹھوکریں۔ رئیس جعفری۔ تین روپے چار آنے
لہریں۔ شفیق الرحمن۔ دو روپے چودہ آنے۔

سیلاب۔ احمد ندیم قاسمی۔ تین روپے آٹھ آنے
گرداب۔ احمد ندیم قاسمی۔ دو روپے چودہ آنے
انگڑائیاں ...... تین روپے چار آنے
صید زبوں۔ مجنوں گورکھپوری۔ دو روپے
سراب۔ " " تین روپے چار آنے
آجکل کے افسانے۔ فضل حق قریشی۔ دو روپے چودہ آنے
وسوسے۔ " " "
ولولے۔ قدوس صہبائی۔ دو روپے بارہ آنے
کروٹیں۔ " " دو روپے بارہ آنے
زلزلے " " دو روپے بارہ آنے
جلوۂ رنگیں۔ ڈاکٹر نصیر الدین۔ تین روپے
رنگین سپنے۔ کوثر چاندپوری۔ دو روپے بارہ آنے
مسکراہٹیں " " دو روپے بارہ آنے
افسانے ڈرامے۔ منٹو۔ دو روپے بارہ آنے۔
نگینے۔ مظفر حسین شمیم۔ دو روپے بارہ آنے
تعبیریں۔ امین خیر قپوری۔ دو روپے چودہ آنے
فغان آرزو۔ آرزو لکھنوی۔ تین روپے چار آنے
نغمات ماہر۔ ماہر القادری۔ تین روپے۔
محسوسات ماہر " دو روپے بارہ آنے
اسرار۔ علی اختر۔ دو روپے بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ

سید عبدالرزاق تاجر کتب مالک ادارہ اشاعت اردو۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

علاقہ صوبہ سندھ۔ بلوچستان سرحد کشمیر پنجاب کے حضرات پتہ ذیل سے طلب فرمائیں۔

منیجر ادارۂ اشاعت اردو۔ ذیلدار روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور۔ (پنجاب)

کچھ غیر لفظ اُردو میں

دنیا کی ہر زبان نے کچھ نہ کچھ لفظ غیر زبانوں سے لیے ہیں اور بیشتر ان لفظوں کو ایسا کچھ اپنا لیا ہے کہ ان پر غیر ہونے کا اکثر شبہ بھی نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے یہ زبان کی کمزوری ہے کہ اوروں سے مانگ جانگ کے اپنی پونجی اکٹھا کی ہے۔ یہ خیال جتنا عام ہے، اتنا ہی غلط بھی ہے۔ لفظ جو کسی زبان میں کسی اور زبان سے آکر داخل ہوتے ہیں، کسی شاہی فرمان کی تعمیل میں نہیں آتے، نہ ان کے چھانٹنے پرکھنے کو کوئی مجلس مقرر کی جاتی ہے۔ یہ تو کسی گروہ یا قوم کی تمدنی اور سماجی ضرورتیں ہوتی ہیں، جو غیر قوموں اور ملکوں کے لفظوں کو اپنے پاس بلاتی ہیں اور قوم کا لسانی احساس ان کو اپنا جامہ پہنا کر قوم کی محفل میں لاتا اور اقران و اماثل کی صفوں میں لاکر ان میں سے ہر ایک کو اس کے درجے کے موافق کسی کے برابر، کسی سے بالاتر، کسی سے کچھ اتر کر، جگہ دیتا ہے۔

جس طرح ہر شخص کو اپنے پڑوسی سے راہ رسم کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہر قوم یا ملک کے لیے ضروری ہے کہ غیر قوموں اور ملکوں سے اس کے روابط ہوں، جو اکثر آمیزش کی اور کبھی آویزش کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ انسانیت کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک جتنی قومیں آگے بڑھیں اور ترقی کی راہ پر چلیں، ان میں سے ہر ایک نے کسی غیر قوم سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ کہیں ایک نے دوسری کے مذہب کو اپنا مذہب بنایا، کہیں ایک نے دوسری سے علم و ہنر میں سبق لیا، کہیں ایک نے دوسری سے حکومت اور سیاست کے گر سیکھے۔ یہاں تک کہ کہیں ایک قوم نے دوسری پر حملہ کیا، اس کے وطن کو تاراج کیا، اس پر اپنا قبضہ جمایا، اور پھر کیا عجیب بات ہے کہ انھیں فاتحوں نے اس ہاری ہوئی قوم کے تمدن کو اختیار کر لیا۔ بجائے اس کے کہ مفتوح اور محکوم ملک میں اپنی زبان کا سکہ چلاتے، خود ہی اپنے محکوموں کی بولی بولنے لگے۔ منگولوں اور تاتاریوں کا یہی حال ہوا کہ ایران کو فتح کرکے محکوم ایرانیوں کے نہ صرف تمدن کو اختیار کر لیا، بلکہ ایرانی زبان کو بھی، اور جب ہندوستان کی طرف بڑھے تو فارسی بولتے ہوئے۔ عربوں کو سب جانتے ہیں کہ کسی کو گردانتے ہی نہ تھے۔ اسلام سے پہلے، ساری دنیا سے الگ تھلگ، اپنے ریگستانی وطن میں بے فکری اور بے باکی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنی زبان کی خوبی اور وسعت اور برتری پر انھیں وہ ناز تھا کہ ساری دنیا کو بے زبان جانتے تھے۔ اس پر بھی اسی پرانے زمانے میں بعض دوسری قوموں سے زیادہ تر تجارت اور کچھ جنگ کے ذریعے عربوں کو سابقہ ہوا تھا، اور غیر زبانوں کے لفظوں کی ایک خاصی تعداد عربی میں آ گئی تھی۔ اسلام کا زمانہ آیا، تو دنیا کی بہت سی قوموں سے سابقہ ہوا۔ یہ تعلقات نسبتاً زیادہ گہرے تھے اور اسی مناسبت سے غیر زبانوں کے لفظ بہت کثرت سے عربی میں آ داخل ہوئے۔ عربوں نے یہ تو کہا کہ یہ لفظ عربی اصل سے نہیں! یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کو نکالو۔

یورپ کی عیسائی قومیں ایک زمانے میں بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں سے لڑنے مغرب سے مشرق کو آئیں اور ایک مدت تک دونوں میں سخت مقابلے رہے۔ نفرت کے جس بے پناہ جذبے نے یورپی قوموں کو ان صلیبی لڑائیوں پر ابھارا تھا، سب جانتے ہیں، مگر جب یہ صلیبی مجاہد گھر لوٹے، تو اپنے دشمنوں کے پاس سے دو چیزیں ساتھ لے گئے: صلاح الدین کی بہادری اور شرافت کی داستانیں، اور عربی، فارسی، ترکی لفظوں کا ایک ذخیرہ۔ صلاح الدین کی داستانیں جوں جوں وقت گزرتا گیا، یورپ والے بھولتے گئے، پر وہ "غیر" لفظ یورپ کی زبانوں میں آج بھی جیتے جاگتے موجود ہیں۔ دنیا کی نئی زبانوں میں فرانسیسی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یورپ کی کوئی زبان فرانسیسی کے اثر سے نہیں بچی۔ فرانس اور جرمانیا کا ٹنٹا ٹھہرا، پھر بھلا جرمانی زبان میں فرانسیسی لفظ کیسے نہ آتے؟ جب فرانس اور جرمانیا میں ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی، تو نفرت کا جو جذبہ دونوں طرف ابھرا اس کا اثر ان فرانسیسی لفظوں پر بھی پڑا، جو مدت ہوئی جرمانی زبان میں گھل مل چکے تھے۔ یعنی ان لفظوں پر بھی بزن بول دیا گیا۔ فرانسیسی لفظوں کو یا جو تھوڑے بہت انگریزی اور روسی لفظ جو جرمانی زبان میں تھے ان کو ترک کرنے کی کوششیں اس شدت سے ہونے لگیں کہ معلوم ہوتا تھا جنگ کی ہار جیت انھیں چند لفظوں کے رہنے یا جانے پر ٹھہری ہے۔ مگر اس لسانی جہاد کا حاصل یہ ہوا کہ سب لفظ تو ترک نہ ہوئے اور جنگ کے میدان سے جو سپاہی گھر آتے، بہت سے نئے فرانسیسی، انگریزی، روسی لفظ ساتھ لاتے۔ جب حساب کیا جاتا تو لیکھا ڈیوڑھا صرف برابر ہی نہ ہوتا، بلکہ غیر زبانیں ہی کچھ نفع میں رہتیں۔

انگریزی زبان بولنے والوں کا یہ دعوی کہ ان کی زبان دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب زبان ہے، بالکل سچا ہے، مگر ذرا یہ تو دیکھیے کہ اس غیر لاتینی زبان میں لاتینی زبانوں کے لفظوں کا برتاو کیا ہے۔ انگریزی کی عبارت میں گن کے دیکھ لیجیے۔ سو میں پچاس سے ساٹھ تک لاتینی اصل کے لفظ ملیں گے۔ انگریز نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ان غیروں کو دور کرو۔ خلاصہ یہ کہ غیر زبانوں کے

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

لفظوں سے کسی زبان کو مفر نہیں۔ بلکہ یہی غیر لفظ ادب کا کثر ایک با وقعت حصہ قرار پاتے ہیں اور ان کو خارج کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اردو میں فارسی لفظوں کی کثرت ہے، فارسی میں عربی لفظوں کی، اس کے برعکس عربی میں بھی فارسی لفظوں کی ایک قرار واقعی تعداد موجود ہے اور فارسی میں ہندوستانی لفظ بھی ملتے ہیں۔ اردو میں عربی لفظ بھی بہت ہیں، لیکن سوا ان گنے لفظوں کے، یہ سب فارسی کے توسط سے اردو میں یا ہندستان کی اور زبانوں میں آئے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کچھ اور زبانوں کے لفظ بھی ہماری زبان میں ہیں۔ جیسے ترکی، پرتگالی، فرانسیسی وغیرہ۔ پھر بھی اس طرف کم خیال جاتا ہے کہ سریانی یا یونانی کی سی قدیم اور دور دراز زبانوں کے بھی کچھ لفظ اردو میں ہوں گے۔ اس وقت انہیں کا ذکر کرنا ہے۔

سوریا (یعنی شام) سے، جس کی پرانی زبان کو ہم سریانی کہتے ہیں، عربستان کا ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ زبانیں بھی ان دونوں ملکوں کی آپس میں قریب کا رشتہ رکھتی ہیں اور دونوں زبانوں میں بہت سے مادّے مشترک چلے آتے ہیں۔ مگر اس مشترک سرمائے کے علاوہ بھی بہت سے لفظ اور اصطلاحیں ہیں جنھیں عربوں نے اسلام سے پہلے، سریانیوں سے لیا تھا۔ دوسری طرف اسی پرانے زمانے میں سریانی کا اثر فارسی پر اور اس کا اس پر بہت ہوا۔ چنانچہ فارسی میں اس زمانے کے سریانی لفظ اب تک موجود ہیں اور سریانی ادب میں فارسی لفظ۔ ان میں سے اکثر فارسی سے آئے ہوئے لفظ سریانی سے عربی میں پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح اسلامی دور میں جو عربی لفظ فارسی میں آئے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو عربی میں سریانی سے آئے تھے۔ اور ایسے بھی جو پہلے فارسی سے سریانی میں، پھر سریانی سے عربی میں آکر عربی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اسی طرح یونان کا تعلق بھی ایران سے بہت پرانا تھا اور لفظوں کا مبادلہ دونوں ملکوں کی زبانوں میں ہوا تھا۔ پھر اسلام کے عہد میں یونانی علوم کی اصطلاحیں عربی میں آئیں تو اور لفظوں کے ساتھ وہ بھی فارسی میں پہنچ گئیں۔

ان مختلف قسموں کے کچھ یونانی اور سریانی لفظ، فارسی کے راستے آکر اردو زبان اور ادب کا جزو بن گئے ہیں مثال کے طور پر تھوڑے سے لفظوں سے یہاں بحث کی جاتی ہے:۔

۱۔ "پیالہ" جسے اردو والے دو طرح پر بولتے ہیں: "پیالا" اور "پیالا" فارسی خیال کیا جاتا ہے مگر فارسی زبان میں ایسا کوئی مادہ نہیں جس کو اس کی اصل قرار دیجیے۔ یہ یونان سے ایران پہنچا ہے۔ یونانی میں چوڑے چکلے، پھیلے ہوئے ظرف کو "فِیلے" (PHIALE) کہتے تھے۔ انگریزی میں اس نے "فائل" تلفظ اختیار کیا اور معنے بدل کے شیشی کے ہو گئے۔

۲:۔ "لگن" ایک اور برتن ہے جس میں ہمارے ہاں آٹا گوندھا جاتا ہے۔ فارسی میں عموماً تھالی کو کہتے ہیں "شمع و لگن" آپ نے کہیں اردو شعر میں بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ بھی یونانی "لے کنے" ہے جس نے فارسی میں "لگن" کی شکل اختیار کی ہے۔

۳۔ "پستہ" یونانی "پستاکیون" یورپ کی بھی اکثر زبانوں میں آیا۔ چنانچہ انگریزی میں "پسٹاشیو"

۴۔ وہ مشہور ترکاری جسے ہم "کرم کلا" کہتے ہیں۔ فارسی میں "کرنب" ہے، یونانی میں "کرم بے"۔ "کرم" کے کئی معنے نکلتے تھے۔ اردو والوں نے "کلا" لگا کر شبہے کو دور کر دیا۔

۵۔ "نرگس" کو ہمارے شاعر خوب جانتے ہیں۔ عربوں نے اسے "نرجس" کہا اور فارسی نے اپنایا۔ اصل یونانی "نرکسوس" جس سے لاطینی "نرکسس" اور انگریزی "نرسسس" ہے۔

۶:۔ "سیم و زر" میں "زر" ٹھیٹ فارسی ہے، مگر "سیم" کا پتا فارسی مادّے میں نہیں۔ یونانیوں سے "اسی موس" سنا۔ ابتدا میں الف کو گرا کر جیسے ابا، ابر، ابلے کو با، بر، بلے کر لیا، اور عربی لفظ "ابو" کو "بو"، اس لفظ میں سے بھی الف کو گرا دیا۔ آخر میں "اوس" اصلی نہ تھا، محض لاحقہ تھا۔ وہ یوں خارج تھا۔ خالص "سیم" ہاتھ آ گئی۔

۷۔ "زمرد" کے فارسی فرہنگوں میں کئی تلفظ ملتے ہیں: زُمُرُّد، زُمُرُد، زُمَرَّد، زمرد، زمرد، جن میں سے "زمرد" عربی تلفظ ہے اور باقی وہ مضموم صورتیں اسی پر مبنی ہیں۔ یونانی میں "س م رگ دوس" تھا۔ لاطینی میں یوں ہی رہا مگر رومی قوم کی زبانوں تک "س م رل ڈ" تھا۔ پرانی فرانسیسی میں "ام رود" ہوا۔ انگریزی میں "ام رل ڈ"۔ عربی میں اسی لفظ کی جو ایک اور شکل "زبرجد" ہے وہ بھی عربی سے فارسی میں گئی۔ یونانی لفظ کا گ جو یورپ کی بعض زبانوں میں کھویا گیا تھا عربی "زبرجد" میں ج کی شکل میں پھر مل گیا۔

۸۔ "مروارید" یونانی "مرگ ری تے س" ہے جس کے آخر سے لاحقہ (اے س) جاتا رہا۔ اور گ فارسی میں و ہو گیا۔ انگریزی میں "مرگ ریٹ" ڈیزی پھول کی ایک قسم ہے جس نے اپنے سفید رنگ کی بنا پر یہ نام پایا "مارگ ری ن" نقلی مکھن کو کہتے ہیں یہ بھی اسی لئے کہ موتی کا سا سفید ہوتا ہے۔ اصل ان دونوں انگریزی لفظوں کی وہی یونانی لفظ ہے۔

۹۔ "قفس" کو لوگوں نے عرب سے بھی فرض کیا، پر عربی مصدر "قفقس" سے کام نہ چلا۔ اصل یونانی "کپ سوس" ہے۔

۱۰۔ "کالبد" (فارسی میں قدیم تر: "کالبذ") یونانی "کال پو زیون" ہے جس میں "اون" لاحقہ ہے۔

۱۱:۔ "والا" فارسی میں ایک صفت ہے، بلند کے معنوں میں۔ یہ "والا" اور "بالا" ایک ہی لفظ ہے، اس لئے کہ ب اور و کا مبادلہ عام ہے۔ "جناب والا" کو کون نہیں جانتا؟ یہاں اس لفظ سے بحث نہیں، اس سے مُرکّب

اس کی اصل فارسی ہے۔ مگر "لالا" ایک کپڑے کا نام بھی ہے: "نوعے از پارچۂ ابریشمی کہ مشیّر زنان پوشند" (برہان)۔ دکن میں یہ لفظ بہت عام ہے۔ یہ یونانی "دے لون" ہے، لاتینی میں "دے لُم" (جمع: "دے لا") فرانسیسی "وُ آل" ہمارے ہاں "وائل" بولا جاتا ہے۔ انگریزی "ویئل" (نقاب) اسی سے ہے۔

آبنوس، ابوا (فارسی بتو یا اتو ا)، اقلیم، بربط، برج البطریق، درہم، دینار، قانون، قصر، قلم، قندیل، توبخ اور بہت سے لفظ ہیں جو یونانی سے اکثر علمی اصطلاحوں کی حیثیت سے عربی میں لئے گئے اور پھر مختلف اسلامی زبانوں میں رائج ہوئے۔

سُریانی لفظوں سے بحث کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یونان سے زیادہ شام، ایران سے قریب ہے اور ان دونوں ملکوں کے درمیان اسلام سے پہلے بھی، بہت گہرے تعلقات تھے۔ سُریانی حروف ایران میں رائج ہوگئے تھے اور انہیں میں (زاندبرے) اوستا کا خط اور پہلوی خط بنا۔

یہاں صرف تھوڑے سے اُن سریانی لفظوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو فارسی سے گذر کر اردو میں بھی آگئے ہیں اور جن کو عموماً لوگ فارسی ہی جانتے ہیں:-

۱۔ "چلیپا" اردو، شعر میں زُلف کی صفت کی حیثیت سے آتا ہے مگر اس نشان کو بھی کہتے ہیں جو یادداشت کی خاطر بناتے ہیں (یعنی جو یار (ا، اس شکل سے X)۔ اصل اس کی سُریانی "صْ لی با" ہے (عربی: صَلیب)۔ فارسی میں سُریانی صَ۔ چَ ہوگیا اور بَ، پَ، مگر آخر میں جو الف تھا، برقرار رہا۔ یہ الف سُریانی میں حرف تعریف ہے (جیسے عربی میں کسی لفظ کے اوّل آل لگاتے ہیں)

۲۔ "شَیدا" (دل کھویا ہوا آدمی، وارفتہ)، اصل کے لحاظ سے فارسی نہیں سُریانی میں "شَیدا" دیوانے کے معنی رکھتا تھا اور پہلوی میں یہی معنے رہے۔ بعد کو فارسی والا مفہوم خاص ہوگیا۔ عربی لفظ "شَیْد" سے "شَیدا" کو کچھ تعلق نہیں۔

۳۔ "مسیحا" ہمارے ادب، خاص کر شعر میں بہت معروف ہے۔ عربی شکل "المسیح" ہے۔ سُریانی لاحقہ، جسے ہم ابھی "چلیپا" اور "شیدا" میں دیکھ چکے ہیں، یہاں بھی لفظ کی سُریانی اصل کا اعلان کر رہا ہے۔ البتہ سُریانی میں "مشیحا" (ش سے) ہے۔ چونکہ اور زبانوں کا ش عربی میں عموماً س ہوگیا ہے، جیسے "شاپور" سے "سابور" اور "شکر" سے "سُکّر"، اس لیے عربی میں "مسیح" (س سے) ہے۔ اسی عربی شکل کا اثر تھا کہ اسلامی عہد میں، جب عربی لفظ کثرت سے فارسی میں آئے تو "مسیحا" (س سے) صحیح قرار پایا۔

۴۔ "پلیتا" ہمارے ہاں مشہور لفظ ہے۔ بتی کو کہتے ہیں۔ فارسی کے فرہنگ نویسوں نے فارسی الاصل جان کر "بلیتہ" (مختفی ہ سے) لکھا اور "فتیلہ" کو اس کا مُعرّب بتایا ہے۔ "برہانِ قاطع" والے نے تو آفت ہی ڈھا دی کہ اس کا مُعرّب "افتیلہ" قرار دیا ہے جو سراسر مضحکہ خیز ہے۔ عربی میں "افتیلہ" کوئی لفظ ہے ہی نہیں، نہ ہوسکتا ہے۔ عربی "فتیلہ" کا مادّہ "فتل" ہے جس کے معنے ہیں: اینٹھنا، مروڑنا، بٹنا۔ "پلیتا" سریانی لفظ ہے، جس کے آخر میں الف (وہی تعریف یا تعیین کا) ہے اور معنے بتی۔

۵۔ "سا سا" بھی سُریانی ہے۔ وہیں سے فارسی میں آیا اور "کاسہ" لکھا جانے لگا۔ عربی "کاس" ظاہراً قبل اسلامی دَور میں سُریانی "کاسا" سے لیا گیا ہوگا۔ اس طرح فارسی، عربی، دونوں میں سریانی سے آیا۔

۶۔ "تابوت" بھی دونوں زبانوں میں سُریانی سے آیا۔

۷۔ "توت" بھی اصل میں سُریانی "توث" ہے۔ عربی کے اہلِ لغت نے اسے غیر زبان کا لفظ مانا ہے۔

۸۔ کنوئیں میں سے پانی بھرنے کا "ڈول" ہم ہندی جانتے ہیں مگر سُریانی میں "دول" انھیں معنوں میں ہے۔ فارسی والوں نے اس کے ساتھ "آب" لگا کر "دولاب" بنایا جسے ہم "رہٹ" کہتے ہیں۔

۹۔ "کُنشْت" معبد، خاص کر یہودی عبادت گاہ، کو کہتے ہیں۔ مگر یہودی کی تخصیص بعد کی چیز ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فارسی "کُن" سے "کُنشت" ہوگا مگر ایسا نہیں۔ سُریانی میں (۱) کْ۔نْ شا، (۲) کْ نُوشْ یا، (۳) کْ نُوشْ تا، تین طرح یہ لفظ آیا ہے۔ معنے ہر صورت میں ایک: جماعت، مجمع، مجلس۔ تیسری شکل فارسی میں رائج ہوئی۔ ایران والوں نے اپنے لفظ "کُنِشن" (کَرِشن) سے اسے قریب پایا۔ "کُنشت" آپ کو قافیہ "بہشت" کا ہاتھ آیا۔

۱۰۔ اسلامی زمانے کے لفظوں میں سے عربی میں ایک لفظ "تاریخ" ہے۔ جو اپنے مشتقات (تاریخی، مُوَرَّخ، مُؤرِّخ) کے ساتھ فارسی وغیرہ میں موجود ہے۔ لفظ کی اصل سے تو بحث ہوتی رہے گی۔ پہلے، ایک اور بات یاد آگئی ہے اسے کہہ دوں۔ "مورّخہ ۲ رجب" اس کتابت کو کہیں گے جو ۲ رجب کو لکھی گئی۔ مگر اردو اخباروں میں اکثر دیکھا جاتا ہے: "مورّخہ ۲ رجب کو ایک مشاعرہ ہوا ......" اس علمی تنزل کا اندازہ کیجیے اور افسوس۔

خود عرب اہلِ لغت کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس لفظ کو اہلِ کتاب سے حاصل کیا۔ سُریانی میں "یرحا" چاند کو کہتے ہیں اور چاند کے مہینے کو بھی۔ "تاریخ، مُورِّخ، موَرَّخ" اسی سے عربی والوں نے بنایا

۱۱۔ "شبّر" حضرت امام حسنؓ کو، "شبیر" حضرت امام حسینؓ کو کہتے ہیں، مگر یہ دونوں لفظ عربی میں قدیم نہیں، اور فارسی کے فرہنگ نگاروں نے انھیں بجائے ب کے پ سے لکھا ہے۔ صاحب "برہانِ قاطع" کہتا

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

غالب

آغا حیدر حسن

اٹھارھویں صدی کا اخیر دور ہے۔ ہندوستان کے تخت پر دلی میں بے بصر شہنشاہ شاہ عالم تیمری جلوہ فرما ہے۔ انتظام سلطنت دکھنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ آگرہ جاٹوں اور دکھنیوں کے ہاتھوں لٹ کٹ گیا ہے۔ دونوں شہروں کے سرخ سنگ بستہ قلعے جمنا کی کے کنارے جوں کے توں کھڑے ہیں۔ لال حویلی میں جہاں پناہ براجمان ہیں اور آگرہ کے قلعہ میں مغلئی صوبہ دار ہے۔ آگرے کی پرانی حویلیاں مغل امیروں کی امارت پر گواہی دینے کو ابھی تک موجود ہیں۔ جن کے عالیشان سنگین پھاٹکوں کے اوپر بالاخانے اور بنگلیاں ابھی تک آباد ہیں۔ سڑکوں پر لال پتھر کی سلیں بچھی ہیں جن پر رتھوں کے نقاشی پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے جو لیکیں پڑ گئیں ہیں شہر کی چہل پہل کا پتہ دیتی ہیں۔ رتھوں کے کارچوبی اور ریشمی پردے۔ چھتوں پر سنہری کلس۔ کلسوں پر شیشوں کے سورج مکھی۔ سرخ سبز ریشم اور گنگا جمنی بادلے کے پھندنے چوطرف لٹکتے۔ ناگوری بیل جتے۔ سرت پیر تک سجے۔ گلے میں گھنگرو پیروں میں جھانجن چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے۔ ہاتھیوں کے گھنٹوں کی ٹن ٹن وحشت بڑی بڑی کی آوازیں۔ پالکیوں "تام جھاموں" سکھ پالوں اور ہوا داروں کے ساتھ کہاروں کی ہنکاروں جو [illegible] بڑھو کی صداؤں سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ [illegible] جھلملاتی [illegible] چہرے۔ پاگ۔ پگڑیاں [illegible] ابھی [illegible] کے زمانے میں جبکہ اٹھارویں صدی کے اختتام میں تین برس باقی تھے کہ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی حویلی میں کشمیرن کے کٹڑے کے پاس مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا اپنے خسر خواجہ غلام حسین خاں ہی کے پاس اپنی بیوی عزت النساء بیگم کے ساتھ گھر داماد بنے رہتے تھے۔ معلوم نہیں اس نونہال کی ننھیال پر کیا کچھ اسراف ہی پر سلامی اور کیا کچھ نہ مانگت ہوئی ہوگی۔ کون کون سے چھٹے چھلے اور کون کون سی چوسنے والیاں آئی ہوں گی اور کون کون سی چھیڑ چھاڑ اور رت جگے ہوئے ہوں گے [illegible] کیا ہوگا معلوم نہیں اس میں مرزا کی دنیائے شاعری کو شہرت کے باب میں بہا بیش بہا ملی ہوگی۔ مرزا سات برس کے ہوتے ہیں اور اپنی چچی بیگم نصر اللہ بیگ خاں کے ساتھ جو عارف جان کی بیٹی اور نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں کی بہن تھیں دلی آ گئے تھے۔ شاہ عالم از دلی تا پالم ابھی زندہ ہیں۔ اپنی جزوی سی اور دکھنیوں کی [illegible] شائستہ سے خزانے کی حالت بد حال ہے۔ ایک تخت طاؤس بھی بنوایا ہے۔ دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کئے دیکھی کو ان دیکھی اور سنی کو ان سنی کئے صبر شکر سے بیٹھے ہیں۔ جو آتا ہے کا اندر در در دورہ ہے۔ باہر نائب پیشوا کی باندھی بندھتی اور کھولی کھلتی ہے۔ خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا اور حکم باغیوں کا ہے۔ ان دنوں کی دلی۔ لندن پیرس۔ برلن سے بڑی اور آباد ہے۔ باور نہ ہو تو اس زمانے کے فرنگیوں کے سفر اٹھا کر دیکھ لیے جائیں اور یہ وہ زمانہ ہے کہ تخت اڑ گئے پابندی رہ گئی ہے مگر ہاتھی لٹا لٹا پا بھی سوا لاکھ کا۔ شاہجہان کی دلی پھر دلی ہے۔ سڑکوں پر سنگ خارا کی ٹوڈیوں کا فرش ہے۔ دونوں طرف کی سیڑھیوں پر لال پتھر کے چوکے بچھے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے حویلیوں کے پھاٹک۔ جن کے کھواڑوں پر برنجی کنولی رتانی بیچیں طلس۔ رتھ بہلیاں۔ تانگے۔ سکھوپیاں۔ ہوا دار۔ تام جھام۔ پالکیاں۔ تخت رواں سکھ پال۔ چنڈول۔ جھاڑول۔ نالکیاں۔ ہاتھی گھوڑوں کی آرجار۔ امیر امرا ہتیار لگائے۔ زیور پہنے۔ بناؤ سنگار کئے۔ مرقع بنے۔ حشم خدم ساتھ۔ نقیبوں کی آواز۔ کڑکیتوں کے کڑکے۔ چوبدار۔ طلایہ۔ آسے بردار اعتبار بردار۔ مردے۔ شاہی سواریوں کے ساتھ بھیڑ کو چھانٹتے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا۔ کھوے سے کھوا چھلتا۔ تھالی پھینکو تو سر پر چلتی۔ رات کو سواری نکلتی ہے۔ تو مشالچی مشالیں (مشعلیں شعلیں) پیچھی والیاں پیچھیاں لئے۔ ایک ہاتھ میں مشعل دوسرے میں تیل کی برنجی کپی۔ تیل ٹپکاتے چلے جاتے ہیں۔ مشعلوں کا دھواں اٹھتا اور اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ رات رات تھی اور دن دن۔ اس وقت مرزا نوشہ سات برس کا سن۔ گلبدن کی تماں (تنبان) چندیری کا ننھا منا سا جامہ۔ گوٹے کی ٹوپی۔ چیرا۔ ننھی جان۔ گوکھرو۔ کرن۔ تو لی ٹکی۔ اوڑھے مندر دوزی کی کفش پہنے۔ پیاری پیاری صورت۔ دلی میں آئے ہونگے۔ جس کی باتیں اپنی چچی سے اور اپنے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں سے سنی ہونگی۔ اور دیکھنے کا انہیں اتنا ارمان ہوگا۔ جیسا آجکل کے ادھ مات چھوروں کو لندن اور پیرس کا۔ مرزا بچارے جب دلی میں آئے ہونگے تو اپنی چچی نے میکے قاسم جان کی گلی میں اترے ہوں گے۔ ان کے ہم عمر بچوں نے جب مرزا کو اکبر آبادی لب و لہجے میں بات کرتے سنا ہوگا تو کیسے ہنسے ہوں گے کیسا بنایا ہوگا۔ آنکھ مچولی۔ چیں منی پہاڑ دا۔ سرنگ لال گھوڑی کا ڈکنول بانسلی۔ کونڈی کھن کمن۔ اندھا چھینا۔ کوڑا جمال شاہی پیچھے دیکھے مار کھائی۔ چیل جھپٹا۔ چدر کھیول کھلی ہوگی۔ کچھ دنوں دلی میں رہ کر اور دلی پیاری کی تہذیب شائستگی کا رعب اپنے ننھے دل میں لے کر ننھیال آگرے واپس ہوئے ہونگے۔ اس زمانے کی دلی وہ دلی تھی کہ ہر شخص اپنے کو رستم افراسیاب جمشید و کیقباد سمجھتا تھا۔ بانک چوڑی رفتار دلی والیاں۔ باہر والیوں پر ناک بھوں چڑھاتیں۔ ایک ایک کے خاندان کے مرے مرے اگلے جاتے۔ نسلوں میں کی نکلتی سات پشتیں گنی جاتیں۔ دلی کے پوتڑوں کے امیروں میں تو دنیا کا کی

کے مرادف تھا۔ کسی کو سمرقند کا زرگر کسی کو بخارے کا سقہ۔ کوئی کوتے لونڈی والے کی چہیری کوئی بخارے کی کٹنی کا بچہ۔ کسی کو لونڈی بچہ کہدیا اور کسی کو رنڈی بچہ کبھی نہ سمجھا کسی کو قارورہ دیکھنے والا اور کسی کو کلرن کا جنا کہتے۔ اپنی ٹکر کا کسی کو نہ سمجھتے۔ نواب فخرالدولہ کے گھرانے نے خوب عروج حاصل کیا تھا۔ اس لئے دلی والوں کی زبان پر سب سے زیادہ تھا۔ اس گھرانے کی بیویاں پرکٹی پریاں۔ زبان میں وہ قینچی کہ توتیاں ہاتھ لیا رہیں۔ دہن لین بھی اچھا لیکن شہری بر ذرا کم ملے۔ یا تو انہوں نے اپنوں کو ڈھونڈ کا یا غیروں میں بیاہ ہوا ہو وہ تازہ ولایت یا باہر والے۔ دلی ابھی تک مدینۃ الامرا بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک محلے سے چھپن چھپن پالکیاں امیروں کی اور ان کے چیلوں کی نکلتی ہیں۔

مرزا اسداللہ خاں نے عبدالصمد ایرانی سے پڑھنا شروع کیا شفیق اور محب استاد نے دو تین برس میں جو سکھایا جا سکتا تھا سکھا دیا۔ اور فارسی زبان کے گر بتا دئے۔ اب مرزا کا سن تیرہ چودہ برس کا ہے مرزا کی چچی نے اپنی بھتیجی امراؤ بیگم سے جو نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ مرزا کی شادی کردی۔ یہ جوڑا گھس پس کے ہی اترا۔ مرزا کی جس زمانے میں شادی ہوئی ہے وہ زمانہ حضرت اکبر شاہ ثانی کا تھا۔ شہر میں دورہ انگریزوں کا تھا۔ قلعہ میں دربار بادشاہ کا اور شہر میں دربار صاحب کلاں کی کوٹھی پر لگتا تھا۔ توڑ جوڑ کا زور تھا۔ اب خلق خدا کی ملک بادشاہ کا۔ حکم کمپنی بہادر کا تھا شادی کرکے مرزا آگرے چلے گئے۔ عین جوانی کا زمانہ۔ سستے سمے۔ معیشت سے فارغ البال بےفکری دہر کے ساتھ شطرنج اڑتی گنجفہ کھیلا جاتا۔ راجہ بلوان داس سے پتنگ لڑتے۔ اپنے عیش سے گزرتی۔ مثل مشہور ہے کہ دلی کی لڑکی اور گوکل کی گائے باہر جائے تو بھاگوں کو کھائے۔ دلی اور آگرے کی گھریلو زندگی میں بہت فرق تھا۔ مرزا کی بیوی کا دل آگرہ میں نہ لگا۔ اور ادھر ہوئی کچھ پیسے کی کشش۔ نانا نانی کی طرح بھلا ماموں ممانیاں کیوں چاہنے لگے۔ آنکھ بدلنے سے کوچہ بدلنا ٹھیک۔ دلی چلے آتے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ سن بائیس اٹھائیس برس کے اس وقت ہونگے۔ میاں نصیرالدین عرف کالے صاحب کے مرید الٰہی بخش خاں معروف بھی تھے۔ ان کی صحبت مرزا کو میسر آئی۔ مرزا فارسی میں غالب اور اردو میں اسد تخلص کرتے تھے۔ پھر غالب ہی اردو فارسی میں اسد پر غالب رہا۔ میاں کالے صاحب کی صحبت سے غالب نے وہ فیض اٹھایا۔ جس کی بدولت ان کے کلام میں حافظ شیرازی کا عرفان اور حلاوت آگئی۔ مرزا اس پائے کے شاعر تھے کہ سینکڑوں برس جب زمین سورج کے صدقے ہولیتی ہے اور آسمان کو حسرت سے تک لیا کرتی ہے تو عالم ادراج سے اترا کرتے ہیں۔ مرزا کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئے کہ جہاں کسی صنعت میں کمال عوام کو اس بات کا متمنی

بنا دیتا ہے کہ صاحب کمال زندگی کے اور اخلاق کے ہر شعبے میں فرد ہو۔ اور یہ طبیعت میں وہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے چھپوں کو ہی نہ سنیں بلکہ اس کے پرزے اس کا پیٹ چیریں اور اندر کی چھپی آلائشوں کو نکال کر بے معنی طور پر دیکھیں کہ یہ چھپا کہاں سے نکل رہا ہے۔ اسی طرح ہم اگر کسی ہرے بھرے پھلے پھولے باغ میں سیر کو جا نکلتے ہیں تو نہ پھل دیکھتے ہیں نہ پھول بلکہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کسی کونے کھدرے اور جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ میں کوئی گندی گھناؤنی چیز پڑی نظر آئے اور وہاں سے منہ بنانے نکل بھاگیں اور باغ کی ساری بہار پر خاک ڈال کر غلاظت کو خوب اچھالیں۔ یہی ذہنیت ہے کہ اپنے مشاہیر کی خانگی زندگی اور اس کی اخلاقی کمزوریوں کی منڈی کی جنڈی کی جاتی ہے۔ اسی مزاج کے لوگوں نے کبھی تو غالب کے سنی شیعہ ہونے کو چمکایا۔ کبھی انگریزوں کے خوشامدی ہونے کو ڈلکا۔ کبھی انکے فرائض مذہبی کے بجا نہ لانے کو اُگلا۔ یہ نہ جانا کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔ کہ مرزا نوشہ اسد میں اور غالب جنکی بدولت ہماری زبان کو چار چاند لگ گئے۔ بجائے اسکے کہ ہم اپنے ہزاروں شاعروں کے کلام کو جو زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں گوشہ خمیل میں پڑے ہیں۔ شائع کرائیں۔ اور جو اس قابل ہیں ان کو غالب کی صف میں بٹھائیں۔ یہ تو کرتے نہیں۔ بلکہ جو صف قائم ہو گئی ہے اس کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں۔ غالب کے اوپر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اگر وہ سب جمع کیا جائے تو ایک چھوٹی موٹی الماری بھر جائے۔ ان کے لطیفے۔ ان کے خطوط۔ انکے سوانح۔ انکا کلام۔ ان کے کلام کی مختلف شرحیں ہمارے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہیں اور ان کے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب تک کسی ہندوستانی شاعر کے لئے نہیں لکھا گیا۔ غالباً اس کا ان کو سان و گمان بھی نہ ہوگا کہ اتنی ان کی قدر ہوگی۔ اور وہ بھی انگریزی پڑھے لکھوں کے ہاتھوں۔ حیدرآباد میں بھی دو شرحیں لکھی گئیں ہیں۔ ایک مولانا عبدالعلی والہ مرحوم کی ہے اور دوسری شرح ان کے فرزند مولوی عبدالواحد صاحب نے لکھی ہے غالب نے جو خط ذکا مرحوم کو لکھے ہیں۔ اور جو خط ذکا نے غالب کو لکھے ہیں وہ ذکا نے ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دئے ہیں۔ یہ سب فارسی میں ہیں۔ ان کا قلمی نسخہ جو ذکا ہی کا مکتوبہ ہے۔ میرے کتاب خانے میں موجود ہے۔ غالب نے جو فارسی قصیدہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ مرحوم کی شان میں لکھا تھا۔ میری نظر سے گذرا ہے۔ بھلا ان خشک اور روکھی سوکھی باتوں سے اس مضمون کو کیا غرض۔ جب غالب دلی آئے ہیں تو صورت دیکھنے دکھانے کے لائق تھی۔ کتابی چہرہ سبزہ رنگ۔ خوبصورت تمیں۔ دانتوں پر مسی ملی۔ دہرا بدن۔ کشیدہ قامت۔ اچھی ہاڑ۔ چوڑے دم کی کلاہ پاپاخ۔ مشروع کا تنگ موری کا پاجامہ۔ جامہ وار کی چپکن اور اس پر نیمہ آستین۔ تو کدار کفشی۔ یہ وضع شہر آبادی تک رہی۔ البتہ بڑھاپے میں کمر کا سفید برکا پاجامہ۔ ململ کا سفید الفی گریبان کا کرتا اور

گھر تب ململ کی گول ٹوپی جو قدرے سر پر منڈھی رہتی۔ اوڑھتے۔ مرزا کی تقریب
میاں کالے صاحب نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں سے کرادی تھی اور
انہوں نے مرزا کا تعلق قلعہ سے کرادیا۔ جہاں وہ تاریخ لکھنے پر مامور ہوگئے۔
مرزا کا دل اب دلی میں لگ گیا تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مفتی صدرالدین
آزردہ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ اور نواب ضیاءالدین احمد خاں سے دوستی
ہوگئی تھی۔ مفتی صدرالدین کی حویلی میں نہر کے کنارے ایک سنگ مرمر کی چوکی
پڑی ہے جس پر اکثر غالب بیٹھتے۔ سب دوست جمع ہوتے۔ علم و ادب کے
چرچے رہتے۔ دلی کو غالب نے اپنا وطن ہی بنالیا تھا۔ حضرت سے نکلنے
گئے۔ اور رستے میں لکھنؤ ٹھہرتے ہوئے دلی واپس آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں
کی محل سرائے کو غدر کے بعد میرے دادا حضرت سر ... عالیجاہ
پرنس آغا حسین جان صاحب خورشید ... شجاع الملک
نے خرید کر اپنے سمدھی بخشی انعام اللہ خاں مرحوم کے حوالے کردی تھی۔ اسی
محلسرائے میں میں نے ہوش سنبھالا۔ اس کے پھاٹک پر غالب کا قطعہ تاریخ
فارسی میں ہے اور اس کے تمام ... بھی غالب کے قطعے تاریخ اور تعریف
کے سنگ موسیٰ کے حرفوں میں سنگ مرمر کی تختیوں پر کندہ ہوئے لگے ہیں۔
غالب کی دلی میں ابھی بڑے بڑے گُل کھلے چلی جاتی تھی۔ اس نئی رونق کے بعد
حضرت بہادر شاہ ظفر بادشاہ غازی ... غالب کو دکھانے لگے۔ اس
رنگ کو کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کیسی کی قوت ... تھا باوری سری فوج لے
جو جانا کیا۔ پاداش میں دلی والوں کو بھگتنی پڑی۔ اور ... ہوگئی۔
غالب کا یہ حال ہے کہ ہڈی ست لنگڑا لنگڑا۔ کانوں سے بہرے۔ بڑھے پھونس۔
ہلنے جلنے کی طاقت نہیں۔ اس پر بھی دوستوں کے خط آتے ہیں۔ جواب
لکھواتے ہیں۔ شہر کھدا کھلا برابر ہوا۔ جو گھر اور حویلیاں۔ محلسرائیں باقی
ہیں انہیں داخت کھوتے جھیلیں بھولیں۔ شہر پناہ جگہ جگہ سے ٹوٹی۔
جہاں دنیا اُنڈی پڑتی تھی۔ اندر چلنے کو رستہ نہ ملتا تھا وہاں ہو کا میدان
ہے۔ کدال پھاوڑے بج رہے ہیں اور گدلے برس رہے ہیں۔ چوطرف
عجب ویرانی۔ حیرانی۔ اور پریشانی۔ غالب اس بربادی کے بارہ برس منہ
دیکھنے کے بعد دو کم پون سو برس کی عمر میں اپنے مولا سے جاملے۔ اپنی سالی
بنیادی بیگم کے لڑکے نواب زین العابدین خاں عارف کے دو بیٹوں باقر علی خاں
اور حسین علی خاں کی شادیاں کردی تھیں۔ نواب بیگم جو نواب شمس الدین خاں والئ
فیروزپور جھرکہ کی بہن کے بطن سے تھے۔ بڑی بگا بیگم صاحب مرحومہ جو نواب
باقر علی خاں کی بیوی تھیں ان کے پاس میں بچپن سے جاتا تھا اور یہ میری دادی
حضرت کی منہ بولی بہن بنی ہوئی تھیں۔ اس سے ان کو میں دادی اماں کہا کرتا تھا۔
ان کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی صاحبزادی جنکو غالب جیون بیگ پیار سے
کہا کرتے تھے۔ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں ابن نواب شہاب الدین احمد خاں
ثاقب سے بیاہی گئیں۔ یہ دونوں میاں بیوی سگے ماموں زاد پھوپھی زاد
بہن بھائی تھے یہ لاولد رہیں اور اب کوٹھی نواب شجاع الدین احمد خاں
گلی قاسم جان میں رہتی ہیں۔ منجھلی صاحبزادی نواب بشیرالدین احمد خاں ابن نواب
علاءالدین احمد خاں سے بیاہی گئیں۔ ان کے ہاں دو صاحبزادے اور دو
صاحبزادیاں ہوئیں۔ ان کی صاحبزادی عالیہ بیگم لیڈی عبدالصمد خاں اور
نواب خسرو مرزا بقید حیات ہیں۔ دادی بگا بیگم کی تیسری صاحبزادی کرنل
ضیاالدین احمد مرحوم سے بیاہی گئیں اور ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔ غالب کی
وفات کے ایک سال ہی کے اندر اندر امراؤ بیگم صاحبہ نے بھی انتقال کیا۔ غالب
اپنی سسرالی بزرگوں کے مزار میں چونسٹھ کھمبے کے پاس سلطان جی میں آسودہ ہیں جہاں
ان کی قبر آج تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہے اور ہماری قدر دانیوں
پر عبرت کا سبق دیتی ہے۔

کچھ غیر لفظ اردو میں —— بقیہ صفحہ ۱۱۹

کہتا ہے: "شبیر بہ لغت سریانی بمعنی خوب و نیک است و بہ عربی حسن
گویند...... شبیر بہ لغت سریانی، مصغر خوب و نیک است کہ خوب و
نیک باشد و بہ عربی حسین گویند"
یہ جو "شبیر" کو "شبر" کا اسم تصغیر بتایا ہے، صحیح نہیں۔ بظاہر نرمی ترکیب
ہے کہ جیسے عربی میں "حسین" "مصغر" "حسن" کا ہے، سریانی میں بھی ی سے
تصغیر کا عمل کیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ سریانی میں یہ تصغیر کی نہیں، البتہ
مبالغے کی صورت ہے، یعنی بہت خوب اور بہت نیک۔ سریانی میں "شپیرا"
خوش رو اور نیک کے لئے ایک عام لفظ ہے، الف اس میں بھی وہی لاحقہ ہے
جسے ہم پہچان چکے ہیں۔ حضرت حسینؑ کو عراق والوں نے اپنی زبان میں "شپیر"
کہا ہوگا ایرانیوں نے وہاں سے اخذ کیا اور عربوں کی زبان سے پ کی
جگہ ب ہی نکل سکتی تھی۔ اس طرح عربی کے اہل لغت نے "شبر" اور اس کے
مادے کو عربی جانا ہوگا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سریانی میں جس
حرف کا تلفظ پ ہے وہ بعض صورتوں میں (جیسے لفظ کے آخر میں) ف کی
آواز دیتا ہے۔ عربی میں جو لفظ سریانی یا عبرانی سے قدیم زمانے میں
آئے ان میں پ ہمیشہ ف ہوگئی ہے۔ "شبر" اور "شبیر" میں اس حرف کا
ف نہ ہوجانا دلیل اس بات کی ہے کہ یہ لفظ اسلامی دور میں (یا اس
سے کچھ ہی پہلے) عربی میں آئے۔
خلاصہ یہ کہ ان لفظوں کو اور ان کے علاوہ اور بہت سے لفظوں کو
ہم روزمرہ بولتے اور فارسی یا عربی جانتے ہیں۔ حقیقت میں یہ نہ عربی ہیں
نہ فارسی، مگر ان زبانوں کا جزء، اور ایسا اہم جزء، ہوگئے ہیں کہ انہیں ان
زبانوں سے یا اردو سے بے دخل کرنا آج کسی کے بس کی بات نہیں۔

خطاطی اور مصوری، عہد اکبر میں

مرزا محمد عسکری

لفظ اور خط کی ماہیت

خط ایک روحانی ہندسہ ہے جسکو ایجاد کے قلم نے کھینچا اور ایک آسمانی کتاب ہے جس کو تقدیر کے ہاتھ نے لکھی۔ لفظ کی رفتار زبانی ہے۔ لفظ، سننے والے کو دل کی قوت بخشتا ہے اور لفظ نزدیک اور دور دونوں کو آگاہی بہم پہونچاتا ہے۔ اگر خط کا وجود نہ ہوتا تو لفظ بیکار ہوتا اور ہم کو قدیم لوگوں سے کوئی پیغام نہ پہونچ سکتا۔ "خط" ایک ظلمت ہے جس میں ہزاروں روشنیاں چھپی ہوتی ہیں۔ یا وہ ایک نور ہے جس کی حقیقت ظاہری آنکھ سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ "خط" عقل کا نقش و نگار اور ایک ایسی اندھیری رات ہے جس سے چمکتا ہوا سورج پیدا ہوتا ہے۔ یا وہ ایک سیاہ ابر ہے جو بینائی کے خزانے پر علم کی بارش کرتا ہے۔ وہ ایک طلسم ہے جسکو خموش اور گویا دونوں کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہے مگر اس کی روانی کی کوئی حد نہیں۔ ایک مقام پر ساکن ہے مگر اس کی بلند پروازی کی کوئی انتہا نہیں۔

لفظ اور خط کا وجود

قدرت کے علمی خزانے سے نفس ناطقہ پر ایک عکس پڑتا ہے جس کو وہ مملکت خیال کے شہرستان میں پہنچاتا ہے تاکہ مجرد اور مادی دونوں کا تعلق پیدا ہو جائے۔ پھر وہی عکس شہرستان خیال سے نکل کے ہماری زبان پر قدم رکھتا ہوا موج ہوا کے زور سے کان کے دریچوں میں آجاتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ اسی راستے سے پھر اپنے اصلی مبدا پر واپس جاتا ہے۔

کبھی نفس ناطقہ اس آسمانی سیاح کو انگلیوں کے ذریعہ سے حرکت میں لاتا ہے۔ اس صورت میں وہ قلم اور روشنائی کے بر و بحر کو طے کرتا ہوا صفحۂ قرطاس کے خوبصورت باغ میں جلوہ فرما ہو کر آنکھوں کی راہ اپنے وطن اصلی کو واپس جاتا ہے۔

حرف کی کیفیت

چونکہ خط کا تعلق حرف سے ہے لہذا حرف کی حقیقت معلوم کرنا چاہئے۔ حرف ایک کیفیت خاص کو کہتے ہیں جو ہوا کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب دو ٹھوس سخت چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو ان کے ملنے کو "قرع" کہتے ہیں اور اگر اسی شدت سے جدا ہوتی ہیں تو اس کو "قلع" کہتے ہیں۔ جب درمیانی ہوا مثل پانی کے لہریں پیدا کرتی ہے تو اس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ بعض حکما ان ہوائی لہروں کو آواز کا سبب بعید اور بعض سبب قریب قرار دیتے ہیں۔ آواز میں بسبب قرع یا قلع مختلف کیفیتیں ظاہر ہوتی ہیں جنہیں زیر و بم (اونچے نیچے سُر) غنیت (رنگی) اور رجونیت (آہرج) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب مختلف مخارج اور اجزائے ہوائی کے انتشار سے ایک دوسری کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی وہ زیر و بم، غنے اور دوکھر جیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ اسی قسم کی آواز کا نام حرف ہے۔ یہ نظریہ بوعلی سینا کا ہے مگر بعض حکما بجائے عارض کے حرف کو اس کیفیت خاص کا معروض سمجھتے ہیں۔ اور ایک تیسری جماعت اس کو عارض و معروض کا مجموعہ خیال کرتی ہے۔ یہی صحیح رائے معلوم ہوتی ہے۔

تعداد حروف

حروف کی تعداد ہندی زبان میں باون فارسی میں اٹھارہ اور عربی میں اٹھائیس ہے۔ عربی حروف کی ظاہری صورت اٹھارہ اور ملی ہوئی صورت پندرہ ہے بشرطیکہ ہمزہ الف سے الگ نہ کیا جائے۔

آخر میں ایک مرکب حرف "لا" ہے جو ملا کر اس وجہ سے لکھا جاتا ہے کہ ساکن اور متحرک کے ملنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ اگر کہا جائے کہ حرف لام کی کیا تخصیص تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لام حرف الف کا وسط اور الف حرف لام کا وسط ہے۔ قدیم زمانے میں اعراب کا رواج نہ تھا۔ حروف پر صرف نقطے دیدیتے جن سے اعراب کا پتہ چل جاتا تھا۔ مثلاً زبر کی جگہ حرف کے اوپر ایک سرخ نقطہ۔ زیر کی جگہ حرف کے نیچے نقطہ اور پیش کے واسطے حرف کے آگے نقطہ۔ اور خلیل ابن احمد عروضی نے ہر حرکت کے واسطے ایک صورت مقرر کی یعنی زبر زیر پیش کی ایجاد ہوئی جیسا کہ آجکل رائج ہے۔

ہر عقلمند آدمی سمجھتا ہے کہ کسی رسم خط کی اچھائی یا برائی پڑھنے والے کے اختلاف مذاق پر موقوف ہے کیونکہ ہر گروہ ایک خاص طرز کو پسند کرتا ہے۔

اقسام خطوط

پرانی کتابوں اور خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں خط کی اتنی قسمیں تھیں۔ ہندی۔ سریانی۔ یونانی۔ عبری۔ قبطی۔ معقلی۔ کوفی۔ کشمیری۔ حبشی۔ ریحانی۔ عربی۔ پارسی۔ رومی۔ حمیری۔ بربری۔ وغیرہ۔ بعض لوگ خط عبری کو آدم علیہ السلام سے اور بعض ادریسؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبری خط معقلی سے پیدا ہوا۔ کچھ کہتے ہیں کہ خط کوفی کی ایجاد حضرت علیؑ نے معقلی سے کی۔ مختلف خطوں میں اختلاف سطح اور دور سے پیدا ہوتا ہے مثلاً

خط کوفی میں ایک دانگ دور ہے اور باقی سطح۔ اور معقلی میں کل سطح یہ فرق پرانی عمارات کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

موجودہ اقسام خطوط

آجکل ایران و توران و روم و ہند میں آٹھ قسم کے خط مروج ہیں جن میں سے کہا جاتا ہے کہ چھ کو ابن مقلہ نے ۳۱۰ ہجری میں خط معقلی اور کوفی سے حاصل کیا۔ اور وہ چھ خط یہ ہیں۔ ثلث۔ توقیع۔ محقق۔ نسخ۔ ریحان۔ رقاع۔ بعض لوگ خط غبار کو اضافہ کرتے ہیں اور سات خط مانتے ہیں۔ نسخ یاقوت مستعصمی نے خط ثلث سے ایجاد کیا۔ نسخ میں دو دانگ دور اور چار سطح ہے۔ اس کی دو قسمیں رکھیں۔ جلی اور خفی۔ اسی طرح توقیع اور رقاع میں ساڑھے چار دانگ دور اور باقی سطح ہے۔ اور جلی و خفی اس میں بھی ہے۔ اور محقق و ریحان میں بھی ساڑھے چار دانگ دور اور اسی قدر سطح ہے۔ اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ علی ابن ہلال مشہور بہ ابن بواب چھتوں خط خوب لکھتا تھا۔ اور یاقوت نے ان سب کو کمال پر پہونچایا۔ یاقوت کے چھ شاگرد مشہور ہوئے۔ شیخ احمد جو شیخ زادہ سہروردی کے نام سے مشہور ہیں۔ ارغون کابلی۔ مولانا یوسف شاہ مشہدی۔ مبارک شاہ زریں قلم۔ حیدر گندہ نویس۔ میر یحییٰ صوفی۔ ان چھوں کے علاوہ یہ لوگ بھی مشہور خطاط گذرے ہیں۔ نصر اللہ۔ جو صدر عراقی کے نام سے مشہور ہیں۔ ارقون عبداللہ۔ خواجہ عبداللہ صیرفی۔ حاجی محمد۔ مولانا عبداللہ آتش نسر۔ محی شیرازی۔ معین الدین تنوری۔ شمس الدین خطائی۔ عبدالرحیم جلوتی۔ عبدالحی۔ مولانا جعفر تبریزی مولانا شاہ مشہدی مولانا معروف بغدادی شمس الدین بایسنغری۔ معین الدین فراہی۔ عبدالحق سبزواری۔ مولانا نعمت اللہ بواب۔ خواجگی مومن مروارید جو افشانی اور رنگ آمیزی کے موجد ہیں۔ سلطان ابراہیم پسر مرزا شاہ رخ۔ محمد حکیم حافظ۔ محمود سیاوش۔ جمال الدین حسین۔ مولانا پیر محمد۔ میر فضل الحق قزوینی۔ یہ سب لوگ بھی چھتوں خط لکھنے کے استاد تھے۔

تعلیق کی ایجاد

ساتواں خط تعلیق ہے جو رقاع اور توقیع سے حاصل ہوا۔ اس خط میں سطح بہت کم ہوتی ہے۔ خواجہ تاج سلمانی اس خط کو بہت خوب لکھتے تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ انہیں کی ایجاد ہے۔ متاخرین میں مولانا عبدالحی اور سلطان ابو سعید میرزا کے منشی اسکے استاد تھے اسیطرح مولانا درویش۔ امیر منصور۔ ابراہیم استر آبادی۔ خواجہ اختیار۔ جمال الدین۔ محمد قزوینی۔ مولانا ادریس۔ خواجہ محمد حسین۔ اور جہاں پناہ (شہنشاہ اکبر) کے میر منشی اشرف خاں۔ یہ سب لوگ اس خط میں کمال رکھتے تھے۔

نستعلیق

آٹھویں قسم نستعلیق ہے جس میں سب دور ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی ایجاد صاحبقران امیر تیمور کے زمانے میں خواجہ میر علی تبریزی نے نسخ اور تعلیق سے کی۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اسوجہ سے کہ صاحبقران کے پیشتر اکثر نامے اسی خط میں دیکھے گئے ہیں۔ اس خط کے استاد یہ لوگ مانے جاتے ہیں۔ جعفر تبریزی مولانا اظہر۔ محمد اودبہی۔ (اس فن میں ان کا جواب نہ تھا) باری ہروی۔ اور ان سب سے زیادہ مشہور سلطان علی مشہدی تھے جنہوں نے مولانا اظہر سے کسب فن تو نہیں کیا مگر ان کے کتبوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ انکے چھ شاگرد بہت مشہور ہوئے۔ سلطان محمد خنداں۔ محمد نور۔ علاء الدین ہروی۔ زین الدین۔ عبدی نیشاپوری۔ محمد قاسم شادی شاہ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے طرز پر خوب لکھتا تھا۔ بعد کے لوگوں میں سب سے مشہور خطاط میر علی ہروی تھے جو ظاہر میں زین الدین کے شاگرد تھے مگر سلطان علی مشہدی کی تحریروں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی ذہانت سے اس خط میں بہت تصرف کئے۔ مشہور ہے کہ ایک دن کسی نے پوچھا کہ آپ کی تحریر اور مولانا سلطان علی کے طرز میں کیا فرق ہے۔ جواب دیا کہ میں بھی اچھا لکھتا ہوں مگر ان کے خط میں ایک خاص لطف و نمک ہے۔

دربار اکبری کے مشہور خطاط

شہنشاہ کی قدر دانی اور قیمت شناسی سے مختلف خطوں نے ترقی اور رواج پایا اسی وجہ سے بڑے بڑے خوشنویس اور خطاط اس زمانے میں پیدا ہوئے منجملہ ان کے محمد حسین کشمیری جو زریں قلم کے نام سے مشہور ہیں۔ مولانا عبدالعزیز جنکے مدات و دوائر بے نظیر سمجھے جاتے ہیں اور ان کا مقابلہ مشہور خطاط میر علی سے کیا جاتا ہے۔ مولانا باقر پسر میر علی۔ محمد امین مشہدی۔ میر حسین کلنگی۔ مولانا عبدالحی مولانا دوری۔ عبدالرحیم۔ میر عبداللہ۔ نظامی قزوینی۔ علی حسین کشمیری۔ نور اللہ قاسم ارسلان۔ یہ سب استاد اسی دربار سے وابستہ ہیں۔

تقسیم کتب

جہاں پناہ نے تقسیم کتب کئی طریقے سے کی ہے۔ کچھ کتابیں زنانخانے میں اور کچھ باہر رہتی تھیں۔ ان دونوں کتب خانوں کی ترتیب و تقسیم مختلف علوم و زبان، نظم و نثر کے اعتبار کی گئی ہے۔ ہر دور مصاحبین خاص بادشاہ سے عرض و معروض کیا کرتے ہیں اور بادشاہ ہر کتاب کو اول سے آخر تک سنتے ہیں اور جس جگہ پہنچتے اپنے قلم مبارک سے نشان بنا دیتے ہیں۔ تعداد اوراق کے مطابق پڑھنے والے کو روپیہ اور اشرفی مرحمت ہوتی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو سمع مبارک میں نہ آئی ہو۔ اور کم کوئی تاریخ و داستان قدیم اور غرائب و نوادر زمانہ ہونگے جو حضرت کے سامنے نہ بیان کئے گئے ہوں۔ مکرر سننے سے طبیعت والا پریشان نہ ہوتی بلکہ بڑی خواہش و شوق سے سنتے۔ جو کتابیں پیش گاہ حضور میں پڑھی جاتی ہیں یہ ہیں۔

اخلاق ناصری۔ کیمیائے سعادت۔ قابوس نامہ۔ مکتوبات شرف منیری۔ گلستاں بوستاں۔ حدیقۂ حکیم سنائی۔ مثنوی معنوی۔ جام جم۔ شاہنامہ۔ خمسہ نظامی۔ کلیات خسرو۔ کلیات جامی۔ دیوان خاقانی۔ دیوان انوری اور ان کے علاوہ کتب تاریخ وغیرہ۔

تراجم اعلیٰ حضرت قابل لوگوں کو زبان ہندی، عربی، فارسی، یونانی سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ٹکڑا زیچ جدید میرزائی کا میر فتح اللہ شیرازی راقم الحروف کشن جوشی گنگا دھر مہیش مہانند کے اتفاق اور محنت سے ہندی سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اسی طرح کتاب مہابھارت قدیم تاریخ ہندوستان کو نقیب خاں، شیخ عبدالقادر بدایونی، اور شیخ سلطان تھانیسری نے ہندی سے فارسی میں کیا۔ اس میں ایک لاکھ بیت ہیں اور اس کا نام خود اعلیٰ حضرت نے رزم نامہ تجویز فرمایا ہے۔ انہیں تینوں اصحاب مذکور نے کتاب رامائن کا بھی جو ایک مشہور پرانی تاریخ ہے فارسی میں ترجمہ کیا۔ کتاب اتھرون کو جو ہندوؤں کے اعتقاد میں ان کی چار آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے حاجی ابراہیم سرہندی نے جامہ فارسی پہنایا۔ اسی طرح لیلاوتی مشہور کتاب حساب میرے برادر بزرگ شیخ ابوالفیض فیضی نے فارسی میں کی۔ نجوم کی مشہور کتاب تاجک شاہی حکم سے مکمل خاں گجراتی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور بابر بادشاہ کے تزک یعنی دستورالعمل کو میرزا خانخانان ترکی سے فارسی میں لائے۔ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ایک عمدہ تاریخ کشمیر جس میں چار ہزار برس کے حالات ہیں زبان کشمیری سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ معجم البلدان کا فارسی ترجمہ ملا احمد ٹھٹھ، قاسم بیگ، شیخ منور اور بعض اور لوگوں نے کیا۔ مولانا شیری نے ہربنس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ یہ کتاب ہربنس کرشن کے حالات میں ایک مبسوط تاریخ ہے۔ اور باوجود اس کے کہ کلیلہ دمنہ کا ترجمہ سابق میں نصراللہ مستوفی اور ملا حسین واعظ فارسی میں کر چکے تھے مگر حکم شہنشاہ راقم الحروف نے ایک جدید ترجمہ بنام عیار دانش کیا۔ اسی طرح نل دمن کو جو زبان ہندی میں مشہور عشقیہ قصہ ہے برادر بزرگ شیخ فیضی فیاضی نے لیلا مجنوں کی بحر میں فارسی کا جامہ پہنایا۔ حسب الحکم شہنشاہی ایک ہزار سال کے تاریخی حالات سب سے پہلے نقیب خاں اور کچھ لوگوں نے اس کے بعد مولانا احمد ٹھٹوی نے اور بعد کو جعفر بیگ آصف خاں نے بصورت کتاب جمع کئے اور راقم الحروف نے اس کا دیباچہ ترتیب دیا۔ اس کتاب کا نام تاریخ الفی ہے۔

فن مصوری شبیہ کشی عرف میں تصویر کہلاتی ہے۔ چونکہ یہ فن سنجیدگی اور تفریح دونوں کا مجموعہ ہے اسلئے جہاں پناہ کو شروع ہی سے اس فن کا بڑا شوق تھا اور اسی سبب سے اس فن کو ان کے عہد اقبال میں بڑی ترقی ہوئی اور بڑے بڑے مصور پیدا ہوئے۔ ہر ہفتہ اس فن کے بہترین نمونے نظر اشرف سے گذرتے ہیں اور عمدگی و قابلیت کے مطابق مناسب انعام عطا ہوتا ہے۔ حضرت کی توجہ خاص سے فن تصویر کے مختلف مصالحوں اور رنگوں میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں ہوئیں جن سے شبیہ کی عمدگی دوبالا ہوگئی پھر داکی سحرکاری اور اہل فرنگ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس زمانے کی تصویروں میں عجب نزاکت، صفائی، اور پختگی اور دوسری صنعات عالیہ ہیں جو قدیم زمانے میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ اب پتھر کی تصویریں کمال فن کاری سے جاندار معلوم ہوتی ہیں۔ سو آدمیوں سے زیادہ اس خاص کام میں بلند مرتبے پر پہونچے اور درجہ کمال کو پہونچ گئے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں لوگ ہیں جو گویا آدھے راستے میں ہیں اور نقطۂ کمال تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں ہندوستان میں یہ فن ابتدائی مراتب پر تھا مگر اب اس کا مقابلہ کوئی دوسری اقلیم عالم نہیں کر سکتی۔

اس عہد کے مشہور مصوّر اس شاہراہ پر سب سے آگے چلنے والے میر سید علی ہیں جنکا اصلی وطن تبریز ہے پہلے اپنے باپ سے سیکھتے تھے جب سے دربار دُربار میں آئے اور نظر اقدس ان کے کام پر پڑی تو اس فن میں سب سے بڑھ گئے۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم۔ شیراز کے رہنے والے ہیں گو کہ اس فن کو پیشتر سے جانتے تھے مگر شہنشاہ کی تربیت سے مشہور و معروف اور بیسیوں شاگردوں کے استاد ہو گئے۔

دسونت ایک کہار کا لڑکا ہے جو تصویر خانے کا ملازم تھا اور شروع میں دیواروں پر نقشے اور تصویریں بنایا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ کی نظر کیمیا اثر اسکے کام پر پڑی ژرف نگاہی سے سمجھ گئے کہ یہ لڑکا ہونہار ہے۔ خواجہ عبدالصمد کے سپرد کیا گیا کہ وہ تعلیم دیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں یگانۂ روزگار ہو گیا۔ آخر میں یہ مجنوں ہو گیا تھا اور اسی حالت میں اپنے تئیں ہلاک کر دیا۔ اس کی یادگار چند بہترین تصویریں ہیں۔

بساون۔ اطراحی (ڈیزائن) چہرہ کشائی (پورٹریچر) اور رنگ آمیزی اور نقل (کاپی) میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ متبصر اس کے عمل کو دسونت پر ترجیح دیتے ہیں۔

کیسو۔ لعل۔ مُکند۔ مشکین۔ فرخ قلماق۔ مادھو۔ جگن۔ مہیش۔ کھیم کرن۔ تارا۔ سانولا۔ ہربنس۔ رام۔ یہ سب اپنے اپنے کام کے استاد ہیں مگر تفصیل کی جائے تو طوالت ہوگی

لطیفۂ مبارک ایک دن پرائیوٹ صحبت میں جسمیں خاص خاص لوگ شریک تھے زبان مبارک سے فرمایا کہ کچھ لوگ اپنی کم نگاہی سے فن تصویر کی مذمت کرتے ہیں اس سے مجھکو تکلیف ہوتی ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مصور تو خدا شناسی میں بہت لوگوں سے آگے ہے اس واسطے کہ جب کسی جاندار کی تصویر کھینچتا ہے اور عضو عضو کا نقش بناتا ہے

(باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

ہندی - اُردو - ہندستانی

ہندوستان کی سرزمین میں ان سارے وسائل کی جو انسانی زندگی کے لئے اہم ہیں، فراوانی بھی ہے اور تنوع بھی۔ اگر خدا کی مخلوق میں انسان کا مرتبہ سب سے برتر و بالا ہے تو ہر طرح کی دولت میں ہندوستان بھی دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ اگر گویائی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے تو تہذیب کی ترازو میں بھی اس کی گوناگوں زبانوں کا پلہ اونچا ہے۔ دس کروڑ انسانوں میں اگر بہت سی بولیاں رائج نہ ہوں یا ان میں بولیوں کی کثرت نہ ہو تو ایسے انسانوں کی حیثیت ایک بے معنی ڈھیر ہی سی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی بولی ہر پانچ میل کے بعد اپنا روپ بدل لیتی ہے۔ یہ بات بس ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے کہی جاتی ہے۔ اور اسی لئے اس میں ذرا بھی اچنبھے کی بات نہیں کہ ہندوستان میں بارہ بڑی بڑی زبانیں اور سینکڑوں بولیاں رائج ہیں۔

ان بارہ بڑی زبانوں میں سے آٹھ ہند آریائی زبانوں کی بڑی نسل سے ہیں اور چار دراوڑی ہیں۔ دراوڑی زبانیں یا تو دور دکھن میں بولی جاتی ہیں یا ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر۔ ہند آریائی زبانوں کا قبضہ شمال کے وسیع میدانوں اور دکن کے علاقوں پر رہا ہے۔ دراوڑی زبانوں کے نظم و نثر اور ادب نے ہند آریائی زبانوں پر اپنا اثر ضرور ڈالا ہے لیکن ان کی حکمرانی ایک محدود علاقہ میں ہے اور ان کے بولنے والوں کی گنتی بھی نسبتاً کم ہے۔

لوگوں کے ایک بہت بڑے طبقہ کی مذہبی تعلیمات کا سرمایہ ہند آریائی زبان سنسکرت کے سینہ میں محفوظ ہے اور بہت سے بڑے بڑے مذہبی مصلحوں نے مختلف وقتوں میں اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے پالی، اردھ مگدھی، برج بھاشا وغیرہ بولیوں سے (جو ہند آریائی بولیاں ہیں) کام لیا ہے۔ اور اس لئے قدرتی طور پر دراوڑی زبانوں کی سماجی اہمیت ہند آریائی زبانوں کے مقابلہ میں کم رہی ہے۔

لیکن ایک بات اور ہے۔ جہاں ایک طرف فراوانی اور کثرت ہندوستان کی سرزمین کی امتیازی خصوصیتیں رہی ہیں۔ دوسری طرف یکرنگی اور یکجہتی سے بھی اس کا رشتہ بہت پرانا اور مسلسل ہے۔ اس کی زندگی تاریخ کے جن دوروں سے گذرتی رہی ہے ان سب میں نیا اور پرانا، دیسی اور بدیسی ایک دوسرے میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی روح نے ہمیشہ اختلاف میں اشتراک کی جستجو کی ہے اور جن دوروں میں اس نے اپنی اس یک رنگی اور یکجہتی کی کوششوں میں کامیابی حاصل کی ہے وہ اس کی سیاسی عظمت و شان کے دور ہیں۔

ہندوستان میں زبانوں کی تاریخ ہندوستان کی اس تہذیبی خصوصیت کی ایک نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔ زبانوں کے بکھرے بکھرے گنج سرمایہ میں سے کوئی ایک زبان ہر زمانہ میں سمت تہذیبی اشتراک کا نشان اور اس کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ اور ہر زمانہ میں یہ غالب زبان ہندوستان کے وسطی علاقہ کی بولیوں کی کوئی شکل تھی — خواہ اپنی ذاتی خوبی پر، خواہ اس لئے کہ عام بول چال کی زبان میں اس کا حصہ سب سے بڑا اور نمایاں تھا۔ ان میں سے سنسکرت مدھیہ دیس کی بولی کی ادبی شکل ہے۔ پالی اور جین اردھ مگدھی جو وسطی علاقہ کی سنسکرت کے بعد عظمت میں پروان چڑھیں اور برج جس میں سترھویں صدی میں بھگتی کی شاعری اور بھگتوں کے نغمے گونجے ملک کے وسطی حصوں کی بولی تھی اور ہندوستانی جس کے دل میں آزاد ہندوستان کی قومی زبان بننے کا ولولہ موجزن ہے۔ اسی علاقہ کی بول چال کی زبان ہے جو گنگا اور جمنا کی وادی میں پھیلا ہوا ہے اور جو ہندستان کا مرکز رہا ہے۔

ہندوستانی کی ابتدا کا سلسلہ ہندوستان کی سب سے قدیم زبان ویدک سے ملتا ہے۔ جب آرین ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ ایک ایسی بولی لائے جس کی آوازیں، گرامر کے قاعدے، اور لفظوں کا سرمایہ یورپ، ایشیائے کوچک اور ایران کی بہت سی موجودہ زبانوں سے ملتے جلتے تھے۔ ہندوستان کے مقامی باشندوں نے اس بولی میں تبدیلیاں کرکے اس کو ہند آریائی بنا لیا اور ہند آریائی زبان بولنے والے پانچ الگ الگ حصوں میں بٹ گئے۔ اتری، پچھمی، پوربی، دکھنی اور وسطی علاقہ کے رہنے والے۔

اتردیس کے باسیوں کی بولیوں نے سندھی، لہندا اور پنجابی کو جنم دیا۔ پچھمی بولیوں سے راجستھانی اور گجراتی پیدا ہوئیں۔ پورب کی بولیوں سے پوربی، بہاری، آسامی، بنگالی اور اڑیا، اور دکھنی سے مرہٹی۔ وسطی علاقہ کی بولی بھی دوسری بولیوں کی طرح بہت سی منزلوں سے گذری اور ہر منزل پر بہت سی بولیوں کو جنم دیتی رہی۔ اس کی ابتدائی بول چال (پراکرت) نے سورسینی پراکرت کی شکل اختیار کی اور آخر میں سورسینی اپ بھرنش یا ادستھانی۔ اور ادستھانی بول چال کی موجودہ زبان، یعنی مغربی ہندی (جس کی شاخیں بندیلی، قنوجی، برج، بانگڑو اور کھڑی بولی ہیں) کی اصل ہے۔

تین ہزار سال میں ویدک بدل بدلا کر کھڑی بولی بن گئی اور بارھویں صدی کے شروع میں ہمیں یہی بولی مغربی دوآبہ کی بولی کے روپ میں سنائی دیتی ہے۔ کھڑی بولی اصل میں ایک آریائی بولی تھی جس نے کچھ دیسی

ڈاکٹر تارا چند

بولیوں، دراوڑی ہندوستان کے عناصر کو اپنے میں گھلا ملا لیا۔ بارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے مسلمان حملہ آوروں کی زبانوں، عربی، فارسی اور ترکی نے اس پر اپنا سایہ ڈالنا شروع کردیا اور کھڑی بولی نے ان کا کچھ حصہ بھی اپنے اندر سمویا۔ اور اس طرح اس کا صوتی نظام، اس کی گرامر کے قواعد اور اس کے الفاظ پر نئے اثرات پڑنے لگے۔ اس میں نئی نئی تبدیلیاں ہوئیں اور اس طرح گویا بول چال کی ہندوستانی پیدا ہوئی۔

اس کے بعد سے ہندوستانی بولی اور موجودہ ہندوستانی زبانوں نے ادبی ارتقا کی شاہراہ پر چلنا شروع کیا۔ سولھویں صدی تک راجستھانی میں خاصا ادب پیدا ہو چکا تھا جس میں زیادہ تر بھاٹوں کے گیت شامل تھے۔ راجپوتوں کے کارناموں نے ان گیتوں کو اور بھی ترقی دی۔ اور آگے چل کر کرشن بھگتی کی تحریک نے جس کا مرکز برج منڈل تھا انھیں اور بھی بڑھایا۔ اس تحریک کے حامی ولبھ آچاریہ نے اپنے آٹھ مشہور چیلوں کو جو اشٹ چھاپ کے نام سے مشہور ہیں، علمی و شاعرانہ تخلیق کی طرف مائل کیا۔[1]

برج بھاشا کی مٹھاس نے لوگوں پر ایسا جادو کیا کہ راجپوتانہ سے بنگال تک یہ مذہبی شاعری کا وسیلہ اظہار بن گئی۔ سولھویں صدی میں ایک صوفی شاعر ملک محمد جائسی نے اودھی کو ایک ادبی حیثیت دی اور کوئی ایک صدی بعد ان کے سب سے بڑے پیرو تلسی داس نے اسی زبان میں رامچندر جی کی زندگی کو ایک غیر فانی شاہکار کی شکل دی لیکن تلسی داس کی پیروی کرنے والے بہت کم تھے اس لئے اودھی کا ستارہ رفتہ رفتہ غروب ہو گیا۔ برج البتہ ابھی کچھ دنوں پہلے تک پھلتی پھولتی رہی اور اس بت کے تھوڑے سے پجاری اب تک اس کی پرستش کر رہے ہیں۔

ہندوستانی کی زندگی کا انداز ان سب سے مختلف تھا۔ اسے بھاٹوں نے راجپوت سورماؤں کی بہادری کے راگ گانے یا ان کی محبت کی داستانوں کے نغمے سنانے کا وسیلہ نہیں بنایا۔ نہ کرشن اور رام کے بھگتوں نے اس سے اپنا کام لیا۔ اس کے برخلاف اسے دو بڑی قوموں، یعنی اس ملک کے نئے باشی، وسط ایشیا کے مسلمانوں اور مغربی دوآب کے قدیم ہندو باشندوں کے باہمی ربط و اتحاد کا ذریعہ بنایا گیا۔ اسی زبان کے وسیلے سے ان بڑی قوموں کے دل ملے اور ان کے ذہن ایک دوسرے سے قریب آئے۔ اس کے بعد صوفی درویشوں اور مبلغوں نے اسے اپنی تعلیم کے پھیلانے کا آلہ بنایا۔ اور ان کے ساتھ یہ زبان دہلی کے مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں، گجرات اور دکن میں پھیلی۔ ہندوستانی نے سب سے پہلے دکن میں، پندرھویں صدی کے آخر میں ادبی حیثیت سے پھلنا پھولنا شروع کیا۔ ہندوستانی کی یہ دکنی صورت اس وقت تک پھلتی پھولتی رہی جب تک اورنگ زیب نے بہمنی سلطنت کی ریاستوں کو ختم کر کے مغل سلطنت میں شامل نہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد دکنی تک (جس نے اپنا وطن چھوڑ کر مغل فاتحوں کے قدم بہ قدم دہلی کی طرف رخ کیا تھا) کوئی دو سو برس کا وقفہ ہے۔ اس مدت میں ادب نے دکن میں حیرت انگیز ترقی کی۔ نثر و نظم کے سیکڑوں لکھنے والوں نے اس کے خزانہ کو مالامال کیا اور ادبی تخلیق کی لہریں تارک الدنیا درویشوں سے لے کر تاج و جوہر والے ان سلطانوں تک کے دلوں میں اٹھیں جو عیش و عشرت کی آغوش میں سرشار بھی تھے۔ اور سیاست کے دلکش کھیل کی سنجیدہ چالوں کی فکروں میں بھی گھرے ہوئے تھے۔

دکن نے ہندوستانی کو جو ادبی ہیئت دی تھی دکنی سے شمال میں لائے۔ اپنی جنم بھومی میں اس کی واپسی ایک ایسے وقت میں ہوئی جب اس کے خیر مقدم کے لئے مادر وطن کی آغوش وا تھی۔ مغل شہنشاہ اب بھی اپنے عالی مرتبت بزرگوں کے تخت طاؤس پر متمکن تھا۔ لیکن اب سیاسی گہما گہمی اور اخلاقی آدرش کا مرکز نہیں رہا تھا۔ اس کا دربار حکومت سبک سازشوں اور عیاشیانہ مشغلوں کے لئے وقف تھا اور اس لئے اگر دربار میں ادبی تخلیقوں کے ساز کے نغمے آسانی سے گونج سکتے تھے۔ ان حالات میں ہندوستانی کی دوسری ادبی شکل اردو کو زوال و تغیر کی فضا میں قبول عام ملنا شروع ہوا اس رنگ روپ میں کچھ ایسی آب و تاب تھی کہ یہ بے حد دلکش نظر آتی تھی۔ فارسی کی ترکیبوں اور محاوروں سے معمور اور اس کی شاعرانہ خصوصیتوں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اس زبان میں ایک رعنائی اور رنگینی تھی۔ میر اور سودا، غالب اور ذوق، ناسخ، آتش، میر حسن اور نسیم اور میر نے اسے ادبی جواہر پارے دئے۔ اور ان کے علاوہ شاعروں اور ادیبوں کے ایک انبوہ کثیر نے اس کے بے بہا خزانوں کو اور بھی بیش بہا بنایا۔ اور ادب کی خدمت میں اس دور میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کو مات دیتے رہے۔

لیکن اس کے باوجود اردو کے چاروں طرف اجنبیت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں مغل سلطنت کے زوال نے ہر طرف انتشار پیدا کر دیا اور رجعت پسندی اور مذہبی احیا کی جس چنگاری کو سنئے آفاقل نے ہوا دی تھی اسے بھڑکنے کا موقع ملا اور اب ہندوستانی کی تیسری شکل، ہندی نے جنم لیا۔ ہرنل (HOERNLE) کے خیال کے مطابق اردو جسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ فارسی اور عربی کے لفظوں کو چھوڑ کر دیسی زبان (جو کم و بیش سنسکرت تھی) کے لفظوں کو اپنانے لگی۔ لیکن کوئی آدھی صدی تک یہ پودا کسی طرح بھی پروان نہ چڑھا مگر مذہبی احیا اور فرقہ پرستی نے قومیت کا لبادہ پہن کر، اور ہندو مسلم اختلاف کے بڑھتے ہوئے عمل اور رد عمل نے اس پودے کو بڑھا کر ایک تناور درخت بنا دیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ نظم اور نثر کی مقدار کے لحاظ سے ہندی ہندوستان کی ساری زبانوں پر بھاری ہے۔

اس طرح ہندوستانی کے دو طرز ایک دوسرے کے شانہ بشانہ

---

[1] ان آٹھ چیلوں میں سے ایک سور داس تھے۔ باقی سات کے نام یہ ہیں: کنبھن داس، کرشن داس، پرمانند داس، چھیت سوامی، گووند سوامی، چتر بھج داس اور نند داس۔

یکساں علاقہ میں پل بڑھ رہے ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے ازمنۂ وسطیٰ میں زبانوں کی تقسیم علاقوں کی بنیاد پر ہوتی تھی اور اب انہیں ہندو اور مسلمان فرقوں سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے اب جبکہ ہندوستان کی اصلی زبان ہندستانی سنسکرت، پالی، پراکرتی اور برج کے بعد ہندستان کی مشترک قومی زبان بنکر اپنے منصب کو پورا کرنا چاہتی ہے تو مختلف فرقوں کی باہمی تلخی نے زبانوں کے مسئلہ کو بھی تلخ بنا دیا ہے۔

اس ساری گفتگو کے بعد یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ہندی۔ اردو اور ہندستانی کی اصل ایک ہی ہے۔ اس لئے کہ یہ بات ہر ایک جانتا ہے کہ زبان کی اصل کا اندازہ اس کے صوتی اور ہیئتی نظام سے ہوتا ہے۔ اور ہندی، اردو، ہندستانی میں یہ دونوں چیزیں یکساں ہیں۔ ہندی اور اردو میں صرف لفظوں کے سرمایہ کا فرق ہے اور یہ فرق بنیادی طور پر لسانی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ اس فرق اور اختلاف کے پیچھے سیاسی اقتدار کا جذبہ اور جذباتیت کارفرما ہے۔ ہندی کے حامیوں کی نظر میں معقولیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا کلچر ہر بیرونی اثر اور میل سے پاک ہو۔ دوسری طرف فارسی آمیز اردو کی حمایت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی کلچر کی جو روایات اردو سے وابستہ ہیں وہ تہذیب کا ایک بے حد اہم عنصر ہیں۔ ایک گروہ کا تصور اسے دھندلے ماضی کی خیالی پاکیزگی کی طرف لے جاتا ہے اور یہ گروہ اسی ماضی کو اپنی ہر چیز کا سرچشمہ مانتا ہے۔ دوسرے گروہ کی نظریں بلندی و برتری کا جائز ایہام ہندوستان کی سرحدوں سے باہر تلاش کرتی ہیں۔

اور ان دونوں کے معاملہ کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ دونوں میں خود اعتمادی کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ دونوں شاید یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ ہندوستانی میں بجائے خود اتنی قوت ہے کہ اسے سہارے کے لئے نہ سنسکرت کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں پر رکھنے کی ضرورت ہے نہ صدر درجہ کی فارسی آمیز اردو کا۔ ہندستانی کی اپنی ایک الگ شخصیت ہے۔ اس کے صوتی اور ہیئتی نظام میں ہند آریائی اور عرب فارسی لفظوں کا امتزاج ہے۔ ہندوستان کے موجودہ کلچر کی خدمت کے لئے یہ بہترین آلہ ہے۔ ایک ایسے کلچر کی خدمت کے لئے جو مشترکہ بھی ہے اور ہر طرح کے لوگوں کا بھی۔ یہ کلچر ایک ایسا کلچر ہے جسکا سرچشمہ ماضی کے بہترین خیالات ہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے روحانی آدرشوں کا مجموعہ ہے، لیکن اسکے باوجود اس کی نظر سامنے کی طرف ہے اور وہ ہمیشہ نئی دنیا کی ہر مفید اور بامعنی شے کو اپنانے کے لئے تیار ہے۔

یہ وسیلہ، بڑا عجیب و غریب وسیلہ ہے تخلیقی ساخت، گرامر کی سادگی، آوازوں کے تنوع اور ہمہ گیری، زمان و مکان کے مختلف پہلوؤں کی بنیاد پر اظہار خیال کی بے پایاں قوت، مختلف، متضاد زبانوں کے عناصر کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت کے لحاظ سے ہندوستانی ساری کلاسیکی زبانوں سے کہیں آگے ہے۔ ہندستانی کا ادب سر دست بہت تھوڑا ہے لیکن اس سے اس کی بنیادی صلاحیتوں کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ اگر ہم ماضی کی اس انتہائی پرستش کو چھوڑ دیں، محض اہل علم کی مرصع زبان کی دیوانہ وار تحسین سے باز آ جائیں، اپنے آپ کو جانیں اور اپنے اور عام انسان کے رشتہ کو پہچانیں تو (Logan Pearsall) کے لفظوں میں یہ بولی ہمیں ایک پر زور اور حسین زبان معلوم ہونے لگے گی — مصوری اور طنز سے معمور، اور زندگی کے جوش اور مسرت سے بھرپور۔ یہ صفات بجائے خود بے بہا ہیں لیکن اس میں ہمیں ایک صفت اور بھی ملے گی — تخیل اور شاعری کا حسن — تصور آفریں باتیں جو موسیقی کی طرح روزانہ زندگی کی دھڑکنوں سے پیدا ہوتی ہیں اور جن میں اس سرزمین کے ذرہ ذرہ کی تابانی ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

اگر ہم ایک مرتبہ ان سارے رشتوں کو توڑنے پر آمادہ ہو جائیں جنہوں نے ہندی اور اردو کو علم والوں کے ایک محدود طبقہ کی ملکیت بنا کر ان پر فرقہ وارانہ تخصیص کی مہر لگا دی ہے تو ہم ہندستان کو ایک ایسی زبان دے سکیں گے جس میں قوت ہوگی، جس کی تاثیر حیرت انگیز رفتار سے بڑھے گی اور جو ہمارے قومی اتحاد اور عظمت کے خوابوں کو حقیقت سے بدل دے گی — اور یہ زبان ہندستانی ہوگی۔

خام اشیا

بقیہ صفحہ ۱۲۱

اگر یہ بات واضح نہ کر دی گئی کہ اس بظاہر سیدھے سادے مسئلہ میں ایک عالمگیر جنگ کے امکانات بھی مضمر ہیں اس خاکستر میں وہ چنگاری بھی پنہاں ہے جو دنیا کے امن کو جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ آگ پٹرول کی بدولت لگے۔ پٹرول کی ضرورت امن و جنگ دونوں زمانوں میں پڑتی ہے۔ امریکہ کے ماہرین کو اندیشہ ہے کہ امریکہ کا تیل کا ذخیرہ بہت جلد اس کی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت کم رہ جائیگا۔ روس کی ضرورتیں بڑھ رہی ہیں اور ظاہر ہے وہ اس بات پر رضامند نہ ہوگا کہ دنیا میں تیل کے سارے کنوئیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلے جائیں جو اس کے دوست بنے رہنے کو مجبوری کا سودا سمجھتے ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے اس جنگ کا میدان مشرق قریب کے اسلامی ممالک میں ہوگا جہاں قدرت نے اس دولت کا وافر حصہ یکجا کر دیا ہے۔ فی الحال اس دولت کا بڑا حصہ برطانیہ عظمیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکہ بھی اس علاقہ میں اپنے قدم جما رہا ہے۔ تیل کے حصول کے لئے یہ کشمکش پر امن طریقہ سے حل ہوگی۔ یا آگ و خون کی ہولی کھیل کر اس سوال کا جواب مستقبل دے گا۔

رشید احمد صدیقی

آل احمد سرور

رشید صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً نومبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ میں اسی سال گورکھپور سے ایم اے کرنے علیگڈھ پہنچا تھا اور علیگڈھ میگزین کا اڈیٹر مقرر کر دیا گیا تھا۔ رشید صاحب سے ملنے کو جی چاہتا تھا مضمون بھی حاصل کرنا تھا۔ ایک عرصے سے رشید صاحب نے میگزین کے لئے کچھ نہ لکھا تھا۔ ان کے مضمون فلسفۂ ازدواج کی اشاعت کے بعد سے کچھ ایسے جھگڑے پڑے تھے کہ رشید صاحب اور علیگڈھ میگزین ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ میری آرزو یہ بھی کہ یہ بچھڑے پھر مل جائیں۔ کچھ دیر ان کے مردانے مکان میں انتظار کرنا پڑا۔ رشید صاحب آئے تو ڈاکٹر خان بھی موجود تھے اور ٹینس کے کپتان بھی۔ رشید صاحب نے مجھ سے زیادہ التفات کپتان صاحب کی طرف کیا۔ باتیں بھی ادب سے زیادہ کھیل کے متعلق ہوئیں۔ رشید صاحب نے نہ کوئی آسمانی بات کی، نہ الہامی۔ لباس کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے بے پرواہ ہیں شکل و صورت کے اعتبار سے نہ راس مسعود مرحوم ہیں نہ خواجہ غلام السیدین۔ ان کے یہاں نہ جلال ہے نہ جمال۔ پہلی ملاقات میں بہت کم کھلتے ہیں۔ قانونی آدمی نہیں اپنی آواز کے سننے میں تو انھیں لطف نہیں آتا۔ وہ نہ رعب ڈالنا چاہتے ہیں، نہ رعب کھاتے ہیں۔ غرض پہلی ملاقات میں میرے اوپر کچھ مایوسی کا اثر ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو اس مایوسی کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم نہیں میں کیا چاہتا تھا اور کیا پایا۔ بہرحال یہ یاد پڑتا ہے کہ مایوسی بھی تھی اور حیرت بھی شوکت تھانوی نے شیش محل میں لکھا ہے کہ وہ صورت سے مزاح نگار نہیں مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے وہ کچھ بے نیاز اور بے پروا سے آدمی معلوم ہوئے۔ یہ یقین نہ آتا تھا کہ محل منزل، گھاگھر، چارپائی اور گواہ کے لکھنے والے یہی ہیں۔ اس لئے میری رائے رشید صاحب سے ملنے والوں کو یہ ہے کہ وہ پہلی ملاقات، یا دو ایک ملاقاتوں سے رشید صاحب کے متعلق رائے قائم نہ کریں بلکہ اس حجاب کو دور ہو جانے دیں جو ایسے موقعوں پر ان پر طاری رہتا ہے۔

دوسری دفعہ رشید صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو چند دن پہلے میں ایک آل انڈیا مباحثے میں تقریر کر چکا تھا۔ اطلاع کرائی تو انھوں نے اندر بلا لیا۔ میں نے جا کر دیکھا کہ زنانے صحن کے بیچ میں ایک چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف کیاریوں کی گوٹ ہے۔ رشید صاحب بالکل گھریلو قسم کے لباس میں کھرپی لئے گھاس چھیل رہے تھے بڑی محبت سے ایک پیڑھی میری طرف بڑھائی اور کہا بیٹھئے۔ میری تقریر کی بڑی تعریف کی۔ اور میگزین کے لئے مضمون کا فوراً وعدہ کر لیا ——— اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس وعدے کو وفا بھی کیا۔

اس کے بعد رشید صاحب سے بارہا ملاقات ہوئی ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر وقت دیکھا۔ دس سال تک قریب ان کے رفیق کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ انھوں نے کبھی مجھ پر اپنی پوزیشن کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے میرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر مجھے آزردگی یا خفگی کا موقع ملے۔ میرے پیچھے میرے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہی جس پر وہ شرمندہ ہوں میں ان کی عیاشی یعنی دوستوں کے ساتھ برج اور چاندنی چوک میں پھولوں کی خریداری میں بھی شریک ہوا۔ اور کئی دفعہ نئے گلابوں کی تلاش میں بھی ادھر ادھر چکر لگائے۔ ان سے ہزاروں بار ادب اور زندگی، ادب کے فتنوں اور زندگی کی قدروں پر بھی گفتگو کی۔ انھوں نے مختلف اوقات میں کسی بیوہ کی امداد کسی لڑکی کی شادی، کسی یتیم لڑکے کی تعلیم اور کسی ضرورت مند کی امداد کے لئے جو قومی ہتھکنڈے ان کو بھی دیکھا۔ میں نے ان سے ادبی مسائل میں بار ہا اختلاف کیا اور سختی سے اختلاف کیا، لیکن ان کے خلوص، ان کی شرافت، دوست و دشمن دونوں سے ان کی فراخ حوصلگی، ان کی انسانیت، ان کے سادہ خلوص کے سے خدمت کے جذبے اور ان کی شخصیت کی پاکیزگی اور ان کے ظرف کی بلندی کو کبھی نظر انداز نہ کر سکا۔

انھوں نے ادیبوں کے پرکھنے کے لئے وہی معیار بنا رکھے ہیں جو انسانوں کو جانچنے کے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ کوئی نامعقول آدمی معقول شاعر نہیں ہو سکتا اور اچھا ادیب بننا ہے تو پہلے اچھا انسان بننا چاہئے، وہ یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ معقولیت اور اچھائی بھی اضافی ہو سکتے ہیں اور ادب اور انسانیت کے لئے بعض اوقات اچھائی اور معقولیت جیسی شیریں اور خوش آئند صفات کے سوا جذبات کی تندی و تیزی نظر کی تیزی و رسائی اور والٹیر کے الفاظ میں شیطان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایک دور کی معقولیت دوسرے کی نامعقولیت بن جاتی ہے۔ ایک شیرینی اپنی عمر کو پہنچنے کے بعد تلخی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک صبح کا آفتاب تازہ دوسری شام کا ڈوبا ہوا تارا ہو جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے آنکھیں چار کر سکنے کے باوجود رشید صاحب کا نظریہ بنیادی طور پر غلط نہیں صرف نامکمل اور بعض اوقات سطحی ہو جاتا ہے پھر بھی اچھائی اور معقولیت کی یہ پرستش اور ہر حال میں یہ معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک اچھے انسان کی پہچان ہے۔

رشید صاحب کی عمر اب پچاس سے زیادہ ہی ہوگی وہ اس سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں مگر اپنے مشاغل انہماک اور دلچسپی میں انھیں مصروف دیکھئے تو جوانوں سے زیادہ چاق و چوبند نظر آتے ہیں انھیں کوئی جامہ زیب نہیں کہہ سکتا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اچھے لباس کی فکر عورتوں کو زیب دیتی ہے۔ ایک زمانے میں علیگڈھ کے ایک نوجوان معلم لباس کے معاملے میں ان کے مقلد ہی نہیں حریف نظر آئے۔ کئی دن تک دیکھتے رہے اس کے بعد ان صاحب کو بلا کر کہنے لگے کہ بھائی یہ وضع میری پریویج ہے چاہتا ہوں کہ میری اس خصوصیت میں کوئی اور شریک نہ ہونے پائے

خودفریبی میں مبتلا نہیں ہیں۔ اپنی کمزوری اور طاقت دونوں سے واقف ہیں اور دونوں پر ہنس بھی سکتے ہیں۔ وہ اصولوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ اصول کون پیش کر رہا ہے۔ وہ شخصیت کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور اس کے جادو کے اکثر مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان میں احساس کمتری سرے سے نہیں ہے اور اسی وجہ سے دوسروں کی عظمت اور برتری کے قایل بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑائی معرکے اور کشمکش سے گھبراتے ہیں اور جلد صلح کر لیتے ہیں۔ وہ رزم نہیں بزم کے آدمی ہیں۔ کچھ بے تکلف احباب ہوں اور علیگڑھ یا علیگڑھ والوں کی فضا۔ اس وقت انکا انداز گلفشانی گفتار دیکھنا چاہیئے۔ وہ الیکشن میں ووٹ اپنے دوست کو ہی دیتے ہیں چاہے دوسرا آدمی آسمان سے کیوں نہ اترا ہو۔ شرافت، خوش دلی اور رواداری ہی میں ان کے نزدیک انسانیت کی نجات ہے۔

رشید صاحب علیگڑھ کے عاشقوں میں سے ہیں۔ علیگڑھ سے عشق ایم اے او کالج کی پیداوار میں ایک نمایاں چیز ہے۔ ایم اے او کالج والوں کو "فراغت و کتابے و گوشۂ چمنے" سب کچھ میسر تھا۔ ان کے زمانے میں نہ جو ہر تھا نہ کمونزم اور جنگ عظیم بھی ان کے لئے کچھ زیادہ خوفناک نہ تھی۔ اسوقت مسلمان قوم کے سامنے علیگڑھ سے بڑا آئیڈیل اور کوئی نہ تھا۔ اب وہ وقت کے تقاضوں اور زمانے کی رفتار کیوجہ سے اس سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ علیگڑھ اب نئی نسل کے لئے منزل نہیں نشان راہ ہے۔ رشید صاحب کو بچپن سے کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ اب وہ صرف (Sportsman Spirit) کے قایل رہ گئے ہیں۔ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علیگڑھ انھیں کھیل کا شوق لایا۔ ہاکی لوز فٹ بال تو وہ جھک ہی سکے البتہ ٹینس میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔ رشید صاحب ٹینس کا زمانہ سلیم کے (Base Line) کے کھیل کا زمانہ تھا۔ اس میں آج کل امریکن صلابت نہ سہی فن کی نزاکت تھی۔ مگر گردے کی بیماری نے انہیں جوانی میں یہ سب شغل چھڑا دئے جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی تو لکھنؤ میں ڈاکٹر کھا ٹیہ نے آپریشن کیا اور ایک گردہ نکال دیا۔ اس تجربے کی یادگار ان کا ایک مضمون شیطان کی آنت ہے۔

رشید صاحب جونپور کے قریب ایک قصبے مریاہو کے رہنے والے ہیں۔ گھر پر عام رواج کے مطابق فارسی عربی کی تعلیم ہوئی پھر جونپور کے اسکول میں آ گئے اور بورڈنگ میں رہنے لگے۔ بورڈنگ لائف کا ٹھپہ بقول ان کے ان کی لائف پر آج تک نمایاں ہے۔ انھوں نے علیگڑھ میں ایک بڑا مکان بنوا لیا ہے مگر خود جس کمرے میں رہتے ہیں وہ کتب خانے، دفتر، بیڈروم اور گودام سب کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ پورب کے منشی پچھم والوں کے مقابلے میں دیہات اور وہاں کی بولیوں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ ان کی گھریلو بولی اور علمی زبان میں فرق ہے۔ دیہات جو ہندستان کی روح ہیں ان کے لئے زیادہ زندہ اور حقیقی ہوتے ہیں۔ رشید صاحب نے ان دونوں باتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہائی اسکول پاس کر کے انھوں نے کچہری میں نقل نویسی کی تھی۔ پٹواری اور گواہ بھی دیکھتیا میں یہ آب و تاب غالباً وہیں سے آئی ہے۔ عدالتوں کے نقشے، وکیلوں، تھانیداروں اور پھیرے

انگریز افسروں کے مرقعے جو ان کے مضامین میں جابجا بکھرے پڑے ہیں اسی زمانے کے تجربات کی یادگار ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں وہ علیگڑھ آئے۔ یہ زمانہ ایم او کالج کی آخری بہار کا تھا۔ علیگڑھ کے کھلنڈرے انگلستان تک کے کھلاڑیوں سے داد تحسین لے چکے تھے۔ علیگڑھ کے پڑھے لکھے نوجوان اپنی شائستگی اور تہذیب اور انگریزوں سے انہیں کیطرح بات چیت کرنے کے لئے مشہور ہو چکے تھے۔ اچھے اور ممتاز طالب علموں کے لئے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ موجود تھا۔ حکومت مہربان تھی اور قوم فدائی۔ جنگ طرابلس جنگ بلقان، مسجد کانپور، ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن، الہلال کے مضامین، شبلی اور اقبال کی نظموں کا اثر ہو چکا تھا۔ خانقاہوں میں حریت کے پجاری پیدا ہونے لگے تھے۔ رشید صاحب کے زمانے میں حریت پر وفاداری غالب تھی۔ محمد علی کی ادبیت کی داد دی جاتی تھی لیکن ان کی "دیوانگی" پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی فرزانگی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ رشید صاحب میں (Status Quo) کی حمایت شاید یہیں سے آئی۔ مگر وہ اس سرکار پرستی کے باوجود قومی جذبات سے نہ بچ سکے۔ رشید صاحب ذاکر صاحب سے بھی متاثر تھے اور مولانا سلیمان اشرف سے بھی۔ اقبال کی طرح رشید صاحب بھی شاعرانہ طور پر شخصیت کی دلاویزی اور دلکشی اس کے بانکپن اور رنگینی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ذاکر صاحب کے ساتھ زیادہ دور تک نہ جا سکے۔ مگر ذاکر صاحب کا یہ احترام، ان سے یہ محبت اور خلوص ظاہر کرتا ہے کہ ان کا دل کسطرف ہے پھر بھی یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ ان کے سلیمان اشرف پر مضمون میں جو عظمت و جلال ہے وہ ذاکر صاحب والے مضمون میں کیوں نہیں۔

رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین کی قدر ان کی طالب علمی ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ ان میں ایک ایسا انوکھا پن، تازگی، بانکپن اور ادبی حسن تھا کہ وہ اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن ان کے یہاں صاف ایک ارتقا ملتا ہے۔ جو لوگ ان کے ابتدائی مضامین پر وجد کرتے ہیں اور بعد کی چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے وہ شاید کچے پھلوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ وہ کئی سال تک میگزین کے اڈیٹر رہے اور ٹینس سکرٹری ہونے کے علاوہ یونین کے سکرٹری بھی۔ وہ ممتاز مقرروں میں سے نہیں تقریر کرتے ہوئے ہمیشہ گھبراتے ہیں۔ مگر جب کسی واقعے یا شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں تو حیرت انگیز تقریریں کرتے ہیں۔ دعوتوں یا تفریحی مجمعوں میں ان کی تقریریں بہت اچھی نہیں ہوتیں۔ وہ کبھی ہنسوڑ نہیں بن سکے لیکن اگر کوئی مر گیا ہو یا رخصت ہو رہا ہو یا واقعہ ایسا ہو جس سے وہ ذاتی طور پر متاثر ہوں تو وہ ایسی زوردار تقریر کرتے ہیں اور بغیر کسی تیاری کے۔ کہ اگر ان کے کسی دوست کے دل میں مر جانے یا کہیں چلے جانے کی خواہش کروٹیں لینے لگے تو بیجا نہ ہو۔

رشید صاحب ۱۹۲۱ء سے اردو پڑھانے پر مامور ہیں۔ جب کالج یونیورسٹی بنا تو اردو اور دینیات کو لازمی قرار دیا گیا۔ مگر ان مضامین کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ انھیں ایک (Necessary Evil) سمجھ کر گوارا کر لیا گیا۔ ایم اے کے درجے ۱۹۳۴ء میں شروع ہوئے اور شعبے کو ایک مستقل اور

خودمختار حیثیت بھی اسی زمانے میں مل سکی جب قوم سے کوئی اپیل کرنی ہوتی تھی تو علی گڑھ کے خداوند سب سے پہلے اس بات پر زور دیتے تھے کہ علیگڈھ مسلمانوں کا تہذیبی مرکز ہے اور یہاں اردو اور دینیات لازمی ہیں۔ مگر جب شعبے کو وسعت دینے اور اسے ایک اختیاری مضمون بنانے کا سوال آتا تو سرمائے کی کمی کا عذر فوراً لبوں پر آجاتا۔

علیگڈھ والوں نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے مگر جو کچھ ہوا ہے انفرادی طور پر ہوا ہے۔ یونیورسٹی نے اُردو کے اصلی اور حقیقی مصنف کو کبھی نہ پہچانا۔ اگر کبھی کبھار لازمی اردو میں کوئی فیل ہو جاتا تھا تو کتنے ہی ماہرین تعلیم کی جبین نازپر شکنیں پڑ جاتیں۔ غرض ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۴ء تک رشید صاحب کو کافی فرصت ملی اگر ان کی صحت اور صحبت دونوں خراب نہ ہوتیں پھر بھی تاریخ یورپ کا ترجمہ، رسالہ سہیل، اُردو زبان پر ایک سرسری نظر، مقدمہ باقیاتِ پیامِ اقبال طنزیات و مضحکات اور متفرق مزاحیہ مضامین اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ پھر اسی زمانے میں انھیں یونیورسٹی ڈے معزز مہمانوں کے لئے ایڈریس لکھنے ہوتے تھے۔ کوئی گرفتار کر لیتا تو اس کے ایکشن کے لئے ایک زوردار ہینی فسٹو تیار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی فریقِ ثانی کی طرف سے اس کا جواب بھی لکھنا پڑتا۔ اپنی یاد میں ان کا ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ "یہ کافر دماغ جو چاہے کر دکھائے"۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ اس زمانے میں رشید صاحب کی صحت اور صحبت دونوں اچھی نہ تھیں۔ اہلِ تنقید کو اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

۱۹۳۴ء سے اب تک ہندوستان میں کتنے زلزلے آئے اور کیسے کیسے انقلاب ہوئے۔ رشید صاحب زلزلے اور انقلاب دونوں سے دور رہے انھوں نے ایک جگہ اپنے آپ کو توبۃ النصوح، قسم کا انسان کہا ہے۔ وہ دور ہی سے انقلاب کا نظارہ کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ اپنے آپ کو اکثر اس جماعت میں پایا جو انقلاب کے خلاف تھی۔ مگر ان کی وضعداری، متانت اور شہرت کی پختگی کی اس سے اچھی دلیل کیا ہو گی کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے ایک انجمن رہے اور ان کی انجمن میں رند و پارسا، سب کا گذر رہا۔ پھر انقلاب سے دور رہنے کے باوجود ان کی تحریروں میں اس کے اثرات برابر ملتے رہے۔ انھوں نے انقلاب سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ مزاح نگار اپنا مواد زندگی کے نشیب و فراز ہی سے تو لیتا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں یہ نشیب و فراز اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔

رشید صاحب اردو اور فارسی ادب سے بہت گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ بعض مغربی ادیبوں سے وہ متاثر بھی ہوئے ہیں خصوصاً برنارڈ شا، آسکر وائلڈ اور چسٹرٹن سے۔ غالب ان کی تحریروں میں اکثر جلوہ گر ہوتے ہیں اور اردو کے انشا پردازوں میں کم ایسے ہوں گے جنھوں نے غالب سے اس قدر کام لیا ہو جیسا رشید صاحب نے لیا ہے۔ غالب کے اشعار، ترکیبیں، اصطلاحات غالب کے فقرے، ان کی زندگی کے واقعات، رشید صاحب کے یہاں بکثرت ملیں گے۔

غالب کے بعد اقبال اور اکبر سے رشید صاحب متاثر ہوئے ہیں۔ اکبر کی طرح وہ بھی مشرقیت کے دلدادہ ہیں۔ دونوں کا مشرقیت کا تصور جذباتی زیادہ ہے فکری کم۔ دونوں کی نظر مغرب کی بعض خصوصیات پر گہری پڑتی ہے مگر دونوں مغربیت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ اقبال کا اثر بھی اقبال کی مشرقیت کی وجہ سے ہے لیکن رشید صاحب کی مشرقیت میں ان کی خصوصیت نہیں۔ ان کے یہاں ایک مخصوص شوخی ہے جو ہے تو منفرد لیکن جو اقبال، غالب، سجاد انصاری اور فلک پیما کی شوخی سے ملتی جلتی ہے۔ مثلاً ان کے یہاں شیطان کا ایک خاص کردار ملتا ہے جو دراصل ایک رومانی کردار یا علامت بارز ہے۔ یہ سب زندگی موت، خدا اور انسان کو ایک نئے زاویے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ رشید صاحب کے یہاں کچھ کا کچھ، پاسبان اور کوہ طور اس رنگ کی اچھی مثالیں ہیں۔

ادب میں رشید صاحب کا نظریہ کیا ہے اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ وہ ادب کو زندگی سے اور زندگی کو معقولیت سے الگ نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک معقولیت پر اکثر علیگڈھ کی مہر ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رشید صاحب کے زمانے میں جس دکان پر سب سے زیادہ رونق تھی وہ یہی تھی۔ اقبال نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے "میں قدیم کو زندگی میں اتنا ہی ضروری عنصر سمجھتا ہوں جتنا جدید کو بلکہ میرا میلان قدیم کی طرف ہے"۔ یہ بات رشید صاحب پر بھی صادق آتی ہے۔ رشید صاحب نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت میں ہندوستان کی ادبی فضا جمال پرستوں کے ترانوں سے گونج رہی تھی۔ رشید صاحب کے یہاں جمال پرستی بھی ہے اور خواص پرستی بھی۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان کے یہاں یہ دونوں چیزیں ایک اعتدال کے ساتھ ہیں اور ان کی انسانیت یا معقولیت ان پر غالب رہتی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ ابتذال کے احتراز کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عوام کا خیال ضروری ہے لیکن ہر دفعہ کیا ضرور ہے کہ جو ہماری اصطلاحوں سے ناواقف ہو اسے ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے دیا جائے۔ رشید صاحب نے اپنے آپ کو کسی اسکول سے وابستہ نہیں کیا۔ حالی اسکول، شبلی اسکول، ادب لطیف، لکھنؤ اسکول، دہلی اسکول، لاہور، حیدرآباد نئے پرانے کسی گروہ میں وہ شریک نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہر رنگ کی خوبی کو دیکھ سکتے ہیں اور آزادی کے ساتھ اس پر تنقید کر سکتے ہیں۔ اُن کے یہاں آپ کو ذہنی حد بندی مل سکتی ہے گروہ بندی نہیں مل سکتی۔ رشید صاحب اپنی ادبی شخصیت اپنے منفرد اسلوب، اپنی وقیع سنجیدہ اور خیال انگیز ظرافت اور اپنی دلآویز مزاح نگاری کی وجہ سے اس دور کے ادب پر اپنا ایک لازوال نقش چھوڑ چکے ہیں وہ حالی اور شبلی دونوں کے قائل ہیں مگر ان کا اسلوب شبلی سے زیادہ قریب ہے۔ وہ غالباً کبھی آزاد ادا اور بے پروا مصوری کے کبھی دلدادہ نہ ہو سکے۔ انیس کی مینا کاری انھیں زیادہ دلکش نظر آئی۔ ان کا رچا ہوا پختہ اور مہذب شعور، ہمارے کلاسیکی سرمایے کے جائزے کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ نئے میلانات اور رجحانات کے پرکھنے میں بعض اوقات ان سے لغزش ہو جاتی ہے۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے

ہیں اور ان کی تنقیدوں میں قطعیت بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ نئے حسن کو دیکھنے اور حسن کے نئے رنگوں کو پرکھنے کے لئے جس صبر و استقلال جس خارجیت اور وسعت کی ضرورت ہے وہ بعض اوقات پیدا نہیں کر سکتے۔ مہدی افادی کی طرح وہ بھی دوسرے درجے کی چیز کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اوّل درجہ کا احساس دوسرے درجے ہی کی مدد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین زیادہ نہیں لکھے، مگر ان میں بھی وزن سنجیدگی اور گہرائی ملتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر ایک نظر میں ان کے یہاں ایک ذہنی کج روی پر زور دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ رشید صاحب کی قدامت سے دلچسپی، جمال پرستوں سے قرب فن کا احترام روایت کی قدر، زبان و بیان پر نظر، انھیں ڈاکٹر جانسن کی طرح کلاسیکی سرمائے کا ایک اچھا نقاد بناتی ہیں جس طرح ڈاکٹر جانسن کی ہمہ گیر شخصیت کا تنقید ایک چھوٹا سا پہلو ہے اسی طرح رشید صدیقی کا حال ہے۔ تنقید میں اگرچہ انھوں نے کبھی کبھار کسی اچھی چیز کی تعریف نہ کی لیکن آج تک میں نے ان کی کوئی ایسی تنقید نہ دیکھی جس میں کسی پست یا ناقص کارنامے کو انھوں نے سراہا ہو۔ یہ معیار بھی معمولی نہیں ہے اور اس معیار پر کم نقاد پورے اترے ہیں۔ صلابت اور لچک دونوں کا امتزاج کتنے نقادوں کے یہاں ملتا ہے۔

ان کی تازہ تصانیف "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ذاکر صاحب" کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت کو لوگ نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ گنج ہائے گراں مایہ بلاشبہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے لیکن بعض لوگوں نے جوش میں آکر اسے ان کی دوسری تمام کتابوں پر جو فوقیت دی ہے وہ صحیح نہیں۔ اختر انصاری اپنی ادبی ڈائری میں ان کے طرز کی اس "سطوت برگزیدگی اور دل نشینی کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں بالعموم نہیں پائی جاتی" اور اسی وجہ سے ان کے نزدیک "گنج ہائے گراں مایہ کا طرز ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے طرز سے بے حد ممتاز ہے"۔ گنجہائے گراں مایہ یقیناً ایک قابل فخر کارنامہ ہے لیکن ذاکر صاحب نہ رشید صاحب کا بہترین کارنامہ ہے نہ ذاکر صاحب کی بہترین تصویر۔ مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ رشید صاحب دراصل ایک مزاح نگار اور انشا پرداز ہیں۔ ان کی انشا پردازی ان کے مزاحیہ مضامین سے علیٰحدہ کر کے نہیں دیکھی جا سکتی اور ان کی مزاح نگاری بھی کبھی کبھار کی چیز نہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں انھیں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے۔

رشید صاحب نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو اکبر کا طوطی بول رہا تھا۔ اکبر گویا اپریل، اودھ پنچ اور تیغ اصفہانی دولوں کے بادشاہ تھے۔ ان کا مقصد محض زندگی کے نشیب و فراز سے لطف لینا نہیں تھا۔ اس نشیب و فراز کو ہموار کرنا بھی تھا۔ اکبر کی ظرافت ان کے تمدنی اور سماجی نقطۂ نظر کی آئینہ دار ہے۔ ان کی ظرافت میں جان طنز سے اور طنز میں عظمت ایک سنجیدہ مقصد سے آتی ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں اکبر کی تقلید ہوئی۔ ظریف علیخاں، سید محفوظ علی، سلطان حیدر جوش، ظریف، ریاض، غور سے دیکھئے تو اکبر کے پیرو ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ یہ سب جدید کے مقابلے میں قدیم کی طرف مائل ہیں اور ان کی ظرافت کا وار سب سے زیادہ نئی چیزوں پر ہوتا ہے۔ ظرافت دراصل رومان کی ضد ہے۔ شاعر اور رومان پرست، زحل میں عرش کی عظمت دیکھتا ہے۔ ظریف عرش کو فرش کی سطح پر لے آتا ہے۔ ایک کا مقصد پرواز ہے دوسرے کا ٹانگ پکڑ کر گرانا۔ مزاح ایک نارمل انسان کی وہ عینک ہے جس سے وہ ہر چیز میں بدصورتی اور ہر بلندی میں پستی دیکھ لیتا ہے۔ حقایق کو یوں زیر و زبر کر کے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو نشیب ثابت کر کے، مزاح نگار لطف زندگی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ ذہنی صحت مندی کو زندگی میں اس کی اصلی جگہ دلواتا ہے اسی لئے اچھی اور وسیع ظرافت ایک بڑی دولت ہے۔ انسان جب اپنی بعض کمزوریوں پر ہنس لیتا ہے تو وہ ان کی اصلاح بھی کر لیتا ہے۔ طنز کا نشتر علاج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے طنز و ظرافت شروع سے محض تفریح ادب نہیں رہے، اس سے بہت زیادہ رہے۔ اکبر سے لے کر رشید صدیقی تک ہمیں اچھے اچھے مزاح نگار ملتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو ان میں یکسانیت بہت زیادہ ہے۔ وہی نئی نسل کا نوجوان، وہی شوخ اور تعلیم یافتہ اور آزاد لڑکی۔ وہی مشرقیت کا قصیدہ وہی مغربیت کی ہجو، ان میں اکبر کے سوا ہر شخص طنز نگار پہلے ہے مزاح نگار بعد میں۔ اکبر کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ باوجود ایک گہرے طنزیاتی مقصد کے ادھر ادھر کی باتوں پر بھی ہنس لیتے ہیں۔ اکبر کے بعد اس خصوصیت میں ان کے شریک رشید صدیقی ہیں۔

رشید صاحب کے نام کے ساتھ ہمارے ذہن میں فوراً پطرس، فرحت اللہ اور فلک پیما آتے ہیں۔ دوسرے مزاح نگار اس درجے میں نہیں آسکتے پطرس کے بعض مضامین اپنی لطیف، ہلکی پھلکی، بے ساختہ اور بہترین ظرافت کی وجہ سے یادگار رہیں گے۔ انھوں نے خالص ظرافت کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ مغرب کا اثر ان کے یہاں ایک ایسے عالمگیر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے کہ ذرا بھی گراں نہیں گزرتا اور نہ ترجمہ یا نقالی معلوم ہوتا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ پطرس کی یہ طالب علمی کی مشق جسے بعد میں خود پطرس نے بھلا دیا بہت زیادہ تعریف کے قابل نہیں ہے ورنہ اردو ادب کے معیار کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کی جاسکے گی۔ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی ایک وصیت کی تعمیل اور شروع کے بعض مضامین میں ایک نرم و نازک فنی شعور اور ایک شگفتہ، شاداب اور تبسم طرز سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی نگاری کی وجہ سے ان کے نقش اور بھی نازک اور ان کی مینا کاری اور بھی بھلی معلوم ہوئی۔ مگر فرحت اللہ بیگ میں ذہنی عنصر کی کمی ان کو اچھا مزاح نگار بننے دیتی ہے بڑا مزاح نگار نہیں بننے دیتی۔ صرف فلک پیما ایسے ہیں جو اردو کے بڑے مزاح نگاروں میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ فلک پیما کے یہاں ذہنی عظمت شوخی، حاضر جوابی اور ہمہ گیری اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان کے مضامین نشاط کا ایک خزانہ بن گئے ہیں۔ خیال، انگیز ظرافت یا تو ان کے یہاں ملتی ہے یا رشید صدیقی

کے یہاں۔ دونوں میں ذہنی عنصر مشترک ہے اور یہی خیال انگیزی کا باعث ہے۔

ہمارے نقادوں نے ابھی تک رشید صدیقی کی مزاح نگاری کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ غلط نہیں۔ انکے مضامین اقلیدس کی شکلوں کی طرح کسی مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے نہیں ہوتے، یہ دراصل مضامین ہیں۔ ان میں آزادی کے ساتھ خالص شخصی اور انفرادی نقطۂ نظر سے کسی مسئلے پر اظہار خیال ہوتا ہے۔ ان کا بہکنا ہی ان کا آرٹ ہے۔ ان کے منتشا ہے، ان کا موضوع سے ادھر ادھر ہونا، ان کا بیچ میں لمبی لمبی فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دینا، یا دیہاتیوں کے قصے سنانا، ایک خاص مقصد کے ماتحت ہوتا ہے۔ مقامی رنگ کی وجہ سے ان کی مقبولیت یقیناً محدود ہو جاتی ہے مگر ان کی تصویریں کتنی صاف اور روش کتنی اجلی اور کتنی دلفریب ہوتی ہیں۔ علیگڈھ کو مقبول بنانے میں، اس کی اچھی، دلچسپ اور معقول باتوں کو عام کرنے میں رشید صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علیگڈھ نے انھیں جو کچھ دیا تھا اس سے بہت زیادہ انھوں نے علیگڈھ کے گرد اپنے سارے مضامین لکھ کر علیگڈھ کو دیا ہے۔ یہ علیگڈھ کا بہترین پروپگنڈا ہے۔ رشید صاحب کے مضامین میں اپنی قابلیت یا بیوی کے حسن و ذہانت کا پروپگنڈا نہیں ملے گا۔ خود تو وہ اکثر "قدوسیت" پر قانع ہیں لیکن زندگی اور ادب کے بعض مسائل پر اظہار خیال کے لئے انھیں مرشد، حاجی بغلول، قاضی جلال الدین کے قصے سننے پڑتے ہیں۔ رشید صاحب زندگی کے عام واقعات کو ایک خاص ادبی رنگ میں اور اکثر ادبی اور علمی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے مضامین سے پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے یقیناً ایک اچھا ادبی ذوق اور اچھے ادبی سرمائے سے اچھی خاصی واقفیت ضروری ہے۔ ان کا آرٹ بلیغ فقروں، دلچسپ اشاروں، شوخ رنگوں اور گہری باتوں کا آرٹ ہے۔ قول محال (Paradox) سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے۔ آسکر وائلڈ اور چسٹرٹن سے یوں بھی وہ کافی متاثر ہیں مگر ان کی ادبیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ میں نے ایک دفعہ ظرافت سے زیادہ ان کے یہاں طنز پر زور دیا تھا۔ لیکن اب اس رائے میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ رشید صاحب کی ظرافت میں جان طنز سے آتی ہے مگر وہ ایک مزاح نگار پہلے ہیں، طنز نگار بعد میں۔ رشید صاحب کی ظرافت کا کوئی مقصد نہیں۔ اگر ہے تو خوشدلی، بہادری اور شرافت کا پرچار۔ انھوں نے اگرچہ بعض نئے رجحانات یا نئے میلانات پر بار بار طنز کی ہے مگر یہ طنز جذباتی ہے، اس میں گہرائی نہیں ہے۔ ان کے ایسے مضامین میں مولانا عبدالماجد کے اثر سے خطابت زیادہ آگئی ہے۔ ان کے بہترین مضامین مضامین رشید میں ملتے ہیں خنداں میں نہیں۔ اگرچہ خنداں کے بعض مضمون مثلاً اڈیٹر، لیڈر، بابو، بیرا، بیرا وغیرہ ان کے کارنامے ہیں اور کانفرنسوں، عدالتوں اور کونسلوں پر بھی انھوں نے بڑی اچھی طنز لکھی ہے۔ میرے خیال میں ان کا بہترین مضمون وہ ہے جو انہی یادمیں علیگڈھ میگزین میں چھپا۔ اس میں مصرع طرح ریڈیو ہی کا ہے مگر نظم آزاد ہے۔

مضامین رشید میں مقامی رنگ زیادہ ہے اور خنداں میں کم۔ خنداں کے عنوانات میں بڑا تنوع ہے اور اس سے رشید صاحب کے ذہن کی وسعت اور فن کی قدرت دونوں کا اظہار ہوتا ہے، مگر پھر بھی میرا خیال ہے کہ ریڈیو نے رشید صاحب کو فائدہ کم پہنچایا، نقصان زیادہ۔ ظرافت کا آرٹ، آزاد ہے، یہ اپنے جوش میں زیادہ پابندیاں قبول نہیں کرتا، خصوصاً وہ پابندیاں جن کا ریڈیو پر اسقدر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سیاست وہاں شجر ممنوعہ ہے۔ مذہب پر ذرا بھی کھلی ہوئی چوٹ ہوئی اور دل آزاری ہوگئی۔ عورت کے ساتھ ذرا سا کھل کھیلنا حرام ہے۔ اتفاق سے یہی وہ عنوان ہیں جن میں مزاح نگار (بلکہ ہر شاعر اور ادیب) زندگی کی مصیبتوں کو بندھے ٹکے عنوانوں سے دیکھنے کے بجائے نئے پہلوؤں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ رشید صاحب کے ان مضامین میں جو ریڈیو پر نشر ہوئے مقامی رنگ بہت کم ہے اور یہ بھی بات ہے مگر ان کا وہ آرٹ جو پہلے ہی اشاروں کا آرٹ تھا اور کنایاتی ہو گیا۔ حکومت جب کسی تحریک کو دبانا چاہتی ہے تو وہ انڈرگراؤنڈ (Under-ground) چلی جاتی ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ ادیب اپنے تاثرات تو بیان کرتا ہی ہے صاف صاف نہیں کہہ سکتا تو پردے پردے میں کہتا ہے، مگر اسلوب کے لئے یہ حجابات اچھے نہیں ہوتے۔ پھر ریڈیو کا کوئی تسلی بخش معیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نشر یروں سے لے کر مشاعروں اور ڈراموں تک ریڈیو نے ادبی معیار کو بلند نہیں کیا پست کیا ہے اور ادیبوں کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا ہے۔ فرمائشی ادب بڑا ادب ذرا کم ہی ہوتا ہے۔

مگر رشید صدیقی کی مزاح نگاری صرف مضامین رشید اور خنداں ہی میں نہیں، ان کی تمام تصانیف میں جھلکتی ہے۔ طنزیات و مضحکات میں طنز و ظرافت پر تنقید ہے "کتاب فرمائش پر لکھی گئی اور فہمائش پر ختم ہوئی" مگر اس میں بھی مختلف لکھنے والوں پر تبصرے ایک مخصوص انداز میں ہیں۔ سید محفوظ علی نے کبھی اپنے نام سے مضمون نہیں لکھے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ انداز قد سے پہلے گئے۔ "گنجہائے گرانمایہ" اور ذاکر صاحب تو بڑے مرقعے ہیں لیکن شیخ نیازی جو بچوں کے لئے لکھی گئی اور انھیں نے ایک بچے کی تصویر ہے ظرافت سے خالی نہیں، مگر اس لحاظ سے ان کے خطوط بہت اہم ہیں وہ اگرچہ ابھی منظر عام پر نہیں آئے لیکن جن میں بے ساختہ بے تکلف اور بے محابا ظرافت کے بڑے اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے کہ خط لکھوا کر انھوں نے بڑے بڑے کام نکالے ہیں۔ ابھی حال میں علیگڈھ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "علیگڈھ بھی عجب جگہ ہے۔ یہاں اونٹ کروٹ نہیں لیتا، کروٹ اونٹ کا انتخاب کرتی ہے"۔ اس بلیغ جملے میں ایک پوری داستان پوشیدہ ہے۔

رشید صدیقی موجودہ دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ لیکن ان اٹھان ایسی تھی کہ وہ بہت آگے جا سکتے تھے مگر پطرس کے یہاں سب کچھ ادب اور فن سے عشق، اس کا احترام اور اس کی خاطر ریاضت نہیں ہے۔ ادب اس کی تفریح ہے اور بس۔ ذلک پیا بہت اچھے لکھنے والے ہیں

اور ذہنی چمک دمک کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں، مگر وہ حاضر جوابی، تیزی اور طراری پر قائم ہو جاتے ہیں، نوجوانوں میں کرشن چندر اور کنہیا لال کپور ہی اس برادری میں آ سکتے ہیں۔ خصوصاً کپور طنز کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور ان کا مضمون غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں، بیر ودی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ مگر ان میں جو صوبائی عصبیت ہے وہ ان کے لئے خطرہ ہے۔ اچھا لکھنے والا یوں اپنے آپ کو خانوں میں نہیں بانٹتا۔ ظرافت کرشن چندر کا کبھی کبھار کا مشغلہ ہے اور ادبی شہرتیں کبھی کبھار کے مشغلوں پر شاذ و نادر ہی عطا کی جاتی ہیں۔

ظرافت کے بعد رشید صدیقی کی مرقع نگاری کی اہمیت ہے۔ مرقعے یا خاکے ہمیں اس سے پہلے بھی ملتے ہیں۔ عبدالحق کے چند ہم عصر اور چراغ حسن حسرت کی مردم دیدہ دونوں کتابیں رشید صاحب کی گنج ہائے گراں مایہ سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ ہمارے ادب میں شخصیت کا احساس بیسویں صدی کے شروع ہی سے ملنے لگتا ہے اور تنقیدوں میں ہم سچی شخصیت کی جھلک کبھی ملتی ہے۔ خود آزاد نے آب حیات میں دراصل اردو شاعری کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ شاعروں کا ایک نگارخانہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے جادو نگار قلم سے تصویروں میں جان ڈال دی ہے اور پرانے شاعروں کو زندہ کر دکھایا ہے۔ وہ فضا کے بادشاہ ہیں اگرچہ ان کی تصویریں صحیح نہیں ہیں اور وہ ہر تصویر کے حسن و قبح پر رائے دینے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ آزاد فضا میں آزاد مصوری ان کے بس کی نہیں تھی۔

مولوی عبدالحق کے چند ہم عصر میں جو مضامین ہیں ان میں یکسانیت نہیں ہے۔ کچھ تنقیدوں کے حصے ہیں کچھ خط کچھ تعزیتی مضامین ہیں پھر بھی ان میں مرقع نگاری کا ایک بلند معیار ہے۔ عبدالحق ایک غائر نظر رکھتے ہیں اور زندگی کی بعض بڑی قدروں پر ایمان۔ انھوں نے حالی، راس مسعود، نورجہاں، امہ گرامی کی بڑی اچھی تصویریں پیش کی ہیں۔ انھوں نے محمد علی کی شخصیت سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے گلیڈسٹن سے تشبیہ محمد علی کے لئے موزوں ہے دونوں میں عظمت ہے اور دونوں میں خطرہ بھی ہے۔ رشید صدیقی کا جو چھوٹا سا مضمون محمد علی پر ہے اس کا مقابلہ اس مضمون سے کیجئے تو دونوں کی کردار نگاری، سیرت نگاری اور مرقع نگاری کی خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔

رشید صاحب کے مضمون سے محمد علی کی عظمت کا نقش ذہن پر بیٹھ جاتا ہے مگر محمد علی واضح طور پر سامنے نہیں آتے۔ یہ محمد علی کی شخصیت کا مرقع نہیں شخصیت کے جادو کا اعتراف ہے۔ لیکن گنج ہائے گراں مایہ میں جو دوسری تصویریں ہیں وہ اتنی روشن واضح، پر اثر اور دلکش ہیں کہ ان سے ہمارے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے متعلق چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔

یہ مضامین بعض بزرگوں اور دوستوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ موت نے ان کی یاد کو عزیز بھی بنا دیا ہے اور گراں قدر بھی۔ رشید صاحب یوں بھی خاصے شخصیت پرست ہیں شخصیت کے جادو سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ شخصیتیں ایسی ہیں جو اپنے اپنے حلقے میں آفتاب و ماہتاب تھیں اور جن سے رشید صاحب خاصے قریب رہے ہیں۔ مثلاً مولانا سلیمان اشرف کو لیجئے جنہوں نے علیگڑھ میں فقیروں میں شاہی کی۔ مولانا دینیات کے شعبے کے صدر تھے۔ بظاہر ان کو ایک حد تک خشک ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ بڑے زندہ دل باغ و بہار، وضعدار، نفاست پسند، خوش پوش، خوش فکر اور آن بان کے آدمی تھے۔ ان کی بعض خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہو گئے تھے۔ وہ سوائے بعض مخصوص نیازمندوں کے کسی سے ملتے نہیں جاتے تھے۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ یونیورسٹی کے ملازم ہوتے ہوئے بھی کسی افسر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے حلقے میں سب ان کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے۔ ان کی بات چیت میں بڑا طنطنہ، ان کی آواز میں بڑا رعب داب اور ان کے طرز معاشرت میں بڑا استغنا تھا۔ رشید صاحب نے اپنے مضمون میں ان کی وضعداری، ذوق، علمیت، طلاقت لسانی اور شاہانہ مزاج پر زور دیا ہے۔ ان کے مقابلے میں مولانا ابوبکر کی شخصیت ہے۔ یہ علیگڑھ میں ناظم دینیات تھے، دوسرے امور مذہبی کے علاوہ نماز پڑھانا بھی ان کا کام تھا۔ مولانا ابوبکر کے خلوص، محبت، جوش خدمت، ان کے ادبی ذوق، ان کی مہمان نوازی کا رشید صاحب نے ایسے لہجے میں ذکر کیا ہے کہ انسان کا دل پگھل جائے۔ رشید صاحب ان دونوں بظاہر متضاد شخصیتوں سے یکساں متاثر ہیں۔ لیکن وہ مولانا سلیمان اشرف سے زیادہ مرعوب ہیں حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو مولانا سلیمان اشرف کے یہاں علم کا جلال ہے یا اقبال کے الفاظ میں فقر کے انداز ملوکانہ میں ان کے کردار میں ہیبت ہے۔ ان میں اپنے علم، اپنے ذوق، اپنی بلندی کا غرور ہے۔ مولانا ابوبکر میں اپنے علم، اپنے خلوص، اپنی خدمت پر اعتماد ہے۔ ان میں خدمت کا ولولہ ہے۔ اسلامی شان مولانا ابوبکر میں زیادہ ہے سلیمان اشرف کا کردار چینی کے ایک نادر برتن کا سا ہے جس کی ندرت سب کچھ ہے۔ مولانا ابوبکر کے کردار میں افادیت اور خدمت حسن ہے اور حسن افادیت ——— اصغر کی شخصیت حسن خیال اور حسن عمل کی جنت ہے۔ ایوب ان انسانوں میں سے ہیں جو مشہور نہیں مگر جو ہر شخص کے کام آتے ہیں، جن کے پاس دنیا کی دولت زیادہ نہیں مگر جن کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ جو اپنی محبت کی دولت بے دریغ لٹاتے ہیں۔ ان کی یاد ثواب ہے اور ان کی تصویر پیش کر کے رشید صاحب نے ان کا قرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا احسن شعر تو اچھے نہیں کہتے تھے مگر انسان بڑے کھرے ہوئے اور سلجھے ہوئے تھے انھیں ادب اور فن سے عشق تھا۔ انھوں نے فن کو حسن بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔

یہ ہیں وہ خاص خاص شخصیتیں جن سے رشید صاحب متاثر ہوئے ہیں اور غور سے دیکھئے تو رشید صاحب دوسروں میں انھیں چیزوں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں، جو خود ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں چھپی ہیں گنجہائے گرانمایہ

اردو کے قلمی مرقعوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مگر اس میں شخصیت پر عقیدت کا غلاف چڑھا ہوا ہے شخصیت کی بے لاگ تنقید نہیں ہے اردو میں ایسے جیتے جاگتے مرقعے کم ہی نہیں لکھے گئے۔ ان کے مقابلے میں چراغ حسن حسرت، محمد سرور، شوکت تھانوی اور دوسرے معاصرین کی کوششیں کم درجے کی رہ جاتی ہیں۔

رشید صاحب کی مرقع نگاری کا تذکرہ ذاکر صاحب کے بغیر نامکمل رہ جائے گا۔ ذاکر صاحب رشید صاحب ہی کے مرشد نہیں ہندوستان کی علمی تعلیمی تہذیبی اور ادبی فضا کے ایک درخشاں ستارے بھی ہیں۔ اپنی ذہنی عظمت اور اپنے کردار کی استواری اپنے خلوص اور اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ جدید ہندوستان میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں یہاں صرف شخصیت کا جادو ہی نہیں کردار کی عظمت بھی جلوہ گر ہے۔ رشید صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اگر ذاکر صاحب کا کوئی معمولی دوست یہ فرمائش کر دیتا کہ میرے لئے ایک مرغی لیتے آیئے گا تو دیکھئے مرغی بغل میں دابے ہوئے قصر کملم سے گزرتے اکابر پارلیمنٹ اور گولیاں شوخ و شنگ سے بے جھجک ملتے ہوئے ریل یا ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر پہنچ جاتے"۔ ان کا یہ فیصلہ بھی صحیح ہے کہ "برائی ایم ایم کی اجارہ داری میں اتنی نہیں ہے جتنی مرغی سے شرمندہ نہ ہونے میں ہے"

لیکن ذاکر صاحب کی عظمت کا راز محض دوست کا دل رکھنے میں نہیں قوم کی آبرو رکھنے میں ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ دونوں فرائض سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے میں لیکن دوست کا دل رکھنے سے قوم کی آبرو رکھنا زیادہ ضروری ہے رشید صاحب نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کی عظمت محض انکی ذہانت خلوص تفریحِ تحریر کے کمال، علم و عمل کی صلاحیت زندگی اور زندہ دلی میں نہیں ان کی ایک نصب العین کی تلاش اور اس تلاش کے لئے وقف ہو جانے میں ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی ایک خیال کو عمل ایک تصور کو تحریک ایک عقیدہ کو فلسفہ زندگی ایک خواب کو حقیقت بنانے سے عبارت ہے۔ انکی شخصیت میں جو رنگینی ہے وہ ان کے خون جگر سے آئی ہے۔ ان کے نفس کی گرمی اور ان کے خیابوں کی لالہ کاری ہے عبارت ہے رشید صاحب نے اس چیز کیطرف بھی اشارہ کیا ہے مگر رشید صاحب بنیادی تعلیمی اسکیم کی تشکیل کو سوت کہاں لڑکوں کی عمر کلی ... کی بحث سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ایک ایسے قومی نظام کی پہلی تشکیل جس کے انقلابی امکانات اب جا کر تسلیم کئے جا رہے ہیں اور جس نے ذاکر صاحب کی شہرت کو عالمگیر بنا دیا ہے کتاب میں خدائی خواروں اور خون بخشوائے ہوئے بوگو کے مجمع سے یاد کی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی میں تفریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر ذاکر صاحب کے بیان میں اس تاریخی موقع کی تصویر جو نیوٹن کے کشش زمین کے نظریئے اور آئن سٹائن کے اضافیت کے تصور کی یاد دلاتی ہے اور زیادہ واضح اور نمایاں اور ڈرامائی ہونی چاہئے تھی لیکن کتاب کا اسلوب ایسا پختہ رواں اور نکھرا ہوا ہے کہ اسلوب کی دنیا میں اسکی بڑی اہمیت ہو سکتی ہے۔ رشید صاحب کے اسلوب میں جذباتیت بھی ہے اور خطابت بھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص سوز و گداز ہے جس کی وجہ سے یہ سستی جذباتیت اور صحافتی خطابت سے بلند ہو جاتا ہے مزاح نگاری کی وجہ سے اس اسلوب کی گرمی ... عظمت اور رفعت پر لطف آ جاتی تھی، اس کی ادبیت نے اسے اور گوارا بنا دیا ہے اور بعض ... ادبیت اور سوز و ... تشبیہات کی وجہ سے اس میں اور بھی جان پڑ جاتی ہے ان کے اسلوب کی

عظمت و رفعت اور اسکی دل نشینی و دل آسانی غضا میں رشید بحر و گنجلک گرانبار ذاکر صاحب میں نمایاں ہے۔ ان کا طرز کلام کی بات کا نہیں مرتبے کی بات کا ہے۔ انکی نثر میں کہیں کہیں فارسیت بہت زیادہ ہے وہ بھی ذاکر صاحب کی طرح قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں"۔ اس لئے کہیں کہیں انکی تحریر میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور الفاظ کے طلسم میں معنی کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص شعریت ہے اس میں خشکی کا کہیں پتہ نہیں ہے اس میں کہیں کہیں ایک ایسا درد و کرب چھپا ہوا ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس اسلوب میں حکیمانہ نکتہ سنجی بھی ہے اور شاعرانہ لطف و انبساط بھی۔ اس کی بلاغت اور تاثیر میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

رشید صاحب کی تنقیدوں کے متعلق میں پہلے ہی رائے ظاہر کر چکا ہوں۔

رشید صاحب لفظوں، ادبی اداروں اور تحریکوں کے بہت اچھے نباض ہیں۔ وہ طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جزئیات پر زیادہ توجہ نہیں کرتے وہ جزئیات سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ انیسویں صدی کے ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ علیگڑھ کی چھوٹی دنیا میں رہنے کی وجہ سے بعض اوقات ان نت نئے انکشافات اور انقلابات کو نہیں سمجھ پاتے جو آج کل ہو رہے ہیں اور جن کی وجہ سے موجودہ دور کے انسان کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے اس آتش نمرود کا نظارہ رشید صاحب نے ذرا دور سے کیا ہے۔ حالانکہ جو لوگ اس میں کود پڑتے ہیں ان کے لئے یہ آگ گلزار بن جاتی ہے۔ رشید صاحب کا ادبی مزاج دراصل اس دور میں بن چکا تھا جس کے درخشاں ستارے سجاد حیدر، سجاد انصاری اور رنگ دیا تھے اقبال تھے۔ چونکہ وہ زندگی میں بعض اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتے تھے اور ظرافت خوشدلی اور بیداری کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں اس لئے وہ کسی دور میں افسردہ نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس تلخی احساس یعنی حزن و یاس شعور و لاشعور کی اس کشمکش بڑی کامرانیوں اور بڑی محرومیوں ہیجان اور بحران کو اپنے اندر جذب نہیں کر پاتے جو انہیں ہر دور کا نمائندہ بناتے۔ رشید صاحب پر اقبال کا اثر اچھا نہیں ہوا۔ ان کی عقیدت اور گہری ہو گئی۔ ماضی کی دنیا انکے لئے اور زیادہ اہم ہو گئی۔ علیگڑھ کی پرستش کیساتھ ساتھ وہ انسانیت کی پرستش بھی کرتے رہے اور انھیں یہ دونوں چیزیں ایک نظر آئیں۔ حالانکہ یہاں انھوں نے ایک چھوٹی عبادت کی خاطر بڑی عبادت سے غفلت برتی مگر اپنی نسل میں جو زیادہ تر خواص پرست، سرکار پرست اور جمال پرست ہے جو محبت ہم سے کرتی ہے اور کام دشمنوں کے آتی ہے وہ اپنی انسانی دوستی ... عوام سے محبت و واقفیت، ظرافت اور خدمت کی وجہ سے سب سے زیادہ ممتاز ہیں اور اس وجہ سے سب سے زیادہ بلند انکی پاکیزہ شخصیت جو دوسروں کے اندر اچھائی اور برائی کو ابھارتی ہے۔ ان کی خیال انگیز اور کیف آور ظرافت جو لطیف بھی ہے اور ترش بھی۔ ان کا پختہ رچا ہوا اور برگزیدہ اسلوب جس میں حسن بھی ہے اور عظمت بھی ان کی وہ معصوم طبیعت جو دوسروں کی چھوٹی باتوں کو بھی بڑا بنا دیتی ہے اور اپنی برائیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، غرض زندگی، انسانیت، شباب اور اخلاقی صفات پر ان کا یہ زبردست اعتقاد ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

ایجنٹا کے فرسکو

محمد مجیب

قدیم ہندوستان میں عمارتوں کو اندر اور باہر ہر طرف رنگنے کا دستور تھا، اور مورتوں اور سنگ تراشی پر بھی کوئی رنگ ضرور پھیرا جاتا تھا۔ پلاسٹر اور سنگین سطح پر تصویریں بنانا ایک مستقل فن تھا، اور اس کی اپنی اصطلاحیں تھیں۔ مگر اب اس فن کے قدردان اور اسے برتنے والے بہت کم ہیں اور ان کی اصطلاحیں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی ہیں۔ آجکل گیلے پلاسٹر پر پانی میں گھلنے والے رنگوں سے جو تصویریں بنائی جاتی ہیں انھیں فرسکو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور طریقہ ہے جسے ٹیمپرا کہتے ہیں۔ اس میں پلاسٹر پر خشک ہونے کے بعد تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ غالباً ہندوستان میں یہ دونوں طریقے رائج تھے، لیکن قدیم ہندوستان کی اتنی عمارتیں ضائع ہوگئیں ہیں اور جو موجود ہیں ان پر موسم کی تبدیلیوں کا اتنا اثر پڑا ہے کہ ہم فرسکو اور ٹیمپرا مصوری کے ارتقا کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ اب ایجنٹا، باغ اور پڈوکوٹائی کے قریب سِتن واسل میں جو فرسکو محفوظ رہ گئے ہیں وہی اس فن کے آغاز اور تکمیل کا کچھ حال بتا سکتے ہیں۔

ایجنٹا کے غاروں کی طرح وہاں کے فرسکو بھی کسی ایک وقت میں یا سلسلے سے نہیں ہے۔ سب سے پرانا کام غار نمبر ۹ کا ہے۔ جس کا زمانہ پہلی صدی عیسوی سمجھا جاتا ہے۔ قریب ڈھائی سو برس کے بعد کے آثار نمبر ۱ کے ستونوں پر ملتے ہیں۔ غار نمبر ۱۶ اور ۱۷ میں جو کام ہے وہ نسبتاً محفوظ رہا ہے، اور اس سے ہم فن کی ترقی اور اس کی خاص وضع کا اندازہ بھی کرسکتے ہیں۔ یہ کام ۵۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے قریب پچاس برس بعد غار نمبر ۱۹ کا کام ہوا اور پھر ۶۰۰ اور ۶۵۰ عیسوی کے درمیان غار نمبر ۱ تا ۵ کی تصویریں بنیں۔ ان میں غار نمبر ۲ کا کام سب سے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

فرسکوں کو نقصان نہ پہنچا ہوتا تو ہر غار ایک عظیم الشان مرقع ہوتا تصویروں کا سلسلہ کہیں پر ختم نہ ہوتا، اور نظر جس طرف بھی جاتی، کوئی تصویر ضرور سامنے ہوتی۔ اب بھی ان کا سلسلہ معنوی اعتبار سے صرف انہی جگہوں پر ٹوٹا ہے جہاں در ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ بیچ میں کے دروازے غائب ہوگئے ہیں۔ مختلف غاروں میں اور کبھی ایک ہی غار میں مختلف معیاروں کا کام نظر آتا ہے لیکن ہر جگہ مقصود گوتم بدھ کے جنموں کے حالات بیان کرنا تھا، ہر جگہ منظر کا مرکز انسان ہیں جن کے گرد حاشیے اور پس منظر کی بل کھاتی ہوئی بیلیں ہیں مکان، باغ، چٹانیں اور پہاڑ دکھائے گئے ہیں۔ انسانوں کے مجموعے بھی سیدھی قطاروں میں نہیں بلکہ پیچ کھاتی ہوئی لہروں میں ترتیب دئے گئے ہیں۔

تناسب مکانی کے ان خاص اصولوں کے مطابق جو صحیح مانے جاتے تھے، مثلاً دور کی چیز پیچھے نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اوپر آدمی فاصلے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بڑے اور چھوٹے بنائے گئے ہیں۔ پستی کے آثار کہیں نہیں ملتے، نمبر ۹ میں، جو سب سے پرانا نمونہ ہے، خطوط سے بڑی خود اعتمادی اور جرأت ظاہر ہوتی ہے، مناظر میں توازن ہے، شکلیں صفائی سے بنائی گئی ہیں اور انگلیاں جو دماغی کیفیتوں کا خاص مظہر ہیں۔ یہاں، اور اس سے بھی زیادہ نمبر ۱۶ اور ۱۷ میں انداز اور اداؤں میں حیرت انگیز تنوع ہے۔ جسم میں وہ لطافت ہے کہ اس کے ٹھوس اور بھاری ہونے کا خیال پیدا نہیں ہوتا اور اس کی ہر حرکت میں سادگی اور دل ربائی ہے۔ انسان اور اس کے قدرتی اور تہذیبی ماحول کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ وہ مل کر ایک جان ہوگئے ہیں، اور مناظر اور کیفیات کا سلسلہ ویسا ہی لامتناہی اور ناقابل تقسیم معلوم ہوتا ہے جیسے کہ زندگی حقیقت میں ہے۔ ایک نقاد کی رائے میں ایجنٹا کی مصوری کا کمال نمبر ۱۶ اور ۱۷ میں نظر آتا ہے، معمولاً یہ مرتبہ نمبر ۱ کے کام کو دیا جاتا ہے نمبر ۲ میں زوال کے آثار نمایاں ہیں، اگرچہ یہاں بھی مرکزی اشخاص استادوں کے بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایجنٹا کی مصوری کا محرک اس زمانے کا جذبۂ دینی تھا، دنیا کی ناپائداری کا احساس ان آنکھوں میں بھی نظر آتا ہے جو جذبات یا شراب کے نشے میں مست ہیں، جسے دیکھئے وہ ظاہر میں چاہے کچھ کر رہا ہو، دراصل دنیا سے بے تعلق، اپنی ذات میں محو ہے۔ لیکن ایجنٹا کی دینداری میں بھولاپن یا تکلف نہیں ہے، یہاں کی مصوری ان سے بڑے درباروں کا جن کے معمولات کی خوبی من کو موہ لیتی ہے؛ یہاں جذبۂ نیکی اپنے آپ کو نمایاں کرنے پر مصر نہیں، وہ نفس اور تہذیب اور سماج سے منہ نہیں موڑتا اور ناپائداری کا غم دنیا کے لئے زہر نہیں بن جاتا۔ یہاں زندگی ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان عشق ہے اور جو دل میں میٹھا میٹھا درد پیدا کرتی ہے۔ اور یہ اس درد کو عشق ہے، یعنی ناپائداری کا غم دنیا وی زندگی کے فرائض اور معمول، کامیابیوں اور ناکامیابیوں، لطف اور محنت سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ یہ سب باتیں ایجنٹا کی مصوری کے موضوعوں سے نہیں ظاہر ہوتی ہیں، بلکہ خود مصوری میں مضمر ہیں۔ یہ مصوری افراد کا فنی کمال یا ان کی قلبی واردات کا پتہ نہیں دیتی، ہندوستانی تہذیب کے اس دور کا عکس ہے جب یہ تہذیب عروج پر تھی۔

ایجنٹا کے مناظر اور انسانی مجموعوں کو الگ الگ دیکھا جائے تو اعلیٰ اور اوسط درجے کے کام کی آمیزش ملتی ہے۔ مگر بیشتر کام ایسا ہے جسے

دیکھ کر دو چار کرتی ہے۔ ایک عرصے تک یہاں کی تصویروں کے ایسے فوٹو نہیں لئے جا سکے کہ کام کی ساری خوبیاں واضح ہو جائیں، اور جو نقلیں مصوروں نے کیں ان میں ان کا اپنا مذاق، اصل پر حاوی ہو گیا۔ یزدانی صاحب نے سرکار عالی کی سرپرستی میں تصاویر کا ایک مرقع شائع کیا ہے[1] جو انتخاب اور طباعت دونوں کے لحاظ سے بہترین ہے۔ اس میں سرورق کے مقابل پر عبادت گاہ کے اندر بدھ کی تصویر ہے[2] جو حسن کی بہار میں سکون کا مجسمہ، دوامی مسرت کا دیدار معلوم ہوتی ہے۔ فن کے لحاظ سے اس میں رسمی طرز اور انفرادی جدت کو بڑی خوبی سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ آگے دیکھئے تو محل کا ایک منظر ہے۔ یہاں مستی کی فضا چھائی ہے، صرف آدمیوں کا ہجوم نہیں ہے بلکہ جذبات کا، سرور کی کیفیتوں کا۔ مصور کے قلم نے ہر شکل کو ایک شخصیت کا مظہر بنا دیا ہے۔ اگرچہ ناک نقشہ، ہونٹ، پلکیں، آنکھیں مقررہ اصولوں کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اسی کے بعد سنکھ پال جاتک کا ایک منظر ہے[3]۔ یہاں کام میں نفاست کم ہے، بے تکلفی، بے ساختہ پن زیادہ۔ ایک عورت جو بائیں ہاتھ کی طرف اوپر بیٹھی ہے اس کی پیٹھ دیکھنے والے کی طرف ہے، مگر اس کا انداز اس کا سارا حال بیان کر دیتا ہے۔ پھر ایک محل میں رقص کا منظر ہے[4]۔ یہاں بھی عیش کا تصور پیش کیا گیا ہے، وہ عیش نہیں جو مکان میں اور افراد کے دلوں میں بند رہتا ہے بلکہ وہ جو خوشبو کی طرح پھیلتا ہے، دماغوں میں بس جاتا ہے جیسے ہوا، اثر کر نہیں لی جا سکتی، صرف کامل علم کا نور زائل کر سکتا ہے۔ محفل کے بیچ میں رقاصہ ہے۔ یہ دھوتی باندھے، آستینوں دار کرتی پہنے ہے۔ اس کے سر پر اونچا مکٹ ہے۔ رقص کا شوق اس کے رگ رگ میں رچ بس گیا ہے، اس کی بانہیں عجیب طرح کے پیچ کھا رہی ہیں، دھوتی کی لمبی دھاریاں لہریں بن گئی ہیں، بالوں اور جوڑے کے زیور کو سنبھالنے کیلئے جو آرائشی فیتے بندھے ہیں وہ شعلوں کی طرح لپک رہے ہیں۔ لیکن ایسے مناظر سے کامل علم کی کیفیت یاد دلانے والی صورتیں دور نہیں ہوتی ہیں، اور ان صورتوں میں اتنی کشش ہے کہ نظر انہیں دیکھنے سے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اجنتا کے بودھی ستوں میں سے ایک سب سے خوبصورت بودھی ستوا کہلاتا ہے[5]۔ اس کے سر پر بیش بہا مکٹ ہے، گلے میں موتیوں کا ہار، بانہوں میں بازوبند۔ اس کا سینہ خوب چوڑا ہے، پورا جسم نہایت مضبوط اور سڈول معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہتھیار باندھ کر میدان کارزار میں کھڑا ہو جائے تو کوئی سورما بھی اس کے سامنے ٹھہر نہ سکے گا۔ مگر اسے نفس پر فتح پانے کا حوصلہ تھا اور اس نے یہ مشکل مہم سر کر لی ہے۔ پھر بھی وہ شہزادہ ہے، حسن اور نفاست اس کی سرشت ہے، وہ کمر پر ہاتھ رکھے، ہاتھ میں پھول پکڑے، جیسے کہ اس تصویر میں، تو وہ بھی ایک ادا ہے۔ اس کی نیم باز آنکھیں دنیا کو دیکھ رہی ہیں، اس کے دل میں ہمدردی ہے، لیکن اس کے دل کی کیفیت پر متانت اور شائستگی نے ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ سطحی نظر اسے صرف ایک خوبصورت اور غمگین شہزادہ سمجھے گی۔ اسی کے قریب، قد میں اس سے بہت چھوٹی یعنی اہمیت میں بہت کم ایک شہزادی کھڑی ہے، اس کے سر پر بھی ایک بھدی مکٹ ہے، ہاتھوں اور گلے میں بیش قیمت زیور۔ مگر یہ بھی کسی تصور میں ڈوبی ہے، اسے نہ اپنے حسن کی خبر ہے نہ دنیا کی نعمتوں کی پروا۔ بودھی ستوا اور شہزادی کے پیچھے مکانوں، باغوں، نازک شامیانوں اور جھومتے ہوئے تاڑ کے درختوں، پہاڑوں اور چٹانوں کا ایک وسیع اور پرستان کا سا پس منظر ہے جگہ جگہ پر مرد عورتیں عیش کی رسی شراب پی رہی ہیں جسکو خوبصورت بودھی ستوا کی طبیعت کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ وہ سب کچھ دیکھ چکا ہے، سب کچھ جانتا ہے، اسی وجہ سے اس کے جلے سے جسم میں ایسی ہمدردی اور اداسی ہے۔

اجنتا کے مصور اپنے زمانے کی تہذیب میں اس طرح رچے ہوئے تھے کہ وہ کبھی دین اور دنیا کو مقابلے پر نہیں لائے کبھی تضاد کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ گوتم بدھ کو مارا (بدھ متی شیطان) آزماتا ہے[6] اور اس کی ایک لڑکی بدھ کو اپنے فن سے مسحور کرنا چاہتی ہے تو اس طرح ہچکچاتی، شرماتی ہوئی آتی ہے کہ گویا اسے اپنے انداز و ادا اور جسمانی کشش پر ذرا بھی بھروسا نہیں۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ اس کے کامیاب ہونے کا بس اتنا امکان ہے جتنا کہ بچے کے پھونکنے سے کسی گہری، ساکت جھیل میں طوفان پیدا ہونے کا۔ بدھ کے چہرے سے استغراق اور سکون کی ایسی کیفیت ظاہر ہوتی ہے وہ نفس کی دنیا سے اتنی دور معلوم ہوتے ہیں کہ گویا مصور یہ دکھانا چاہتا تھا کہ دنیا اور نروان ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں مگر دونوں اپنی اپنی جگہ برابر کی حقیقتیں ہیں۔ لیکن ہمیں اس مسئلے سے بے تعلق ہو کر رائے دینے کا موقع ہر دفعہ نہیں ملتا ہے۔ غار نمبر ۱۷ میں ایک تصویر ہے جس میں بدھ اپنے آبائی شہر میں داخل ہوتے ہوئے دکھائے گئے ہیں[7]۔ ان کا قد ان کی عظمت کے لحاظ سے اتنا رکھا گیا ہے کہ شہر کی عمارتوں سے اونچا نکل جاتا ہے۔ ان کے لباس اور انداز میں فقیری کی مثال ہے۔ ان کے قریب، کہیئے ان کے قدموں پر ان کی بیوی اور بچے کی تصویر ہے، مگر اتنی چھوٹی کہ دونوں بدھ سے بہت دور بھی معلوم ہوں۔ ماں اور بیٹا دونوں عاجزی اور انکسار کے مجسمے ہیں۔ بدھ کی محبت نے انہیں بے تاب کر دیا ہے، وہ بدھ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی خدا کو دیکھتا، مگر ان کی محبت اور عاجزی بدھ کو کیسے متاثر کرتی، وہ اس دنیا کے رہے نہیں تھے۔ جذبات کی جو کشمکش یہ منظر پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ خالص فنی نقطۂ نظر سے اس تصویر کو اجنتا کے فن کا بہترین نمونہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اجنتا کے فرسکوں میں ایسے چوڑے چہرے، لٹکی ہوئی مونچھیں،

(باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

1. Ajanta; Yazdani. Part I. Plates. 2. Ibid. Plate X. 3. Ibid. Plate XI. 4. Ibid. Plates XII & XIII.
5. Ibid. XXIV. 6. Ibid Plate XXVIII. 7. Havell : Indian Sculptor & Painting.

بھارتندو ہریش چندر

حامد اللہ افسر

انیسویں صدی کا نصف آخر شمالی ہند کی ادبی جدوجہد کے سلسلہ میں بہت اہم ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس سرزمین پر انگریزوں کے قدم جم گئے تھے ۔ جہالت کی جو تیرگی سیاسی خلفشار اور بد امنی کے سبب دو نسلوں کو اپنی لپیٹ میں لا چکی تھی ۔ وہ رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی ، ادبی ذوق میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے تھے ، انگریزی تعلیم آہستہ آہستہ ، ذہنیتوں پر اپنے اثرات مترتب کر رہی تھی ، ملکی زبانوں کے ادب میں نئی نئی راہیں نکل رہی تھیں ، نثر و نظم کے قدیم اسالیب سے دامن چھڑانے کی کوششیں جاری تھیں ، اس دور کے "ترقی پسند ادیب" بڑی حوصلہ مندی اور جوش کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے ، خاص طور پر یوپی میں بہت ادبی چہل پہل تھی ، اردو کا بہت چرچا تھا ، مسلمانوں سے زیادہ ہندو اس زبان کو سنبھالتے اور ترقی کی راہوں پر لگانے کے لئے بے چین تھے ۔ لکھنؤ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۲ء) کا طوطی بول رہا تھا ، منشی جوالا پرشاد برق ، پنڈت تر بھون ناتھ ہجر ، منشی نوبت رائے نظر اور منشی لچھمن نرائن دل آجر جیسے باکمال ادیب اور شاعر اپنی تخیل کے جواہر پاروں سے اردو کی زیب و زینت بڑھا رہے تھے ۔

ادھر کوی لالہ لال کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو کو دیوناگری رسم خط میں لکھنے کا جو راستہ بتایا تھا اس پر متعدد تیز گام چلنے والے پیدا ہو گئے تھے اور یہ زبان "ہندی" کے نام سے پھلنے پھولنے لگی تھی ۔

یہ تھی ادبی فضا ہمارے ملک کی جب بنارس میں ہندی کے مشہور ادیب اور شاعر ہریش چندر ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد کا نام گردھر داس تھا ان کو بھی شعر و شاعری سے ذوق تھا اور ہندی میں بھی شعر کہتے تھے ، ہریشچندر بھی شاعر تھے اور بچپن ہی سے ان کے حرکات و سکنات تک پر شعریت طاری تھی ۔ کہتے ہیں ابھی ان کی عمر پورے سات برس کی بھی نہ تھی کہ ایک روز ایک دوہا کہہ کر اپنے پتا کے پاس لے گئے ۔ وہ اس دوہے کو سنکر بہت خوش ہوئے اور پیشین گوئی کی کہ ایک دن تم مہا کوی ہو گے ۔

ہریش چندر رسمی تعلیم کا بار زیادہ دن تک برداشت نہ کر سکے ، مگر ان کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کر دینے کے لئے اتنی تعلیم بھی کافی تھی جس اسکول میں انہوں نے تعلیم پائی تھی آج وہ ہریش چندر کالج کہلاتا ہے ۔

ہریش چندر خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ بہت آزاد منش خوش باش اور زندہ دل تھے ، روپیہ بے دریغ خرچ کرتے تھے ، اسی لئے ہمیشہ مقروض رہتے تھے سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے ۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے خود تکلیفیں اٹھاتے تھے اور ان تکلیفوں سے فرحت حاصل کرتے تھے ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے ایک عزیز نے کہا "بھائی ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرو" تو بولے "دولکشمی میرے سب عزیزوں کو کھا گئی ہیں میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں لکشمی کو کھا جاؤں گا"

ایک ناڈوالے کا کچھ روپیہ ان پر واجب ہو گیا ۔ جب بار بار کے تقاضوں کے باوجود وصول نہ ہوسکا تو اس نے ان پر دعویٰ کر دیا ، سر سید اس وقت بنارس میں صدر اعلیٰ تھے ۔ انہیں کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا ۔ ناڈوالے کے پاس کوئی تحریری ثبوت موجود نہ تھا ۔ لیکن ہریش چندر نے عدالت کے روبرو اقرار کیا کہ جس قدر روپیہ طلب کر رہا ہے وہ سب مجھ پر واجب ہے ۔ مگر قرض ادا کرنے کے لئے روپیہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے ۔ اسی کیفیت کا آئینہ یہ دوہا بھی ہے :-

دوہا

چندر ٹرے سورج ٹرے ، ٹرے جگت بیوہار
پے درڑھ شری ہری چند کو ٹری ست وچار

(چاند اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے ، سورج ٹل سکتا ہے ، اور دنیا کا بیوہار ٹل سکتا ہے لیکن ہریشچندر کا سچ بولنے کا مصمم ارادہ نہیں ٹل سکتا)

ہریش چندر کی طباعی ، ذہانت اور ان کے فطری انداز بیان نے ان کو بہت جلد پبلک میں مقبول بنا دیا اور باوجود اپنے لاابالی پن اور رنگین مزاجی کے وہ بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ ان کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ مشہور ہے ۔ جب ان کی شہرت کا آفتاب بلند ہو رہا تھا اس زمانہ میں راجہ شیو پرشاد بنارس میں انسپکٹر آف اسکولز تھے ، ان کو سی ایس آئی کا خطاب ملا جس کو عوام نے "ستارۂ ہند" بنا لیا اور خطاب کا یہ ترجمہ ان کے نام کا جزو بن گیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خطابات کی بڑی قدر تھی کوشش یہ کی گئی کہ ہریش چندر کو بھی حکومت کی طرف سے خطاب ملنا چاہیئے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی ۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ پبلک کی طرف سے ہریش چندر کو خطاب ملنا چاہیئے ، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا گیا جس میں ہر طبقہ کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور ہریش چندر جی کو "ستارۂ ہند" کے مقابلہ میں "بھارتندو" کا خطاب دیا گیا یعنی "ماہتاب ہند" ۔ اندو چاند کو کہتے ہیں کسی نے سجع

میں سے اٹھ کر کہا کہ ہریشچندر ایک رند اور آزاد منش آدمی ہیں ان کے اطوار پسندیدہ نہیں ہیں ایسے شخص کو خطاب کیوں دیا جائے۔ خطاب کے حامیوں میں سے کسی نے برجستہ جواب دیا کہ اس خطاب میں ہریشچندر کی آزاد منشی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہریش چندر کی رندی بھی ان کے کمالات اور اوصاف کے ساتھ اسی طرح ہے جس طرح چاند کے ساتھ داغ اس کے نور کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اسے عام طور پر دیکھو کرتا... کو آج کل کوئی جانتا بھی نہیں اور "بھارتیندو" ہندی داں طبقہ کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ غرض اسی دن سے ہریشچندر "بھارتیندو ہریش چندر" کہلانے لگے۔

کبھارتیندو بابو کے طرز تحریر کی اہم ترین خصوصیت سادگی اور پرکاری ہے۔ وہ بہت سلیس اور شستہ زبان لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ عبارت عام فہم ہو۔ ان کے بیان میں تاثیر اور سوز و گداز بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہندی مصنفوں میں شاید وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بے دھڑک حب الوطنی کے راگ الاپے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ہندی کے نہیں بلکہ "ہندوستانی" کے ادیب ہیں تو وہ عام طور پر ہندی نثر کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے پیش رووں میں منشی سدا سکھ لال بہت سنسکرت آمیز عبارت لکھتے ہیں کوی للّو لال کی عبارت پر برج بھاشا چھائی ہوئی ہے۔ سدل مصر کی عبارتوں میں پوربی زبان کا اثر غالب ہے اور راجہ شیو پرشاد تو دیوناگری رسم خط میں خاصی فارسی آمیز اردو لکھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھارتیندو بابو نے ہندی نثر میں پختگی اور روانی پیدا کی اور اس کو ایک باقاعدہ زبان کا روپ بخشا۔

سمت ۱۹۲۵ء میں (سمت عیسوی سن سے ۵۷ برس پہلے شروع ہوا) انہوں نے بنارس سے ایک عجیب و غریب ماہوار رسالہ نکالا۔ اس کا نام تھا "کوی بچن سدھا" یعنی شاعروں کی زبان کا آب حیات۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مضامین تک نظم میں شائع ہوتے تھے، رسالے کے قواعد و ضوابط خریداروں کے لئے ہدایتیں یہاں تک کہ خریداروں کا پتہ بھی نظم میں لکھا جاتا تھا۔

سمت ۱۹۳۰ء میں انہوں نے "ہریش چندر میگزین" نامی ایک اور رسالہ نکالا جس کا نام آٹھ نمبر نکلنے کے بعد "ہریش چندر چندرکا" رکھ دیا تھا۔ پروفیسر رام چندر شکل اپنی کتاب "ہندی زبان کی تاریخ" میں فرماتے ہیں کہ

"جس پیاری ہندی کو دیس نے اپنی دولت سمجھا اور جس کو عوام دوڑ کر اپنایا اس کا جلوہ اسی رسالے میں نظر آیا۔"

خود بھارتیندو بابو اپنی کتاب "کال چکر" (گردش زمانہ) میں فرماتے ہیں "ہندی نئی چال میں ڈھلی ۱۹۳۰ء میں"۔

سمت ۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایک اور ماہوار رسالہ "بالا بودھنی" خواتین کے لئے جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔

بھارتیندو ہریش چندر نے ہندی میں متعدد کتابیں لکھیں ان میں ڈراموں کی تعداد زیادہ ہے۔ انہوں نے ہندی ڈرامہ کو نئے طرز پر ڈھالنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ ان کے ناول بھی انگریزی اور بنگالی زبان کے ناولوں کے ڈھنگ پر لکھے گئے ہیں۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ودیا سندر، پریم منجری، ست ہریشچندر، چندراولی، بھارت درد شا، اندھیر نگری، بھارت جننی، نیل دیوی، مادھوری، مدرا راکشس، پریم جوگنی، ستی پرتاپ۔

بھارتیندو بابو کی بعض تصانیف سے مختصر اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اس سے آپ کو ان کے اسلوب بیان کا اندازہ ہو جائے گا۔

"چندراولی ناٹکا" میں ایک جگہ چندراولی کرشن کو مخاطب کر کے (جو سامنے موجود نہیں ہیں) کہتی ہے :-

"جھوٹے، جھوٹے، جھوٹے۔

جھوٹے ہی نہیں وشواس گھاتک (یقین کو توڑنے والے) کیوں اتنی چھاتی ٹھونک اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کو دشواس دیا۔ آپ ہی سب مرتے، چاہے جہنم میں پڑتے ...... بھلا کیا کام تھا کہ اتنا کھڑاگ کیا، کس نے اس اپدرو (دنگا فساد) اور جعل کرنے کو کہا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تم ہی تم رہتے، بس چین تھا، آنند تھا، پھر کیوں یہ وِش سے سنسار (زہر سے بھری ہوئی دنیا) کیا، بکھیڑے! اور اتنے بڑے کارخانے پر بے حیائی پرلے سرے کی، نام بکے، لوگ جھوٹا کہیں، اپنے مارے پھریں، پرواہ رے شدھ بے حیائی، پوری نیرلجتا، لاج کو جوتوں مار کے پیٹ پیٹ کے نکال دیا ہے، جس محلے میں آپ رہتے ہیں لاج کی ہوا بھی نہیں جاتی، ہائے ایک بار بھی منہ دکھا دیا ہوتا تو متوالے (دیوانے) والے مَتوالے بنے کیوں لڑ لڑ کر سر پھوڑتے کاہے کو ایسے بے شرم بنیں گے، حکمی بے حیا ہو۔"

"نیل دیوی" ایک ڈراما ہے۔ اس میں نیل دیوی کہتی ہے :-

آج بڑا دن ہے، کرسچان لوگوں کو اس سے بڑھ کر کوئی آنند کا دن نہیں ہے۔ مجھ کو آج الٹا اور دکھ ہے۔ اس کا کارن (سبب) منشی سمجھاؤ سلب (ایرشا) (انسان کا فطرتی جذبہ حسد) ہے۔ میں کوئی سدھ ذرہ روش نہیں کہ اس سے دور رہوں۔ جب مجھے انگریز رمنی (عورت) ......

بچے، بچے چیتیوں کے ساتھ برتن (خوش) ادھر سے ادھر پھر پھرکی کی تیلی کی طرح پھرتی ہوئی دکھلائی پڑتی ہیں تب اس ولیس کی سیدھی سادی استریوں کی ہین اوستا دگرتی ہوئی حالت مجھ کو یاد آتی ہے اور یہی بات میرے دکھ کا کارن ہوتی ہے"۔

ہمارے ہندوستان والے نے ایک ڈرامے "اندھیر نگری" میں بازار کا سین پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

کباب والا } کباب گرماگرم، مسالے دار، چوراسی مسالہ، ہتر اونگ کا کباب گرماگرم مسالے دار، کھائے سو ہونٹ چاٹے، دکھائے سو جیب کاٹے، کباب لو کباب کا ڈھیر، بیچا ٹکے سیر۔

گھاسی رام:- چنے جور گرم،

چنے بنا دیں گھاسی رام	جن کی جھولی میں دکان
چنا کھاوے توتی مینا	بولے "اچھا بنا چبینا
چنا کھائیں غفورن منا	بولیں اور نہیں کچھ سننا
چنا کھاتے سب بنگالی	جن کی دھوتی ڈھیلی ڈھالی
چنا کھاتے میاں جلاہے	داڑھی ہلتی گاہے بگاہے
چنا حاکم سب جو کھاتے	سب پر دونا ٹکس لگاتے

چنا جور گرم، ٹکے سیر

نرنگی والا } نرنگی لے نرنگی — سلہٹ کی نرنگی — بٹول کی نرنگی۔ رام باغ کی نرنگی، آنند باغ کی نرنگی۔ بھئی رہ گئی، میوے نرنگی، میں تو پی کے رنگ نرنگی، میں تو بھولی لے کر سنگی، نرنگی لے نرنگی۔ کملا نیبو، میٹھا نیبو، رنگ ترا، منگ ترا، دونوں مالوں لو، نہیں پیچھے ہاتھ ہی ملتے رہو گے، نرنگی لے نرنگی، ٹکے سیر نرنگی۔

کنجڑن } لے دھنیا، میتھی، سوآ، پالک چولائی، بتھوا، کرمو، تلفا کساری، چنا، سرسوں کا ساگ، مرسالے مرسا، بینگن، کونسترا، الوا، اروی، بنڈا، نیبوا، سورن، ترئی، مرئی لے ادی ادرک، مرچاں، لہسن، پیاز، ٹکورا۔

لے کھرنی، آم، امرود، نیبوا، سنتر ہو رہا ہے، جیسے کاجی رنانی، ویسے پاجی، رعیت راجی، ٹکے سیر بھاجی،

ہندوستان کا میوہ پھوٹ اور بیر،

مغل یا لہ } بادام، پستے، اخروٹ، انار، بہی دانہ، منقی، انجیر، آب جوش، آلو بخارا، چلغوزہ، سیب، ناشپاتی، سردہ، انگور کی پٹاری، مارا ایسا ملک جس میں انگریز کا دانت کھٹا ہو گیا، ناحق کو روپیہ خراب کیا، ہندوستان کا آدمی لق لق، ہمارے یہاں کا آدمی دق دق۔

لو سب میوہ ٹکے سیر،

پاچک (یا چورن والا):-

چورن امل بھید کا بھاری	جس کو کھاتے کرشن مراری
میرا پاچک ہے پچلونا	جس کو کھاتا شیام سلونا
چورن بنا مسالے دار	جس میں کھٹے کی بہار
میرا چورن جو کوئی کھائے	مجھ کو چھوڑ کہیں نا جائے
ہندو چورن اس کا نام	ولایت پورن اس کا کام
چورن جب سے ہند میں آیا	اس کا دھن بل سبھی گھٹایا
چورن ایسا ہٹی کٹ	لینا دانت سبھی کا کھٹا
چورن چیلا دال کی منڈ	اس کو کھائیں گی سب رنڈی
چورن عملے سب جو کھاویں	دونی رشوت ترت پچ جاویں
چورن ناٹک والے کھاتے	اس کی نقل پچا کر لاتے
چورن سبھی مہاجن کھاتے	جس سے جمع ہضم کر جاتے
چورن کھاتے لالہ لوگ	جن کو عقل اجیرن روگ
چورن کھاویں اڈیٹر ذات	جن کے پیٹ پچے نہیں بات
چورن صاحب لوگ جو کھاتا	سارا ہند ہضم کر جاتا
چورن پولیس والے کھاتے	سب قانون ہضم کر جاتے

مچھلی والی } مچھری لے مچھری
مچھریا ایک ٹکے کی بکائے
لاکھ ٹکا کے بال جوبنا: گاہک سب للچائے
نئے مچھریا روپے جال میں، نجیت ہی تھپڑ رجائے۔
مچھریا ایک ٹکے کی بکائے۔

برہمن } جات لے جات، ٹکے سیر جات
ایک ٹکا دو ہم ابھی جات بیچتے ہیں۔
ٹکے کے واسطے برہمن سے دھوبی ہو جائیں۔
اور دھوبی کو برہمن کر لیں۔
ٹکے کے واسطے جیسی کہو ویسی ووستا۔
ٹکے کے واسطے جھوٹ کو سچ کریں۔
ٹکے کے واسطے برہمن سے مسلمان۔
ٹکے کے واسطے ہندو سے کرسٹان۔
ٹکے کے واسطے دھرم اور پرتشٹھا دعزت، دونوں بیچیں
ٹکے کے واسطے جھوٹی گواہی دیں۔
ٹکے کے واسطے پاپ کو پن مانیں۔

ادھر ہمارے ہندوستان والے کی ہونٹوں کی کھنچی ہوئی کھینچی جا سکتی تھی۔ یہ ان ہم کے دلوں کو خبر کر رہی تھیں ادھر ان کے ہمعصر پنڈت رتن ناتھ سرشار۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

امتحان کی کامیابی کا راز
کیمیا حیات
استعمال کر کے اپنا حافظہ اتنا طاقتور اور قوی بنا لیجئے۔ کہ کچھ نہ بھول سکیں اور کم از کم اٹھارہ گھنٹے مسلسل دماغی محنت کر سکیں۔
دماغی کام کرنیوالوں کے لیے خاص طور پر کیمیا حیات کی ایجاد پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی صدر مجلس اطباء و ایس پرنسپل جامعہ طبیہ نے تقریباً دس سال کے تجربے اور ہزاروں روپیہ ضائع کرنیکے بعد کی ہے۔ دماغی کام کرنیوالوں کی کامیابی اور ترقی کیلئے کیمیا حیات کا استعمال ضروری ہے کیمیا حیات ہر قسم کے کیمیاوی اجزاء اور جواہرات سے سائنٹیفک طریقہ پر تیار کیجاتی ہے جو دماغ کیلئے قدرتی خوراک ہے۔ اگر آپ دماغی کمزوری کے علاوہ کسی اور پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہیں تو مفصل حالات لکھکر ناظم شعبہ تشخیص مجلس اطباء کو بھیج دیں،
قیمت فی شیشی، ۳۰ خوراک ۲ روپیہ تین شیشیاں ۵ روپیہ قسم اعلیٰ فی شیشی چار روپے محصول ڈاک تین شیشیوں تک ۹

ایشیا میں تعلیمی ابتری کا مسئلہ

خواجہ غلام السیدین

تعلیم کا مسئلہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا کہ ہم اس کے حقیقی مفہوم اور تخیل کی تشریح و توضیح کر دیں۔ ایسے تعلیم و تنظیم کے بہت سے عملی اور اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے لیکن متعدد پہلوؤں اور مسئلوں میں سے شاید کوئی اتنا شدید اور اہم نہیں جتنا جہالت اور بے علمی کی بلا کو دور کرنے کا مسئلہ۔ اس بلا نے ایک قدیم اور مہذب براعظم کو ذہنی تاریکی کے پردے میں ڈھک رکھا ہے۔ اس ہولناک بلا کا مقابلہ ہمیں پوری توجہ اور تن دہی سے کرنا ہے تاکہ جہالت کی تاریکی کی بنیادوں کو ختم کیا جاسکے اور ہم کم سے کم وقت میں بنیادی تعلیم کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کر سکیں جو ابتدائی اور ثانوی مدارج کا احاطہ کرے اور جس کا دائرہ عمل ایک ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہو۔ اس خیال کے پیش نظر اگر ہم دنیا کے مختلف حصوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لے کر اعداد و شمار جمع کریں تو اس بے حد مایوس کن نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ (سوائے افریقہ کے) خواندگی اور عام تعلیم کے نقطۂ نظر سے ایشیا کے براعظم کی حالت دنیا میں سب سے بدتر ہے۔ گو ساری دنیا کے صحیح اعداد و شمار اس وقت موجود نہیں ہیں پھر بھی ذیل میں جو اعداد پیش کئے جا رہے ہیں وہ چونکہ خاصے معتبر ذرائع سے حاصل کئے گئے ہیں اس لئے انہیں بڑی حد تک صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔ اور ان اعداد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایشیا کی صورت حال کیا ہے اور اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں کتنی جانفشانی اور تیز رفتاری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

(۱) یورپ

(الف) شمالی یورپ کے ممالک جن میں ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فن لینڈ، ندرلینڈ، برطانیہ عظمیٰ، جرمنی اور سوئزرلینڈ شامل ہیں۔ تقریباً سو فیصدی تعلیم۔

(ب) جنوبی یورپ کے ممالک میں تعلیم کا اوسط، شمالی یورپ کے ممالک سے بہت کم ہے۔ پھر بھی ذیل کے اعداد سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ وہ کسی ملک میں بھی پچاس فی صدی سے زیادہ کم نہیں۔

اٹلی ۷۳ فیصدی، اسپین ۵۴ فیصدی، پرتگال ۴۶ فیصدی۔ بلغاریہ ۵۴ فیصدی۔

(۲) امریکہ

(الف) ریاستہائے متحدہ ۹۷ فیصدی (اس تعداد کی تفصیل یہ ہے امریکی حبشی ۸۴ فیصدی دوسرے ملکوں میں پیدا شدہ امریکی ۹۰ فی صدی سفید امریکی ۹۸٫۵ فی صدی)

(ب) کناڈا میں خواندگی کا اوسط ۹۶٫۵ فی صدی ہے۔

(۳) لاطینی امریکہ نسبتاً پچھڑا ہوا ہے اور اس کی مجموعی خواندگی ۳۰ فی صدی ہے (اس کی تفصیل یہ ہے۔

ارجنٹائن (۸۷ فی صدی) مکسیکو (۳۸ فیصدی) پیرو (۴۲ فیصدی) برازیل (۳۴ فیصدی) گوئٹے مالا (۲۰ فی صدی)

(۴) آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں خواندگی ۹۵ فی صدی ہے۔

(۴) افریقہ میں خواندگی کا اوسط سب سے کم ہے۔ اور مختلف حصوں میں ۲ فی صدی سے لے کر ۱۰ فی صدی تک ہے۔

(۵) ایشیا

صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ پھر بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ خواندگی کا مجموعی اوسط دس فی صدی سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہے۔

(الف) ایشیائی ملکوں میں صرف جاپان ہی ایسا ہے جو یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ خواندگی وہاں عام ہے۔ لیکن حال ہی سے ایک تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ جاپانی ۴۰۰ لفظوں کے علم کو بھی خواندگی میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس میں شبہ نہیں کہ اس نقطۂ نظر سے جاپانی، ایشیائی ملکوں میں دوسروں سے بہت آگے ہیں۔

(ب) دوسرے ملکوں کی حالت حقیقت میں بڑی اندیشہ ناک ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے کیجئے۔ یہ اعداد و شمار خواندگی کے نہیں بلکہ ناخواندگی کے ہیں۔

ہندوستان ——— ۸۵ فی صدی
چین ——— ۸۰ فی صدی
سیام ——— ۵۲ فی صدی
انڈونیشیا ——— ۹۵ فی صدی
مشرق وسطےٰ کے ممالک ——— تقریباً ۹۰ فی صدی
(ایران، افغانستان، عراق وغیرہ)

اس طرح اس بے پایاں براعظم میں، جس کے ساتھ تہذیب کی زبردست روایات وابستہ ہیں، اور جس کی تاریخ کے ورق علمی کارناموں سے پُر ہیں، خواندگی عنقا ہے۔ یہاں جہل کی حکمرانی ہے اور ماہرین تعلیم کو ایک ایسے مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہے جس نے ایک بھیانک شکل

اختیار کرلی ہے۔ لیکن اس حل کی جستجو صرف ہمت اور استقلال کی رہنمائی میں ہوسکتی ہے۔ اگر ہم نے اس مسئلہ کا حل تلاش نہ کیا تو دنیا کی قوموں کے آسمان پر ہمارا ستارہ ہمیشہ کے لئے مدھم اور بے نور ہوکر رہ جائے گا۔

ایشیا کے مختلف ملکوں میں تعلیم کی اس ضرورت کا شدید احساس موجود ہے، اور جہالت اور بے علمی کی اس تاریکی کو دور کرنے کے طریقے اختیار کئے جارہے ہیں۔ گو یہ طریقے ضرورت کی شدت کے پیش نظر بالکل ناکافی ہیں ذیل کے مختصر تبصرہ سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایشیا کے مختلف ملک اس سلسلہ میں کیا کیا کررہے ہیں۔

(الف) چین:۔ چین نے تعلیم کے کام کو جاپان کی خوفناک لڑائی اور اس اندرونی جنگ کے دوران میں بھی بڑی ہمت سے جاری رکھا، جس میں چین دس برس سے مبتلا ہے۔ چین کا یہ کام ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چین نے "عوامی تعلیم کی ایک تحریک جاری کی ہے، اور اس میں چھ برس سے لے کر ۱۲ برس تک کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور پندرہ برس سے ۴۵ برس تک کے بالغوں کی تعلیم شامل ہے۔ چینیوں کا فوری پروگرام یہ ہے کہ آبادی کے دس فیصدی حصہ کے لئے ابتدائی تعلیم اور ۳۵ فی صدی بالغوں کے لئے تعلیم کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ بات بے حد تسلی بخش ہے کہ اس منصوبہ کا خاصا بڑا حصہ پروگرام کے عین مطابق، بڑی کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور بعض علاقوں میں مدرسوں اور طالب علموں کی تعداد میں ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور حکومت کا تعلیمی خرچ تقریباً دوگنا ہوگیا ہے۔ امن اور سلامتی میسر ہو تو چین اپنا یہ کام کہیں زیادہ تیز رفتاری سے انجام دے سکتا ہے۔

(ب) جنوبی مشرقی ایشیا:۔

ایشیا کے اس علاقہ میں بھی تعلیم کے حصول کے لئے بے تابی کی ایک بڑھتی ہوئی لہر موجزن ہے لیکن اس بے تابی کی تسکین کا سامان نسبتاً بہت کم ہے۔ ۱۹۳۴ء کے درمیان مدرسوں میں بچوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن خواندگی کی تعداد کے اضافہ میں معاشی حالات کا بہت شدید اثر پڑا ہے۔ معاشی حالات کا ایک پہلو تو عوام کی مالی بدحالی ہے۔ لیکن اس کا سب سے بدنما عنصر یہ ہے کہ بچوں کے ماں باپ انہیں کام دھندوں میں لگا لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو بچے مدرسوں میں جاتے ہی نہیں یا جاتے ہیں تو زیادہ عرصہ وہاں رہ نہیں سکتے۔ زندگی کا یہ معاشی پہلو ایشیا کے سارے ملکوں میں تعلیم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اگر ہم کسی بڑے تعلیمی منصوبہ کو کامیابی سے چلانا چاہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس اقتصادی مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

(ج) مشرق وسطےٰ کے ممالک:۔

مشرق وسطےٰ کے سارے ملک کم وبیش ایک ہی طرح کی مجبوریوں کا شکار ہیں۔ اور یہ مجبوریاں نہ صرف تعلیمی سفر کے راستے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں بلکہ ہر طرح کی سماجی اصلاح کے منصوبوں کے پیروں کی زنجیر بنتی ہیں۔ سیاست، اقتصادی بدحالی، بیرونی غلبہ، سامنتی اداروں کی موجودگی، چھوٹی چھوٹی زمینداریاں، صنعت وحرفت کی کمی، وسائل آمد و رفت کی ابتری، غریبی اور جسمانی ناتوانی ۔۔ ان ساری چیزوں نے مل کر اکثر لوگوں کی زندگی کو محض زندہ رہنے کی ایک شدید اور بے بس جدوجہد کی سطح پر لاکر کھڑا کردیا ہے اور اس صورت حال نے انہیں بلند ادبی قدروں کی طرف سے بالکل غافل اور بے حس کردیا ہے۔ یہ قصور عوام کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جنہوں نے ان کی زندگی کو ایسی پستی میں دھکیل دیا ہے جو عام انسانی زندگی سے بھی کم تر ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ان ملکوں نے بعض قابل رشک کارنامے دکھائے ہیں۔ لیکن جہاں تک عوام کی تعلیم کا تعلق ہے، صورت حال بے حد مایوس کن ہے۔ کچھ ملکوں میں بچوں اور بالغوں کی تعلیم کے کام کو تیزی سے پھیلانے اور تعلیم کو زندگی کی ضرورتوں سے زیادہ قریب لانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ لیکن کوششیں محض اس اہم مسئلہ کی سطح کو چھوتی ہیں۔ اس مسئلہ کو حقیقت کی تابانی دینے کے لئے ضرورت ہے کہ پورے سماجی نظام میں مکمل انقلاب پیدا کیا جائے اور اس انقلاب کی بنیادوں میں انصاف، مساوات اور ترقی پذیری کے عناصر شامل ہوں تاکہ تعلیمی اصلاح کا کام عملی حیثیت سے مفید اور دیرپا نتیجے پیدا کرسکے۔

(د) ہندوستان:۔

ہندوستان میں عام تعلیم کا مسئلہ بنیادی طور پر دیہاتوں کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی ۸۵ فی صدی سے زیادہ آبادی دیہاتوں میں ہے اور زراعت اور اس سے متعلقہ پیشوں میں لگی ہوتی ہے۔ اس تعلیم میں بچوں کی ابتدائی تعلیم بھی شامل ہے اور بالغوں کی تعلیم بھی چونکہ ہندوستان میں اب تک لازمی طور پر مفت اور عام تعلیم دینے کا طریقہ رائج نہیں ہے اسلئے تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں اس کا بہت سا حصہ یعنی تقریباً ۸۰ فی صدی رائیگاں جاتا ہے۔ یعنی ان سو بچوں میں سے جو پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں صرف ۲۰ چوتھی جماعت تک پہنچ جاتے ہیں اور محض خواندگی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ دوسروں کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی راستہ چلتے چلتے سڑک کے کنارے بیٹھ رہے۔ ان بچوں پر

جو ذہن پیدا اور وقت صرف ہوا وہ گویا ضائع ہو جاتا ہے۔ اس جگہ اس بات کا ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ یہ "تضیع" صرف ہندوستان تک محدود نہیں۔ ایشیا کے اکثر دوسرے ملکوں میں بھی صورت حال یہی ہے، خاص کر سیام، ہند چین، انڈونیشیا اور مشرق وسطےٰ کے اسلامی ملکوں میں۔ یہ خرابی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم کے احساس میں زیادہ قوت اور شدت نہ پیدا ہو اور لازمی تعلیم کا کوئی موثر طریقہ رائج نہ کیا جائے۔

پچھلے چند برسوں میں ہندوستان میں تعلیمی اصلاح کے جو قلیل لیکن اہم تجربے ہوئے ہیں وہ صرف اس سلسلہ میں ہوئے ہیں کہ ملک میں کس طرح کی تعلیم دی جائے ان تجربوں کا انداز عموماً محدود رجہ علمی اور رسمی، اور ملک کی زندگی اور کلچر سے بے تعلق رہا ہے بول پور میں شانتی نکیتن، اور دہلی میں جامعہ ملیہ اس طرح کے تجربات کے مرکز رہے ہیں دیہاتوں میں تعلیم کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے حال ہی میں تعلیم کی ایک ایسی اسکیم بنیادی قومی تعلیم کے نام سے مرتب کی گئی ہے جس میں تعلیم مفت دی جائے، سب کو دی جائے لازمی طور پر دی جائے اور جس کی بنیاد کسی نہ کسی حرفہ پر ہو اور جو خاص خاص مقامات کے بنیادی پیشوں اور عام زندگی سے قریبی تعلق رکھتی ہو۔ اسکے بھی بعد سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے جنگ کے بعد تعلیمی ترقی کا ایک ایسا منصوبہ تیار کیا ہے جس میں سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ملک میں تعلیم کا ایک جامع نظام قائم کیا جائے جس میں نرسری اسکول سے لیکر یونیورسٹی اور مختلف مدارج کی تعلیم بالغان تک سب چیزیں شامل ہوں۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو بھی اسی پیمانہ پر تعلیم کی سہولتیں دی جائیں جیسی برسوں سے مغربی ملکوں کو حاصل ہیں۔ اسکیم اب تک محض کاغذ پر ہے۔ لیکن قوم اور حکومت نے اس پر اپنی پسندیدگی کی مہر لگا دی ہے اور تعلیم کے ارباب حل وعقد کو سوچنے کی ایک نئی راہ سجھا دی ہے۔ اب وہ صرف چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ انہیں اس مسئلہ کا حل ایک نئی بنیاد پر تلاش کرنا ہوگا۔ تعلیمی کی نئی پالیسی کیلئے زیادہ جاندار تخیل، زیادہ بہتر اور اچھی تنخواہوں والے استادوں زیادہ وسیع عمارتوں اور وافر سامان، بچوں کی جسمانی ذہنی اور سماجی ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ، اور اسلئے اتنے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوگی کہ ملک کی دولت کے پاسبانوں کے تصور میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی۔ اس کام کے لئے ایک نئے مطمح نظر کی بھی ضرورت ہے جسکا مقصد یہ ہو وہ ہر ایک کیلئے تعلیم کے مساوی مواقع مہیا کرے اور اس زبوں جماعتی نظام کی جڑوں کو کھود دینے پر تل جائے جو تعلیم کی دنیا میں اسی قدر مضر ہے جتنا معاشی زندگی میں۔ یہ مطمح نظر تعلیم کے اس فرسودہ نظریہ کا دشمن ہے جو اس عمارت کی بنیاد اوپر سے نیچے کی طرف لانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ تو ایسی عمارت کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے جس میں ملک اور قوم کی بہترین صلاحیتوں کو پوری طرح ابھرنے اور پروان چڑھنے کا موقع مل سکے۔ اگر اس سکیم پر پوری طرح عمل کیا جا سکے تو ہندوستان تعلیم کے نشاۃ الثانیہ کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔

خطاطی و مصوری، عہد اکبر میں

بقیہ صفحہ ۱۲۵

مگر جان نہیں ڈال سکتا تو جان ڈالنے والے کی قدرت کاملہ کی دل سے داد دیتا ہے۔ اور اپنی عقل بڑھاتا ہے۔

بعض مشہور کتابیں مصوّر کی گئیں

(۱) قصہ امیر حمزہ بارہ جلدوں میں بالتصویر کیا گیا۔ چنانچہ مشہور استادوں نے چودہ سو تصویروں سے اس کو مزین کیا (۲) چنگیز نامہ۔ ظفرنامہ۔ یہ اقبال نامہ۔ (۳) آئین اکبری۔ رزم نامہ۔ رامائن۔ نل دمن۔ کلیلہ و دمنہ۔ عیار دانش۔ یہ سب کتابیں جگہ جگہ پر باتصویر کی گئیں۔ تصویر کا مقام خود اعلیٰ حضرت مقرر فرماتے تھے۔

ملازمان دولت کی تصویریں

اعلیٰ حضرت کے حکم سے تمام ملازمان دولت کی بھی تصویریں کھینچی گئیں جن سے ایک بڑا البم تیار ہوا اور جن کی تصویریں کھنچیں ان کو حیات جاوید حاصل ہوئی۔ فن مصوری کے دفتر میں کثرت سے منصب دار۔ احدی سوار اور پیادے ملازم تھے۔ چنانچہ پیادوں کی تنخواہ بارہ سو دام سے زیادہ اور چھ سو سے کم نہ تھی۔

(ماخوذ از علامی ابوالفضل)

بھارتندو ہریش چندر

بقیہ صفحہ ۱۴۱

اپنے مرصع طرز بیان اپنی ظرافت، اپنی شوخیوں اور حاضر جوابیوں، اپنے برجستہ مکالموں اور اپنے دلفریب خاکوں سے ملک کے بچے بچے کو محو حیرت بنا رہے تھے، لیکن سرشار کے اسلوب بیان میں تصنع زیادہ تھا۔ یہی اس زمانے کا رنگ تھا۔ زبان اور طرز بیان ہی کیا لکھنؤ کی ساری زندگی تصنع اور تکلف سے گرانبار تھی۔ بلکہ یہاں کی فضا میں آج بھی یہ چیزیں بسی ہوئی ہیں۔ بھارتندو بابو کا طرز بیان سادہ اور پرزور تھا، رنگین اور دل نشین تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی ظرافت بھی سادگی کے زیور سے آراستہ تھی اور ان کے یہاں تمدن و معاشرت کے بڑے سے بڑے دقیق مسائل بھی ہنسی مذاق کے چٹکلوں میں حل ہوتے چلے جاتے تھے۔

جیساکہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا ہے بھارتندو بابو ہندی نثر کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ اصل میں ان کی زبان وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں قریب قریب ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسے ہندی کہئے اردو کہئے یا ہندوستانی سمجھئے، چیز ایک ہی ہے اگر زبان کے مسئلہ کو سیاست سے الگ رکھا جائے اور ہندی کے مصنف اور شاعر بھارتندو بابو کے اتباع کو مصلحت کے خلاف نہ سمجھیں تو میرے نزدیک زبان کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے

اس جگہ سے انشارہ میل اتر کر ہم آدھی رات کو چترال کی پہلی چوکی بیرغانی کسی طرح پہنچے اور وہاں مچھروں اور کھٹملوں نے ہمیں کیا کچھ دکھ دیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے جسے سنانے کا یہ موقع نہیں۔
بہرحال اب ہم چترال کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔

———— ❖ ————

چترالی پٹھان نہیں ہیں۔ ان کی تہذیب اور معاشرت افغانوں سے نہیں بلکہ ترکوں سے متاثر ہے۔ ان کی زبان فارسی کے اس قدیم روپ سے اخذ ہے جسے تلچ کہتے ہیں۔ اس زبان کا رواج اس زمانہ میں تھا جب سنسکرت اور ایرانی میں ربط تھا۔ ہندوستان میں بسنے کے بعد جب آریا اپنی زبان کے پرانے بستوں کو بھول گئے تو وہ سرحد کی مختلف بولیوں کو پیشاچی کہنے لگے۔ لفظ پشاچ سے مراد بھوت پریت ہے۔ یعنی ان لوگوں کی بولی جو بھوتوں کے سے ڈراؤنے تھے۔ گو بعد ازاں ترکی اور فارسی کے اثر سے چترالی زبان کی شکل بہت بدل گئی تاہم بنیادی اعتبار سے وہ ہنوز تلچ اور ویدک سنسکرت کی چیلی ہے اور اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے گھلے ملے ہوئے ہیں۔ یوں چترالی کا کوئی ادب نہیں۔ لوگ عام طور پر فارسی بولتے اور ہندوستانی سمجھتے ہیں۔

چترال سے ہندوستان کا تعلق ساٹھ ستر سال سے زیادہ پرانا نہیں۔ جغرافیائی پابندیوں سے ہندو یا مسلمان حکمرانوں کی توجہ ادھر منعطف نہ ہونے دی اور انگریزوں نے بھی اس علاقہ پر تب ہاتھ ڈالا جب زار کے سامراج کا خطرہ پامیر سے آ لگا بلکہ روسیوں کے ہراول دستے چترال کے اندر منڈلانے لگے تھے گذشتہ صدی کے اواخر میں ایک سخت مہم کے بعد برطانوی فوجوں نے چترال کو سر کیا، اور تب سے یہ جگہ روس کے منصوبوں پر نظر رکھنے کے لئے دوربین کی طرح استعمال کی گئی۔ مستر چترال کے حکمران جو مہتر کہلاتے ہیں اپنے اندرونی معاملات میں بڑی حد تک خودمختار رہیں۔ یہ خاندان کوئی تین سو سال قبل ترکستان سے آیا اور اس خطہ پر قابض ہو گیا

ہز ہائی نس ناصر الملک مرحوم کی مہمان نوازی اور چترال کی دلفریبی ہمیشہ یاد رہے گی۔ گو دو دسمبر کے سہرا بکس بازار میں لیس گے اور ایسی سرزمین میں رہنا اب کب میسر ہو گا جہاں نہ اخبار آتے تھے نہ ریڈیو کی خبرانی سنائی دیتی تھی اور نہ سینما کا نظارہ ہوتا تھا۔ اس دلچسپ ملک کی بہت سی باتیں گھٹتی ہیں لیکن اس مختصر مضمون کا مقصد کافروں کی ایک وادی کی سیر ہے جسے دیکھنے ہم اتنی دور آئے تھے چترال ریاست کی مغربی سرحد جس جگہ افغانستان کو چھوتی ہے وہیں ہندوکش کے آغوش میں یہ وادی چھپی ہوئی ہے۔

———— ❖ ————

آپ نے کافرستان کا نام تو سنا ہو گا یہ علاقہ بدخشاں سے ملتی ہے یہاں کے باشندے بت پرست تھے اور اپنے دیوتاؤں پر ان کا اعتقاد اس قدر راسخ تھا کہ پڑوس کے ملکوں میں اسلام کا بول بالا ہونے کے بعد بھی ان کی مت نہ پھیری۔ اسی وجہ سے مسلمان انہیں کافر اور ان کے ملک کو کافرستان کہنے لگے۔ صدیوں تک یہ کافر مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ بالآخر گذشتہ صدی کے نصف میں امیر عبدالرحمن خان نے انہیں زیر کیا تقریباً سبھی کافر مسلمان ہو گئے اور ان کے ملک کا نام بدل کر نورستان کر دیا گیا

اس علاقہ کا ایک حصہ جسے بمبوریت کی وادی کہتے ہیں چترال ریاست میں چلا آیا تھا۔ یہاں کئی سو گز سیاہ پوش کافروں کے ہیں جو اب تک بت پرست ہیں اور اپنے اجداد کی راہ سے ہرگز نہیں ہٹتے۔ کافر دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے وہ سرخ پوش اور سیاہ پوش کہلاتے ہیں۔ یہ تمیز رنگ لباس کی وجہ کیگئی تھی اور ان قبیلوں کے دیوتا بھی الگ تھے

کافروں کی ابتدائی تاریخ کے متعلق صحت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا پرانی سنسکرت کتابوں میں اس علاقہ کا نام کپیشا بتلایا گیا ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ آج سے دو ہزار سال قبل یہاں کشان بادشاہوں کا عمل دخل تھا ممکن ہے کہ سکندر اعظم کے بعد جو چھوٹی موٹی یونانی حکومتیں شمالی ہند اور ترکستان میں قائم ہوئیں ان میں سے کسی نہ کسی کا تعلق اس جگہ سے رہا ہو۔ انگریز مورخ دلسن اسمتھ کا خیال ہے کہ کافروں کی رسومات و روایات میں قدیم یونانیوں کی بو باس ملتی ہے۔ بعض مورخوں کا قیاس ہے کہ جب مسلمان سامراجیوں نے ہودیوں کو کھدیڑا تو ان کا کوئی قافلہ بھٹک کر ادھر نکل آیا اور کافر اپنیں کے نام لیوا ہیں۔ کافر بولیوں کی ساخت انہیں پیشاچی زبانوں کو تعلق رکھتی ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں سال قبل جب آریا وسطی ایشیا چھوڑ کر بذریعہ ایران اور ہندوستان کی طرف چل پڑے تو ان میں سے کچھ لوگ ان پہاڑوں میں بھٹک گئے۔ وقت گزرتا گیا اور جیسے جیسے ان کی اولاد بڑھتی گئی وہ ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑوں میں پھیلتی گئی اور اس نظریہ کے مطابق کافر چترالی اور کشمیری کی اصل ایک ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد لسانی اور نسلی مطابقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف زبانوں اور نسلوں کی آمیزش کے باوجود ان قوموں کی شکل و شباہت اور زبان پر قدیم آریاؤں کا اثر صاف ہویدا ہے۔

تحریری تاریخ میں کافروں کا ذکر سب سے پہلے تزک تیموری میں کیا ہے۔ کافر امیر تیمور کے مقبوضہ علاقوں میں لوٹ مار کی غرض سے گھس آئے تھے۔ ۱۳۹۸ء میں جب تیمور ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے چل کھڑا ہوا تو بدخشاں پہنچکر کافرستان کی طرف مڑا تاکہ ان کی سرکوبی کرے، لیکن کافروں نے رات کو چھاپا مار کر تیمور کے سپاہیوں کو پسپا کر دیا اور تیمور کو اس مہم سے ناکام لوٹنا پڑا۔ بابر نے اپنی تزک میں ان وحشی قبیلوں اور ان کے ملک کا حال بڑے دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے۔

بعد میں ان کا سراغ پادری (Gregorio Rioz) کی

تحریروں میں ملتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں آگرہ میں جو جیسوٹ مشن رہتا تھا۔ یہ پادری اسکا کارکن تھا۔ ۱۶۷۸ء میں وہ کافروں کی ٹوہ لینے کے لئے آگرہ سے روانہ ہوا۔ اس سفر کی وجہ یہ تھی کہ جو آرمینین سوداگر سمرقند ہوتے ہوئے چین جاتے تھے اور یا چترال کے راستہ ہندوستان آتے تھے یورپ میں یہ افواہ پھیلانے لگے کہ کافرستان کے باشندے ان عیسائیوں کے نام لیوا ہیں جو رومنوں کے مظالم سے بچنے کے لئے ہندوکش کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ ان افواہوں کو سنکر پادری ریوڈر عازم کافرستان ہوا اور بہزار دقت وہاں پہنچا۔ واپس آکر اس نے جو خط پاپائے روما کو ارسال کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر بادو کی پوجا کرتے تھے اور شراب کے نشہ میں بدمست رہتے تھے۔

کافرستان کا سب سے مکمل حال (Lockhart) کی کتاب میں ملتا ہے وہ پہلا یورپین تھا جو زمانۂ حال میں اس جگہ پہنچا۔ اس کی کتاب ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مغربی عالموں اور سیاحوں کا دھیان ادھر گیا اور اس دوران میں کافروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کئی رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

ریاست کے صدر مقام کا نام بھی چترال ہے۔ اس سے کوئی پندرہ میل دکھن میں ایک پُر فضا مقام ایون نامی ہے۔ ایون اور وادی بمبریت کے بیچ میں ایک چٹیل پہاڑ ہے جسے عبور کر کے ہمیں اس پار پہنچنا تھا۔ ہوا جائی کی کمی کی وجہ سے پہاڑ پر کوئی ڈگر نہ تھی اور شاید بن بھی نہ سکتی تھی کیونکہ یہ چکنے سلیٹی پتھروں کا ایک ایسا بے ہنگم ڈھانچہ تھا جس پر نہ تو نقشِ قدم بن سکتے تھے اور نہ پاؤں جم سکتے تھے۔ حالانکہ یہ پہاڑ نو ہزار فیٹ سے زیادہ اونچا نہ ہوگا۔ لیکن اسے سر کرنا جوکھم کا کام تھا۔ اس بکٹ راستہ میں نہ تو کہیں گھاس کا تنکا نظر آیا اور نہ کہیں پانی کی ایک بوند ملی۔ آٹھ گھنٹہ کی لگاتار چڑھائی کے بعد آٹھ میل چل کر جب ہم چوٹی پر پہنچے تو سانس پھول رہا تھا، جسم پسینہ سے شرابور تھا، اور طاقت جواب دے چکی تھی۔ سامنے بمبریت کی وادی ڈھ ہزار فیٹ کے اتار پر تھی۔ ساری وادی کوئی پندرہ میل لانبی اور تین چار میل چوڑی ہوگی۔ شمال سے وہ جنوب کی طرف چڑھتی گئی تھی اور چودہ پندرہ ہزار فیٹ بلند برف پوش پہاڑوں کے پرے افغانستان تھا۔

اس وادی کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا تھا کہ ہماری آن بان نرالی ہے۔ بیچوں بیچ بمبریت فول نامی پہاڑی ندی شور مچاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ پہاڑ کی برف پگھل پگھل کر اسے رزق پہنچاتی تھی اور دور دور تک دو طرفہ بید مجنوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ اگست کا مہینہ تھا اور بہار اپنے جوبن پر تھی ہر طرف کھیت ہی کھیت تھے جن میں گیہوں کی سنہری بالیں دمک رہی تھیں۔ پہاڑوں کے رگ و ریشہ سے جھرنے پھوٹ نکلے تھے اور قدرت کو یہ سرزمین اس قدر محبوب تھی کہ دائیں بائیں دور اور نزدیک کے پہاڑ سر بلند کھڑے تھے اور ایک چشمہ میں ہم نے پیڑوں اور سونے کا پانی ساتھ ساتھ بہتے دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جگہ سوئیزرلینڈ اور کشمیر کی بہترین وادیوں سے چشمک زنی کرتی تھی مگر اس وادی کی اصل دولت فطری حسن اور معدنی سرمایہ کے علاوہ اور کچھ تھی۔ ندی کے آس پاس کافر حسینائیں مویشی چرا رہی اور کھیتوں میں کام کر رہی تھیں وہ سب گہرے بھورے رنگ کے اونی لبادوں میں ملبوس تھیں۔ جو گلے سے لے کر ٹخنے تک لانبا تھا اور کمر بند سے کسا ہوا تھا دو چوٹیاں ماتھے سے نکال کر سر پر الٹی لٹکا دی گئی تھیں۔ سر جس اونی رومال سے ڈھکا ہوا تھا اس پر کوڑیاں ٹنکی ہوئی تھیں اور اس پہناوے میں ناگ پھن کی سی پھبن تھی۔ لباس ان مصری عورتوں کا سا تھا جن کی مورتیں فراعین کے مقبروں میں جڑی ہوئی ہیں۔ پٹھان یا چترالی عورتوں کی طرح کافر حسیناؤں کو اجنبی مردوں سے حجاب نہ تھا۔ ہاں ہمیں دیکھ کر وہ راستہ سے ذرا ہٹ گئیں اور معلوم نہیں کس بات پر مسکرانے لگیں۔

ہمارے استقبال کے لئے وادی کا ہیرو 'منگ' پل پر موجود تھا آپ اپنی مرضی سے وہ ہمارا ترجمان اور رہنما بن گیا۔ طالسطائی نے اپنے افسانہ "کازق" (Cossacs) میں جس بوڑھے شکاری اور نشانچی کا ذکر کیا ہے منگ اسی قبیل کا آدمی تھا کافروں کے جو مویشی افغان سرحد میں چلے جاتے تھے انہیں واپس لانے کا کام ریاست نے منگ کے سپرد کیا تھا۔ بہار کے زمانہ میں ان علاقوں کے جانور چرنے کے لئے پہاڑوں میں چھوڑ دئے جاتے ہیں اور مہینوں وہیں رہتے ہیں آس پاس والے کبھی ان کی چوری نہیں کرتے البتہ افغانوں اور کافروں میں ان کے چلنے پر جھگڑا ہوا کرتی ہے۔ اور ان جھگڑوں کا تصفیہ منگ کیا کرتا۔ کہ جتنے جانور گم ہو جاتے اتنے سرحد پار سے چرا لاتا۔ منگ نشانہ بازی اور زرت سنگیت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ ہم مرنے "اٹ ٹک (ناچ) دیکھیں گے یا 'جام ژور' (حسینہ) سے بھی پینگ بڑھائیں گے۔ اس کی رائے ہے کہ اٹ ٹک کی حد تک تو مناسب ہے لیکن جام ژور کا معاملہ کچھ اور ہے۔ دوشیزہ ہو یا شادی شدہ کسی غیر مرد سے خوشی خوشی ملے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن زور زبردستی کی سزا موت ہے "نہیں۔ منگ ہمیں طرف اٹ ٹک دکھینا ہاں کافروں کے رسم و رواج کو سمجھنا اور پہاڑوں کی سیر کرنا ہے ہم کسی کافر کے گھر رہنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں قریب سے دیکھ سکیں۔

ہماری رہائش کا انتظام کرکال نامی گاؤں میں چربی والا کے گھر کی بالائی منزل پر کیا گیا۔ منگ کی اصطلاح میں چربی والا سے مراد سرمایہ دار ہے۔ عام طور پر گھر لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ پتھر کے ردّوں پر مٹی کا گارا لگے ہوئے اناج گھر تھے۔ مکان دو منزلہ تھے جن کے اوپری حصہ میں انسان اور نیچے حیوان رہتے تھے اوپر جانے کے لئے لکڑی کی سیڑھی ہوتی ہے جو خطرہ کے وقت اٹھالی جاتی ہے ملک خانہ

بال بچوں سمیت نیچے جانوروں کے ساتھ رہنے چلا گیا اور اوپر کی کوٹھری تالے سے خالی کردی گئی۔

کافروں کی رہائش گاہ کے عین درمیان ایک الاؤ ہوتا ہے جس سے بیک وقت چولہے اور آتش دان کا کام لیا جاتا ہے۔ دیا جلانے کا رواج نہیں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کھپچیوں سے اندر باہر مشعل کا کام لیا جاتا ہے۔ دوسرے پہاڑیوں کی طرح یہ لوگ بھی گندے ہوتے ہیں اور ان کی ایک ضرب المثل کا مطلب ہے کہ جو چیز میلی ہو جاتی ہے اسے صاف رکھنے سے کیا فائدہ۔ البتہ چھوت کے ایام میں عورتیں گاؤں سے کچھ پرے کر دور ایک کال کوٹھری میں رکھی جاتی ہیں اور کوئی ان کے قریب نہیں جاتا۔ گھر کا کوئی آدمی دن میں ایک بار کھانا لے جاکر کوٹھری کے باہر رکھ آتا ہے۔

شہد، مکھن اور پنیر یہ تینوں ان کے من بھاتے کھاجے ہیں لیکن یہ نعمتیں صرف مردوں کے لئے مخصوص ہیں کھیتی باڑی اور گھر بار کا سارا کام عورتیں کرتی ہیں۔ مرد شکار، گلہ بانی یا ناچ گانے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کافر عورت جنسی معاملات میں آزاد ہے۔ وہ پردہ نہیں کرتی۔ اور من چاہے مرد کا انتخاب کر سکتی ہے۔ نوروز کو کافر کنواریاں ایک میدان میں جمع ہوتی ہیں اور ان کے طلبگار آ کر اپنی اپنی جائداد کی تفصیل سناتے ہیں۔ یہاں سونے لپیے کا کوئی مول نہیں۔ زمین اور مویشی ہی قیمتی چیزیں ہیں اور جہیز دولہا کی طرف سے ساس سسر کو دیا جاتا ہے۔

میدانوں میں اخروٹ، بادام، اور چنار کے پیڑوں کی بہتات نظر آئی اور پہاڑ دیودار اور چیڑ کے تن آور درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جنگلوں میں شکاریوں کا مرغوب جانور مارخور کثرت سے ہوتا ہے اور چاندنی راتوں میں چکوروں کے نالہ دشیون نے پہروں ہماری نیند اچاٹ رکھی۔ کافر اپنے مردوں کو لکڑی کے تابوتوں میں قبرستان کے اندر رکھ آتے ہیں۔ قبرستانوں کی حفاظت اِمرا دیوتا کا چوبی بت کرتا ہے۔

کافروں کی بولی گو چترالی یا پشتو سے بالکل مختلف ہے لیکن لسانی اعتبار سے تلچہ یا پشاچی کی ایک شاخ ہے۔ مرور ایام نے اس میں ترکی اور فارسی کے الفاظ گھلا دئیے ہیں اور ایسے کافر بھی ملیں گے جو فارسی جانتے ہیں۔ اب سے پچاس سال پہلے تک یہ اپنے دشمنوں کو بھون کر کھا جاتے تھے اور انکی کھوپڑیوں کے بار پہنا کرتے تھے لیکن ریاست کا قانون اب انہیں اسکی اجازت نہیں دیتا گو نئے غلام نہیں بنائے جاسکتے لیکن ایسے غلام اب بھی باقی ہیں جو پشتہا پشت سے کسی گھرانے کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ البتہ انہیں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

کافروں کے دو بڑے تیوہار ہیں ایک تو نوروز جو آمد بہار کی خوشی میں منایا جاتا ہے اور اِمرا دیوتا کی پوجا کے لئے وقف ہوتا ہے۔ دوسرا تیوہار جاڑوں میں منایا جاتا ہے اور جب چاروں طرف برف جمی ہوتی ہے اور کافر دن مرد برف پوش پہاڑوں پر چڑھ کر رنگ رلیاں کرتے ہیں۔ دونوں موقعوں پر شراب کے خم لنڈھتے ہیں اور خوب داد عیش دی جاتی ہے۔

جب کوئی کافر مرتا ہے تو اس کی لاش اِمرا دیوتا کے مندر میں لائی جاتی ہے۔ کافروں کے عقیدہ کے مطابق مردہ میں بھوت چھپا ہوتا ہے جسے دفن کرنے کے لئے پجاری بھانت بھانت کے کرتب کرتا ہے۔ آخر کار لاش ایک صندوق میں رکھی جاتی ہے اور مرنے والے کے لباس اور زیور یا آلات حرب کے ساتھ مہر بند کی جاتی ہے۔ یہ صندوق قبرستان میں زمین پر رکھدیا جاتا ہے اور اس کی نگرانی اِمرا دیوتا کا چوبی بت کیا کرتا ہے۔

کافروں کے ناچ دور دور کے علاقوں میں مشہور ہیں۔ ان میں زن و مرد بلا تکلف حصہ لیتے ہیں۔ ناچ رات کے وقت کسی الاؤ کے پاس ہوتے ہیں اور ان میں ولولہ اور بیخودی کی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو دوسرے پہاڑی ناچوں کی سست رفتاری سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا تفصیلی بیان میرے افسانہ "کافرستان کی شہزادی" میں ملیگا۔

غرض یہ کہ کافروں کی وادی دلچسپ ہے اور وہاں کے رہنے والے دل فریب۔ لاریب کہ ہم نے اس کوہ ندا کے اذن کو سنا اور اسکا دیدار کیا۔ ورنہ کون جانے کہ تہذیب کی روشنی کب ان کے بت خانوں کے چراغوں کو گل کردے اور وہ اپنی پرانی روایات کو بھول کر عام آدمیوں کا چولا پہن لیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک دلچسپ نمائش

آغا محمد اشرف

آکسفورڈ یونیورسٹی میں بوڈلیان لائبریری ایک بہت قدیم اور مشہور کتب خانہ ہے۔ اس کتب خانے کے پرانے اور تاریخی مسودوں کا ذخیرہ دنیا بھر کے علمی حلقوں میں مشہور ہے۔ اور ادب اور تحقیق کی جستجو میں علم کے پیاسے اکثر اس کتب خانے تک کھنچے چلے آتے ہیں۔

بوڈلیان لائبریری کے منتظموں نے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں قدیم مسودوں، مخطوطات اور نادر تصویروں کی چھان بین کر کے ایک بہت دلچسپ نمائش کی تھی۔ اس نمائش کا موضوع زمانہ قدیم میں کھیل کود تھا۔ بچوں کی تعلیم سے دلچسپی مجھے بھی لندن سے کھینچ کر آکسفورڈ تک لے گئی۔ اور کئی گھنٹے تک میں اس عجیب و غریب نمائش کا لطف اٹھاتا رہا۔

آجکل ہم اس لئے کھیلتے کودتے ہیں کہ کھیل کود سے ہمارے ذہن میں پھرتی آتی ہے۔ تھکے ہوئے دماغ کو آرام ملتا ہے۔ اور کھانے کے ذریعے سے بھوک لگتی ہے۔ لیکن یونان کا مشہور مورخ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے کہ جب لیڈیا میں قحط پڑتا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں نایاب ہو جاتی تھیں تو لیڈیا والے ایک خاص دن کھیل کود کے لئے مقرر کر دیتے تھے۔ تاکہ کھیل کود میں ان کا وقت گذر جائے۔ شہریوں کو بھوک نہ ستائے اور اس طرح کھانے پینے کا سامان کچھ اور دیر تک کام آسکے۔

چند ہزار سال کے اندر کھیل کود کے متعلق انسان کا نظریہ کس قدر بدل چکا ہے کہ آج لیڈیا والوں کا حال پڑھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے اور یونانی مورخ کے قول پر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کم از کم ایک بات کا پتہ ضرور چل گیا کہ کھیل کود موجودہ تہذیب کی ایجاد نہیں ہیں بلکہ انسان نے دنیا میں آتے ہی کھیل کود سے اپنا جی بہلانے کا سامان مہیا کر لیا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی تہذیب اور تمدن کی ترقی کے باوجود ہمارے بہت سے کھیل کود قدیم عہد کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ آکسفورڈ کی اس نمائش سے میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ بہت سے کھیل ہندوستان اور یورپ میں مشترک ہیں۔ خدا جانے یہ کھیل کود کب ایجاد ہوئے۔ انھیں کس نے ایجاد کیا۔ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ ہزاروں سال گذرنے کے بعد مشرق اور مغرب میں یہ کھیل اب بھی اسی حالت میں موجود ہیں۔ اگرچہ ایک زمانہ گذرنے کی وجہ سے ان کھیلوں کی تفصیل ذرا بدل گئی ہے۔ مگر ان کے اصول ہرگز نہیں بدلے۔

یورپ میں کھیلوں کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ کھیل جو گھر کی چار دیواری کے اندر کھیلے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ کھیل جو کھلے میدانوں میں کھیلتے ہیں۔ یورپ سرد ملک ہے۔ سردی کے موسم میں یہاں جب برف پڑتی ہے تو گھر سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے یورپ میں گھر کی چار دیواری کے اندر کھیلے جانے والے کھیلوں کا رواج بہت عام ہے اور ایسے کھیل لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ مثلاً سانپ اور سیڑھی والا کھیل کہ اب ہندوستان میں بہت عام ہے اور گھر گھر کھیلا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی لوگ اسے کئی سو سال سے کھیلتے آتے ہیں۔ ایک تختے پر ۱۰۰ خانے بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی خانے میں سیڑھی بنی ہوتی ہے اور کسی میں سانپ۔ کھیلنے والا پانسہ پھینک کر چال چلتا ہے۔ اگر اس کی گوٹ سانپ کے منہ میں پہنچ گئی تو سانپ اسے نگل کر دم کے خانے میں پھینک دیتا ہے۔ اور اگر اسے سیڑھی والا خانہ مل گیا تو یہ اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ کتب خانے کے ایک قدیم مسودے سے پتہ چلتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں رومن اس کھیل کو بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ اور راستے کھیلنے کے لئے طرح طرح کے دلچسپ نقشے بناتے تھے۔

ایک بات دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اس نمائش میں تاش، چوسر، گنجفہ اور شطرنج کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملا۔ قیاس کہتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یورپ میں ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا ورنہ ان کا ذکر کہیں ضرور آتا۔ اگر کوئی اور صاحب اس بارے میں میری رہنمائی کر سکیں تو میرا مضمون مکمل ہو جائے گا۔

کھیلوں کی دوسری قسم کھلے میدانوں میں کھیلی جاتی ہے۔ اور گھر کی چار دیواری والے کھیلوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی قسمیں بھی زیادہ ہیں۔ اس کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کھلے میدانوں میں کھیل کے موقعے زیادہ ملتے ہیں۔ باہر کھیلنے والے کھیلوں کو پھر دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کھیل جو انسان تنہا کھیل سکتا ہے۔ دوسرے وہ کھیل جس میں اوروں کی شرکت ضروری ہے۔

تنہا کھیلنے والے کھیلوں میں لٹو گھمانے کا کھیل یورپ میں بہت عام تھا۔ لٹو دو طرح کے ہوتے تھے ایک تو معمولی قسم کے کہ انہیں ڈور کے ذریعے سے گھمایا جاتا تھا اور دوسرے وہ جو چابک میں باندھ کر چھوڑے جاتے تھے۔ ایک تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ لٹو گھمانے

والوں کا آپس میں مقابلہ بھی ہوتا تھا کبھی ایک دائرے کے اندر بہت سے لٹو گھمائے جاتے تھے اور شرط یہ تھی کہ کسی کا لٹو دائرے سے باہر نہ نکلے۔ ایک تصویر میں ایک بچہ فخریہ طور پر گھومتا ہوا لٹو زمین سے اٹھا کر انگلی پر نچا رہا ہے اور سب اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ لٹو گھمانے کا کھیل ہندوستان میں بھی بہت عام ہے۔ ہمارے ہاں مٹی کے لٹو بھی گھمائے جاتے ہیں۔ مگر یورپ میں صرف لکڑی کے لٹوؤں کا رواج ہے۔ یہ کھیل پانسو سال قبل مسیح میں رومن بہت شوق سے کھیلتے تھے۔

اس تعلق سے پتہ چلا کہ یورپ میں سر کے بل کھڑے ہونا بھی ایک دلچسپ کھیل تھا یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس نے اس کھیل کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک یونانی مسخرے ہیپو کلے ڈلیس نامی نے شرط میں بادشاہ کی بیٹی جیت لی اور جب شاہزادی سے اس کی شادی کی ضیافت ہوئی تو عین ضیافت کے وقت مہمانوں کے سامنے یہ اپنے سر کے بل کھڑا ہو گیا اور ہوا میں ٹانگیں نچانے لگا۔ اس پر بادشاہ نے ناراض ہو کر شاہزادی کا اس سے بیاہ کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن یونانی مسخرے نے بادشاہ کے غصہ کی بالکل پرواہ نہیں کی بلکہ تمام مہمانوں کے سامنے یہ اسی طرح سر کے بل کھڑا رہا۔ ہوا میں یہ اپنی ٹانگیں نچاتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ میرے لئے سب برابر ہے۔ چاہے بادشاہ شاہزادی سے میرا بیاہ کریں چاہے نہ کریں۔ میرے لئے سب برابر ہے۔

یورپ میں پتنگ بازی کا کھیل بہت زیادہ پرانا نہیں۔ یہ اس کا پتہ سب سے پہلے ایک ۱۶۱۸ء کی تصویر سے ملتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح چین نے کاغذ ایجاد کیا تھا اسی طرح پتنگ اڑانے کا سہرا بھی چین والوں کے سر ہے۔ ایک کتاب کا مسودہ ۱۳۴۴ء کا لکھا ہوا اس کتب خانے میں محفوظ ہے اس کی تصویروں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ قدیم یونان میں بچے پھندوں۔ چڑیوں اور تتلیوں کو ڈورے میں باندھ کر اڑایا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پتنگ بازی کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ اب یورپ میں پتنگ اڑانے کا شوق بہت عام ہے۔ اگرچہ جنگ کے دوران میں پتنگ اڑانا قانونی طور سے بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ ایک تو پتنگ کی ڈور میں ہوائی جہازوں کے الجھنے کا خطرہ تھا۔ دوسرے گورنمنٹ کو ڈر تھا کہ کہیں غیر ملکی جاسوس اسی بہانے سے چھپا کر خبریں دشمن تک نہ پہنچا دیں۔

یورپ میں پتنگ بازی کے آداب اور قاعدے ہماری پتنگ بازی سے ذرا مختلف ہیں۔ اول تو ہمارے ہاں پتنگ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یورپ میں سب پتنگ ایک ہی جیسے سموسے کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور سے پتنگ بازی مکانوں کی چھت پر ہوتی ہے۔ یورپ میں گھروں کی چھتیں ہماری چھتوں کی طرح کھلی ہوئی نہیں ہوتیں اس لئے پتنگ باہر میدانوں اور کھیتوں میں اڑائے جاتے ہیں۔ تیسرے یورپ میں پتنگ لڑانے کا وہ زور نہیں جیسا کہ دہلی، لکھنؤ یا لاہور میں دیکھنے میں آتا ہے۔ وہاں تو بس پتنگ اڑا لیا اور دور سے اس کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اسی لئے غالباً انگریزی زبان میں ڈھیل، کھینچ۔ مانجھے اور سادے وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نہیں ملتیں۔

ہندوستان میں آپ نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دونوں ٹانگوں کے درمیان لکڑی کا گھوڑا بنائے بھاگتے ہوئے بہت دیکھا ہوگا۔ یہ شوق یورپ کے بچوں میں قرون وسطی سے چلا آتا ہے۔ اس عہد میں معمولی لکڑی کے سرے پر گھوڑے کا منہ بنا دیتے تھے اور کبھی کبھی اس کے منہ میں لگام بھی ڈال دی جاتی تھی۔ میں نے پندرھویں صدی عیسوی کے مصور کی ایک تصویر دیکھی کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بچپن میں اس قسم کے لکڑی کے گھوڑے پر سوار دکھایا تھا۔ اور ان کے ہاتھ میں تقدس کے لئے پھولوں کی ٹوکری بھی دے دی تھی۔ ہندوستانی بچوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یورپ میں بھی ان کے ہم عمر بچے لوہے کے چکر گھماتے تھے۔ اس کے گھمانے کی ترکیب وہی تھی جو ہندوستان میں رائج ہے۔ یعنی لوہے کے گھیرے کو زمین پر گھماتے ہیں اور بچہ لکڑی کے ٹھوکے سے اسے آگے لڑھکانے کی کوشش کرتا ہے اور گھیرے کے ساتھ ساتھ بھاگتا بھی جاتا ہے۔

وہ کھیل کہ جسے بہت سے بچے مل کر کھیلتے ہیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں۔ یورپ میں فٹ بال کا کھیل بہت پرانا ہے اور اسے بڑے میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ لیکن آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کھیل کی ابتدا گلیوں اور کوچوں میں ہوئی تھی۔ شروع میں تو یہ کھیل ایسی بے رحمی سے کھیلا جاتا تھا کہ اس کھیل میں اکثر بچے مر تک جاتے تھے۔ اس لئے ۱۳۲۴ء میں برطانوی گورنمنٹ نے ایک خاص قانون کے ذریعے فٹ بال کا کھیل ممنوع قرار دے دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ پادریوں نے فٹ بال کے خلاف بہت شور مچایا اور کہا کہ اس کھیل میں بچے لہولہان ہو جاتے ہیں اور خلق خدا کی جانیں بے کار ضائع ہوتی ہیں۔ اس کھیل کی اصل بھی ہمیں رومن عہد میں ملتی ہے۔ مگر اب اسے انگریزوں نے ایسا اپنایا ہے کہ فٹ بال اور کرکٹ ان کے قومی کھیل بن گئے ہیں۔

کرکٹ کی ابتدا تاریخ کے دھندلکے میں کہیں صاف نظر نہیں آتی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کھیل سکندر کے زمانے میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں ہمیں کرکٹ کا ذکر سب سے پہلے ۱۳۰۰ء میں ملتا ہے۔ لیکن اس وقت کی کرکٹ اور موجودہ کرکٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک قدیم مسودے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانے

کرکٹ پر گھوڑ دوڑ کی طرح شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ اور ایک دفعہ اس پر ایک ہزار گنی تک کی بازی لگائی گئی تھی۔ اس ابتدائی دور میں سکور کے تختے یا بورڈ پر نمایاں لٹکانے کی بجائے لکڑی پر چاقو سے تراشا جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ ایک آدمی لکڑی اور چاقو لئے بیٹھا رہتا تھا اور ہر رن کے بعد لکڑی پر ایک نشان بنا دیتا تھا۔

یورپ میں برف پر پھسلنے کا مشغلہ بھی عام ہے۔ جب پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے تو ایک خاص قسم کے جوتے پہن کر لوگ اس پر پھسلتے ہیں۔ ہر سال سوئٹزرلینڈ میں دور دور سے لوگ اس کھیل کا لطف اٹھانے کے لئے آتے ہیں۔ قدیم مسودوں سے پتہ چلتا ہے کہ برف پر پھسلنے کا کھیل بہت پرانا ہے۔ انگلستان میں برف پر ہاکی بھی کھیلی جاتی ہے۔ برف کے علاوہ اب ہاکی سبز میدانوں میں بھی عام طور سے کھیلی جانے لگی ہے۔ ہندوستان میں ہاکی کے کھیل نے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہمارے ہاں ہاکی سال بھر کھیلتے ہیں مگر انگلستان والے ہاکی صرف سردی کے موسم میں کھیلتے ہیں۔

اس نمائش میں سب سے زیادہ لطف مجھے آنکھ مچولی کے کھیل کی تصویریں دیکھ کر آیا۔ یہ کھیل اس قدر مقبول تھا کہ بچوں کے علاوہ بڑے بھی اس میں شوق سے حصہ لیتے تھے۔ ایک بچے کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا۔ سب بچے اس کے چاروں طرف اپنے اپنے رومال ہلا رہے ہیں اور یہ انھیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

روم کے بادشاہ نیرو کے زمانے میں ایک اور کھیل ٹک ٹک ایجاد ہوا تھا۔ اس میں ایک بچہ گھوڑا بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ دوسرا اس کی کمر پر سوار ہو کر پوچھتا۔ ٹک ٹک کتنی انگلیاں اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ کی انگلیاں بھی اٹھا دیتا۔ گھوڑا بنا ہوا بچہ اندازے سے اس کی انگلیوں کی تعداد بتاتا اور جب تک اس کا اندازہ درست نہ نکلتا اسی طرح گھوڑا بنا سواری دیتا رہتا۔ اسی سے ملتا جلتا ایک کھیل اور بھی ہے۔ ایک بچہ گھوڑا بن کر اپنا ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھتا ہے اور آنکھیں میچ لیتا ہے۔ دوسرے بچے باری باری سے آ کر اس کا ہاتھ چھوتے ہیں اور یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اس کا ہاتھ کس نے چھوا۔

گولیاں کھیلنے کا شوق ہندوستان کی طرح یورپ میں بھی ہے اور یہ کھیل بچوں میں بہت مقبول ہے۔ مگر ہندوستان کے گلی ڈنڈے اور کبڈی کا کہیں مجھے نشان نہ ملا۔ البتہ کشتی لڑنے کا شوق ایک زمانے سے یورپ میں چلا آتا ہے۔ غرض بہت سے کھیل ایسے ہیں جو مشرق اور مغرب میں یکساں کھیلے جاتے ہیں اور اس قدر زمانہ گزرنے کے باوجود ان کی نوعیت میں فرق نہیں آیا۔ اب زمانے نے ترقی کر لی مشینوں کا زور ہے اس لئے کھیلوں میں نئی نئی اختراعیں اور ایجادیں ہو رہی ہیں اور ان پہ بے دریغ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے پرانے کھیل کود کی خوبی یہ تھی کہ ان میں خرچ نام کو بھی نہیں تھا۔ کھیلنے والوں کو لطف اتنا ہی آتا تھا اور ان کی ورزش بھی خوب ہو جاتی تھی۔

کھیل کود کا ایک نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ بچے کھیل میں ہمیشہ اپنے بڑوں کی نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ چور سپاہی اور عدالت کا کھیل۔ بچیوں کی گڑیاں اور گڑیوں کی شادی بیاہ کا کھیل یہ سب باتیں اسی نفسیاتی نکتے کی تفصیل ہیں۔ دوسرے کھیل کے ذریعے انسان بہت سی کام کی باتیں بھی سیکھ جاتا ہے۔ دلیری۔ جوش۔ ولولہ۔ اپنے ساتھیوں سے وفاداری۔ سچائی اور ہمت نہ ہارنا یہ سب اوصاف کھیلوں کے ذریعے بچوں کی فطرت بن سکتے ہیں۔ اس لئے موجودہ زمانے میں کھیل کود کو تعلیم کا ایک بہت ضروری جزو سمجھا جاتا ہے۔

تصحیح

جناب فکر تونسوی کی نظم اسی شمارے کے صفحہ ۲۵ پر ہدیہ قارئین ہے۔ اس کا عنوان "چہرے" نہیں "مہرے" ہے۔ مہربانی کر کے تصحیح فرمائیں۔ ادارہ معذرت خواں ہے۔

بصرہ سے طہران تک

(سنہ ۱۹۳۹ء میں)

محمد باقر

بغداد سے گاڑی پر سوار ہو کر صبح آٹھ بجے کے قریب بصرہ پہنچا۔ کسی نے کہا بصرہ سے سمندری جہاز پر سوار ہو کر ایران جائیں تو کئی دن لگ جائیں گے کیونکہ بصرہ اور ایران کی بندرگاہ محمرہ کے درمیان جہاز ہفتہ میں صرف ایک بار چلتا ہے۔ یہ جہاز محمرہ سے جمعرات کے روز نکلتا ہے اور ہفتہ کے روز پھر واپس پہنچ جاتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ دریائی کشتی (بلم) میں شط العرب کو عبور کرکے عراق سے ایران پہنچ جائیں۔ وقت بھی بچ جائے گا اور دام بھی۔ جہاز میں کرایہ ۲۵ ریال لگتا ہے۔ مشورہ معقول تھا اور مشورہ دینے والے کی نیت بھی ٹھیک تھی۔ لیکن بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا ان کی اطلاع درست نہ تھی۔ بصرہ یعنی جس مقام سے شط العرب کو عبور کرنے کے لئے بلم چھ فلس (پیسے) میں مل جاتی ہے بشرطیکہ ملاحوں سے سودا چکانے کا صبر آپ میں ہو۔ وہ ساٹھ فلس سے شروع کرتے ہیں اور بالآخر چھ فلس پر ہی راضی ہو جاتے ہیں۔ بلم میں بیٹھ کر چند منٹوں میں شط العرب کو عبور کرکے میں دریا کے دوسرے کنارے تنومہ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ آزاد علاقے میں ہے اور یہاں ایک دو دو کانیں ہیں۔ بس انہی دو دکانوں کی بستی کا نام ہی تنومہ ہے۔ یہاں ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ایک ٹیکسی ملی جس سے ۵ تومان (۵۰ ریال۔ ۹ روپے) میں محمرہ تک پہنچنے کے لئے ایک نشست ملی۔ یہ سودا بہت مہنگا تھا۔ محمرہ تنومہ سے ۱۲ میل تھا اور اس فاصلے کے لئے یہ اجرت بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا۔ میں نے تو ایک نشست کا کرایہ طے کر لیا تھا۔ باقی کی تین نشستوں کے لئے کچھ عرب کافی دیر تک تکرار کرتے رہے۔ اور کئی گھنٹوں کی بحث کے بعد یہ ٹیکسی تنومہ سے روانہ ہوئی۔

تھوڑی دور چل کر ایران کی سرحد شروع ہوئی۔ پہلے ایک مقام پر میرا پاسپورٹ دیکھا گیا اور کچھ آگے چل کر کسٹم والوں نے میرا سامان دیکھا۔ سہ پہر کے قریب ہم محمرہ پہنچ گئے۔

محمرہ ایران کی ایک اہم بندرگاہ ہے۔ اعلیٰ حضرت رضا شاہ کے زمانے میں نام بدل کر خرم شہر رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک دونوں نام زبان زد عوام ہیں۔ بندرگاہ کی آبادی بہت قلیل اور بستی چھوٹی سی ہے۔ کل پانچ ہزار لوگ آباد ہیں۔ لیکن یہ بستی ہے بہت خوش حال۔ اسی بندرگاہ سے تھوڑی دور شط العرب میں جہاز رک کر سامان تجارت اتارتے اور لادتے ہیں۔ یہ شہر اس وقت اس جگہ آباد ہے جہاں اس سے پہلے کئی شہر آباد ہوئے اور دریا کے سیلاب کی نذر ہو گئے۔ لیکن اب دریا کے سامنے بند باندھ دیا گیا ہے۔ اور اب شہر سیلاب کے خطرہ سے محفوظ ہو گیا ہے۔ دریا کے اسی بند پر ایک شام بجلی کی روشنی میں سیر کرتے ہوئے ایک ایرانی دوست نے بتایا کہ اس وقت جہاں ہم چل رہے ہیں چند سال پہلے رہزنوں کے خوف سے کوئی آدمی اس وقت باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلے شاہ ایران ہیں جنہوں نے اس علاقہ کو زیر نگیں کرکے محفوظ کر دیا ہے ورنہ یہاں دلدل اور جنگل ہوتا تھا جو ڈاکوؤں کو پناہ دیا کرتا تھا۔

خرم شہر میں کوئی ہوٹل نہیں۔ لیکن اینگلو ایرانین کمپنی کا ایک مسافر خانہ ہے۔ مجھے بھی اسی میں پناہ ملی۔ میرا یہاں سے ارادہ اہواز پہنچنے کا تھا۔ جہاں سے اوپر شمال کی طرف اور ایران کے دارالخلافہ تک پہنچنے کے لئے گاڑی مل سکتی تھی۔ لیکن خرم شہر سے جب تک ٹیکسی نہ ملے اہواز پہنچنا ناممکن تھا۔ آخر تین روز کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے ایک افسر کی موٹر نے مجھے اہواز تک پہنچا دیا۔ ہم خرم شہر سے آٹھ بجے صبح روانہ ہوئے۔ پہلے میل میں دریائے کارون کو کشتی میں عبور کرنا پڑا۔ اس سے آگے راستہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی تیل کی نالی کے ساتھ ساتھ جاتا ہے خرم شہر سے اہواز ۱۲۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے اور عام حالات میں موٹر پر یہ فاصلہ ساڑھے تین گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔ لیکن ہماری موٹر کا ٹائر بیٹھنے کی وجہ سے ہم پانچ گھنٹے میں اہواز پہنچے۔ جہاں ٹائر بیٹھا وہاں پاس ہی انگوروں کا ایک باغ تھا۔ میرے میزبان نے سارا وقت انگوروں کا بھاؤ بنانے اور انگور خریدنے میں صرف کر دیا۔ تاہم ہم سہ پہر کے قریب اہواز پہنچ گئے۔

اہواز میں خیابان پہلوی کے ایک ریسٹوران میں ہم دم لینے کے لئے رکے۔ موٹر کا تھرمامیٹر ۱۲۳ انچ کا نمبر بتا رہا تھا۔ راستہ کے صحرا کی خاک اور گرمی سے بدن جھلس چکا تھا اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ اہواز صوبہ خوزستان کا صدر مقام ہے اور اس کا وائسرائے بھی یہیں رہتا ہے۔ اس وقت اس شہر کی آبادی تیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ناصر الدین شاہ نے اپنے عہد حکومت (۱۸۴۸ء ——— ۱۸۹۶ء) میں دریائے کارون کے جنوب میں اس شہر کو آباد کیا تھا اور اس کا نام ناصری رکھا تھا۔ لیکن ناصری برباد ہو کر مٹ مٹا گیا ہے اب شہر کارون کے

شمالی ... رے پر آباد ہے اور یہیں ریلوے سٹیشن ورکشاپ اور ہوائی جہازوں کا اڈہ بھی ہے۔ شمال میں ریل یہاں سے بندر شاہ تک جاتی ہے اور جنوب میں بندر شاپور تک۔ یہاں نے اوہنے شہر کے درمیان دریا کے اوپر ایک طویل پُل ہے۔ اس پل پر سے موٹریں بھی گذرتی ہیں اور ریل بھی۔

اہواز میں بھی اچھے ہوٹلوں کی کمی ہے لیکن خالص ایرانی کھانا آپ کو یہاں سے ملنا شروع ہو جاتا ہے گو یہاں کی آبادی کی بولی فارسی ملی ہوئی عربی ہے۔ رسٹوران میں کچھ دیر سستانے کے بعد اطلاع ملی کہ اگر طہران جانے کا مقصد ہے تو شام کے سات بجے سے پہلے پہلے گاڑی کا ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ گو گاڑی ساڑھے دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ ایک اور اطلاع بھی ملی کہ اس روز گاڑی طہران جا بھی رہی تھی۔ ہفتہ میں گاڑی صرف ایک مرتبہ بندر شاپور سے بندر شاہ تک جاتی تھی اور اسی طرح بندر شاہ سے بندر شاپور تک واپس آتی تھی۔ اس کی وجہ تو سمجھ میں آگئی کہ صرف ایک ریلوے لائن ہونے اور مسافروں کی کمی کے باعث اس سے زیادہ مرتبہ گاڑی چلانا مفید نہ تھا۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ ساڑھے تین گھنٹے پہلے ٹکٹ خریدنا کیوں ضرور تھا۔ بہرحال ٹیکسی سے کر سٹیشن پر پہنچا اور طہران کا ٹکٹ خرید لیا ۱۰۸۰ میل کے فاصلے کے لئے سیکنڈ کلاس پر ۲۱ تومان یعنی تقریباً ۳۵ روپے خرچ آئے۔ یہ کرایہ کچھ زیادہ نہ تھا۔

ٹکٹ خرید کر میں ہوٹل میں واپس چلا آیا۔ اور شام کو اہواز کے باغ میں سیر کرنے چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت قطعہ زمین ہے جس میں خوبصورت درخت اور پھول اگائے گئے ہیں۔ باغ کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا رسٹوران ہے اور دوسرے کونے میں اعلیٰ حضرت رضا شاہ کا ایک دھات کا مجسمہ نصب ہے جو رات کو بجلی کی روشنی میں بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کثرت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ یورپین لباس پہنے ہوئے تھے اور لڑکیاں اور لڑکے بے تکلفی سے ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور رسٹوران کے قریب تفریح میں مشغول تھے۔

باغ سے لوٹ کر کھانا کھایا اور دس بجے کے قریب ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ایرانی ریل انجینئرنگ کا ایک معجزہ ہے۔ اس کی داغ بیل ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ڈالی گئی اور ۱۹۳۸ء میں ایرانی حکومت اور برلین کی دو تین کمپنیوں کی مدد سے یہ ریلوے لائن ایران کے شمال سے لے کر جنوب تک بنا دی گئی۔ ریلوے لائن کی تعمیری مشکلات کا اندازہ ان حقائق سے ہو سکے گا کہ یہ ریلوے لائن ۱۳۹۲ کیلو میٹر لمبی ہے اور کوہ البرز میں یہ ۲۲۱۵ میٹر اونچی پہاڑیوں پر سے گذرتی ہے۔ اس راستے میں پہاڑ کاٹ کاٹ کر ۲۲۴ سرنگیں بنائی گئی ہیں اور ان میں سے بعض سرنگیں کئی کئی میل لمبی ہیں۔ ان سرنگوں کے علاوہ مختلف پہاڑیوں کو ملانے کے لئے ۴۱۰۹ پل بنائے گئے ہیں۔

گاڑی میں بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ ایسی گاڑی سارے یورپ میں کہیں نہیں۔ چھت کی تیلیوں سے لے کر زمین کے فرش تک اتنی قیمتی خوبصورت اور آرام دہ چیزیں استعمال کی گئی تھیں کہ یورپ والوں کو بھی میسر نہیں۔ بعد میں اور چیزوں کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ اعلیٰحضرت رضا شاہ کا تعمیری جذبہ ایران کے تمام تعمیری کاموں میں نہایت بلند مطمح نظر کا پیش خیمہ ہوا کرتا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی نگرانی میں ایران میں جو چیز بھی بنوائی وہ آئیڈیل از تعمیر کا نمونہ تھی۔ اس سلسلہ میں ایک دو باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ریلوے لائن اور گاڑی کے عدیم النظیر کارنامے کے علاوہ طہران میں اعلیٰ حضرت نے ایک عجائب خانہ (میوزیم) بنوایا جس کے اندر کھڑے ہوکے مجھے اکثر یہ محسوس ہوا کہ اس کے اندرونی منظر کی نفاست کے سامنے برٹش میوزیم کی رعنائی ہیچ تھی۔ اور اسی طرح جب طہران کے شہر کو خوبصورت بنانے کا خیال آیا تو اعلیٰ حضرت نے ایک نقشے پر پہلے ایک سمت میں متوازی لکیریں کھینچیں اور طہران کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہوئی اور لکیریں کھینچ دیں اور انجینیروں کو حکم دیا کہ طہران کے بازار نقشے کے خطوط مستقیم کے مطابق بنا دو۔ چنانچہ جب میں طہران پہنچا تو بہت سی عمارات گرا کر اس حکم کی تعمیل کی جا رہی تھی اور اب یہ حال تھا کہ سب نئے بازار اس خط مستقیم میں تھے کہ آپ ایک سرے پر کھڑے ہو کر بازار کے دوسرے سرے تک دیکھ سکتے تھے۔

ایران کی گاڑی کا انجن تیل سے چلتا ہے۔ پہلا پہل تو اس کے دھوئیں سے کافی پریشانی ہوئی اور متلی ہونے لگی لیکن جب میں نے کھڑکیاں بند کر کے پردے گرا دئے تو اس پریشانی سے نجات مل گئی۔ گاڑی چلنے سے پہلے ایک ایرانی اپنی اہلیہ سمیت میرے ڈبے میں آگئے۔ یہ بھی طہران جا رہے تھے اور نظامیہ کالج (فوجی درسگاہ) میں پروفیسر تھے۔ شام کو تو ایسے ہی سو گئے۔ صبح اٹھے تو آپ سے تعارف ہوا اور ایران اور ایرانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث رہے۔ دونوں میاں بیوی نہایت متواضع اور شائستہ تھے۔ ایران میں ترک پردہ کا ذکر آیا تو پروفیسر صاحب ایک لمبی آہ بھر کر بولے "میں جب ترقی یافتہ ایران کی طرف دیکھتا ہوں اور زندگی کی ان آسائشوں سے محظوظ ہوتا ہوں جو دور جدید کی بدولت ہم تک پہنچی ہیں تو بہت ہی خوش ہوتا ہوں، لیکن کاش کہ یہ انقلاب چار سال پہلے آیا ہوتا جب کہ میں نے شادی کی تھی، صرف تین سال پہلے ہم نے پردہ ترک کیا ہے۔ اگر میری شادی کے وقت پردہ ترک ہو چکا ہوتا تو میرے لئے قسمت

آزمائی کرنے کا میدان بہت وسیع اور موزوں ہوتا۔ پروفیسر کی بیوی مسکرا کر ان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور میں کچھ محجوب سے انداز میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ پروفیسر صاحب کی شکایت کے باوجود ان کی بیوی نہایت حسین اور شائستہ تھی۔ میں ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ پروفیسر صاحب کی بیوی بولیں "ہاں ہمت آزمائی کرنے کا میدان تو ضرور وسیع ہوتا لیکن ہم بھی آج کل کی لڑکیوں کی طرح منہ میں زبان رکھتے تو کم از کم آپ کے ستے نہ چڑھتے" اس پر ہم سب نے قہقہہ لگایا۔ گاڑی کے کھانے کا کمرہ اسے ملازم بار بار آکر مختلف قسم کے کھانے لگے مجھے دیتا رہا اور کھانے کی فرمائش کا منتظر رہا۔ مگر پروفیسر صاحب نے ایک تو اس پر اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور دوسرے مجھے یہ تلقین کرتے رہے کہ ہوٹل سے کھانا نہیں کھانا چاہئے کیونکہ وہاں غذا اچھی نہیں ملتی۔ معلوم نہیں ان کے بیان کا آخری حصہ کس حد تک درست تھا لیکن ان کا اصرار اس قدر پرخلوص اور شدید تھا کہ میں انھیں کے ساتھ وہ کھانا کھاتا رہا جو وہ گھر سے اپنے ساتھ پکا کر لائے تھے۔ یہ خوراک سفید سینڈوچوں اور ان سے بھی زیادہ سفید پنیر اور کھیروں پر مشتمل تھی لیکن اس قدر لذیذ کہ میں نے اپنی عمر میں اتنا لذیذ کھانا کم کھایا ہے۔

اگلی شام کے چھ بجے گاڑی قم کے سٹیشن سے گزری۔ یہ ایران کے ان مقدس شہروں میں سے ہے جن کو شیعہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ امام موسیٰ الکاظم کی بیٹی فاطمہ معصومہ کا مزار یہاں ہے۔ ۸۱۶ء میں آپ جب اپنے بھائی امام علی الرضا سے ملنے طوس جا رہی تھیں تو راستے میں ساوہ کے مقام پر بیمار ہوئیں۔ وہاں سے آپکو قم لایا گیا لیکن علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا اور آپ نے یہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔ فاطمہ معصومہ کا مزار قم کا خوبصورت ترین مزار ہے گاڑی میں سے بہت فاصلہ سے اس مزار کا سنہری گنبد نظر آنے لگتا ہے۔ میرا ارادہ تو ہوا کہ قم رک جاؤں لیکن یہ خوف دامنگیر تھا کہ پھر ایک ہفتہ تک گاڑی نہیں ملے گی۔ اس لئے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

ٹھیک چوبیس گھنٹے سفر کرنے کے بعد رات کے ساڑھے دس بجے طہران کے ریلوے سٹیشن پر پہونچے۔ یہ سٹیشن کیا تھا۔ ایران کی خوبصورت عمارتوں کا بہترین نمونہ تھا۔ تعجب ہوا کہ ہفتہ میں ایک ٹرین گاڑی گزارنے کے لئے اس قدر صرف کثیر سے یہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سٹیشن پر کل لاگت دس لاکھ پونڈ آئی تھی۔ اور ۱۹۳۷ء میں ۱۹ فروری کو اعلیٰ حضرت نے خود اس کا افتتاح کیا تھا۔

پروفیسر صاحب کے مشورہ پر میں گاڑی سے اتر کر مہمان خانہ قصر (The Palace Hotel) میں مقیم ہو گیا۔ یہ ہوٹل طہران کے ایک خوبصورت بازار خیابان اسلامبول میں انگریزی سفارت خانے کے بالکل قریب واقع ہے۔ رات کو تو سفر کی تکان دور کی اور اپنے کمرے میں جاتے ہی سو گیا۔

صبح اٹھا تو ناشتہ کرنے کے لئے کھانا کھانے کے کمرہ میں گیا۔ یہاں پھر یورپ یاد آگیا۔ ہوٹل کا گول کمرہ مہمان خانہ اور ناچ کا کمرہ یورپ کے بہترین ہوٹلوں کو شرمندہ کرتا تھا۔ اور کھانے کی عمدگی کی تعریف ممکن نہیں۔ ایرانی نہایت اچھے کھانے پکاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ چونکہ کم نمک استعمال کرتے ہیں اور سرخ مرچ بالکل استعمال نہیں کرتے اس لئے یورپ سے آنے والے مسافر کے کام و دہن کو یہ خوراک بہت پسند اور معدہ کو بہت راس آتی ہے۔ ہاں ایک بات ضرور تھی کہ ملازم بڑے بے سلیقہ تھے۔ ہوٹل میں معدودے چند ہی مہمان تھے لیکن ملازموں کا یہ حال تھا کہ صرف ایک ہی مہمان پر گرے پڑتے تھے۔ جو ملازم تھا وہ ایک آدمی کے لئے ہی سب چیزیں دوڑا لئے آرہا تھا۔ اور دوسرے مہمان نہایت خوبصورت اور سلیقہ سے چنے ہوئے میزوں پر بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے۔ جب ایک مہمان کا کھانا ختم ہو جاتا تو ملازم دوسرے مہمان پر پل پڑتے اور یہاں بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز ایک ہی مہمان ہوتا۔ چند دنوں کے بعد جب میں ان کے اس سلوک اور اس روش سے مانوس ہو گیا تو میں سویرے کھانے پر دوسرے لوگوں سے ذرا پہلے پہنچ جاتا اور پھر جب تک میں سیر نہ ہو لیتا دوسرے لوگ کھانا نہ کھاتے۔

طہران ۳۷۵۰ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں تھوڑی ہی دور کوہ البرز کی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جنوب کی نسبت اس شہر میں سردی زیادہ ہوتی ہے اور گرمیوں میں بھی موسم خوشگوار رہتا ہے۔ میں جولائی۔ اگست میں اکثر شام کو گرم کپڑے پہن لیتا تھا گو سوتی کپڑوں سے بھی کام چل جاتا تھا۔ طہران کے شمال مشرق میں ۵۶ میل کے فاصلہ پر کوہ دماوند ہے۔ لیکن طہران کے میدانوں میں اس پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں نظر آتی رہتی ہیں۔ طہران کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو قصہ طویل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو کسی اور فرصت پر اٹھا رکھا جاتا ہے۔

قارئین آجکل سے

آپ کی رایوں نے ہمیشہ آجکل کی ہمت افزائی فرمائی ہے۔ اور آپ کے مشورے برابر اس کی رہبری کرتے رہے ہیں۔ آجکل کو اب بھی اس رہبری اور ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ اسلئے براہ کرم سالنامہ پڑھ کر اسکے متعلق اپنی رائے کا اظہار ضرور فرمائیے۔ (ادارہ)

مشرقِ وسطیٰ میں موسیقی

شاہد احمد دہلوی

موسیقی کسی نہ کسی شکل میں ہر ملک میں موجود ہے، حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جہاں تہذیب و تمدن کی روشنی ابھی تک نہیں پہونچی ہے۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ موسیقی ایک فطری پیداوار ہے اور نتیجہ ہے ایک ایسی ضرورت کا جو کسی طرح ٹالی نہیں جاسکتی۔ گانا بجانا اور ناچ اظہار کے وہ موثر طریقے ہیں جو دل بہلانے کے ساتھ ایک طرح کی باقاعدگی کی طرف بڑھنے کا اشارے بھی ہیں۔ موسیقی نسلِ انسانی کی ایک بنیادی خواہش ہے جس نے ہر ملک میں ایک معیار ادب دکھا رکھا ہے۔

اپنے ملک کی موسیقی کے علاوہ اور کسی ملک کی موسیقی سے لطف اندوز ہونا اس وقت تک ممکن ہے جب تک اس کی فہم کی صلاحیت اپنے مزاج میں پیدا نہ کی جائے۔ آب و ہوا، رسم و رواج اور دوسری تبدیلیوں اور بیرونی اثرات کی وجہ سے ہر ملک کی موسیقی ایک نئے ڈھنگ سے شکل ہوتی رہی ہے۔ موسیقی بنیادی طور پر ایک معاشرتی تعیش ہے۔ خواہشِ حیوانی اس کے محرک ہیں اور ذہنی کی آسودگی اس کا مقصد۔ اعصاب کو سکون پہنچانا اور روح میں تازگی و بالیدگی پیدا کرنا موسیقی کی غایت ہے۔ موسیقی میں گانا، بجانا اور ناچنا سب شامل ہیں اور ہماری معاشرت سے ان کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ موسیقی سے وابستہ نہ ہو۔ تیج تہواروں پر، شادی بیاہ میں، کام کاج میں، خوشی اور غمی میں، غرض پیدائش سے موت تک ہر موقع اور ہر سمے کے گیت گائے جاتے ہیں۔ کام کی مشقت کو کم کرنے میں، شکار میں، جنگ میں اور عبادت تک میں موسیقی کو دخل ہے۔ جسمانی اور ذہنی ردعمل دیکھنے کی چیز ہے کہ کس طرح موسیقی کے زیر اثر انسان مسحور یا بےخود ہو جاتا ہے۔ موسیقی کی عظیم الشان قوتوں سے اگر صحیح مصرف لیا جائے تو اس کے حیرت ناک نتائج بجائے خود اعجاز ثابت ہوں گے۔

جس طرح ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک کے آدمی سے اپنے فطری خصائص کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک ملک کی موسیقی دوسرے ملک کی موسیقی سے اپنے زیر و بم کی بنا پر علیحدہ ہوتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی موسیقی میں آجکل کے زمانے میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے لیکن اگر اسکی موجودہ ہیئت کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اثرات صاف نمایاں ہو جاتے ہیں جن سے اسکی تشکیل ہوئی ہے۔ عبرانی، سریانی، یونانی، مصری اور عربی موسیقی سب کے جداگانہ اور مخصوص اصول تھے جو خلط ملط ہو کر جدید موسیقی کے اجزائے ترکیبی بن گئے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی قدیم موسیقی کی خصوصیات حتی الوسع بیان کی جائیں۔

بابل اور آشور — قدیم عراقی موسیقی

قدیم عراقی موسیقی کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہوتی ہے۔ نقاشی کے بعض نمونوں میں چند ساز دکھائے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ گانے اور ناچنے کا رواج عام رہا تھا۔ مذہبی اور معاشرتی تہواروں پر جلوسوں اور جلسوں میں فنکاروں کی ٹولیاں اور طائفے شریک ہوتے تھے۔ عراقی موسیقی کا مندروں کی سرپرستی میں پروان چڑھی اور انہی کے زیر اثر رہی۔

جن سازوں کی تصویریں ملی ہیں ان میں بربط اور قانون کی نسل کے ساز ہیں، سارنگی ذات کے کئی ساز ہیں، بانسریوں کے جوڑے ہیں۔ نفیر اور ڈھول ہیں۔ تار کے سب ساز انگلیوں کے پوروں سے یا مضراب سے چھیڑ کر بجائے جاتے تھے۔ عراقی بربط یونانی بربط سے مشابہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل ہی کے سازوں سے یونانیوں نے استفادہ کیا۔ ستار کی ذات کے ساز ہندوستان کے ستار سے بہت مشابہ ہیں۔ عراقی موسیقی کے ساز بابل کے قدیم سازوں ہی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

عبرانی موسیقی

عبرانیوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عرب میں ہوئی لیکن جغرافیائی اعتبار سے ان کے ڈانڈے ایک طرف تو عراق سے اور دوسری طرف مصر سے ملتے تھے۔ بنی اسرائیل تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں دوسروں کے نقال رہے ہیں اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی موسیقی بھی دوسروں سے مستعار لی گئی تھی۔ عبرانی موسیقی کا جتنا مواد ہے سارا کا سارا "کتاب قدیم" سے حاصل کیا گیا ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے کوئی تحریری ثبوت عبرانی موسیقی کا نہیں ملتا۔ اس سے پہلے کی جو تحریریں ملتی ہیں ان میں موسیقی کا کوئی ذکر نہیں۔ روایت ہے کہ ایک ہزار سال قبل مسیح بعض پیغمبروں نے موسیقی کو مذہبی سرخوشی کا آلۂ کار بنایا۔ ۹۵۰ قبل مسیح میں ان کا پہلا کنشت تعمیر ہوا تو غالباً موسیقی نے عبادت میں دخل پایا ہوگا لیکن ترنم سے زیادہ اسکی حیثیت اس وقت نہیں ہوگی۔ البتہ جب ۵۳ [illegible] قبل مسیح میں ان کا دوسرا کنشت بنا تو اس میں ایسے گانے والے شریک تھے جو سازوں کے ساتھ گاتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ کتاب حمد ترتیب دی گئی۔ عبرانیوں کی معاشرت میں موسیقی ضرور رائج ہوگی لیکن اس کے متعلق کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ صرف قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں۔ گانے غالباً کئی کئی آدمی مل کر گاتے تھے۔ ان کی آوازیں اونچی اور کرخت تھیں اور ... ان میں ہم آہنگی نہیں پائی تھی۔ غالب یہ ہے کہ ترنم یا لحن سے زیادہ ان کی موسیقی کی حیثیت نہیں تھی۔ مذہبی گانوں میں بعض قسم کے ناچ شامل تھے۔ حمد و ثنا کے

ساتھ بعض دھنوں کے نام ہی لکھے ملتے ہیں۔ لیکن وہ دھنیں کیا تھیں؟ ان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ کئی سازوں کے نام بھی درج ہیں لیکن چونکہ ان کی تصویریں نہیں بنائی گئیں اس لئے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ان کی شکلیں کیسی تھیں اور ان کے بجانے کے کیا کیا طریقے تھے۔ ایک ساز کا نام "کنور" ہے جو غالباً بربط کی شکل کا ہوتا تھا، دوسرا "نیبل" جو کمان کی شکل کا تھا اور اس کے تار چھیڑ کر اسے بجایا جاتا تھا۔ بانسری کی شکل کا ایک ساز تھا جس کا نام "خلیل" تھا۔ دونوں قسم کی نفیریاں تھیں اور کچھ نقارے اور جھانجھ کی شکل کے ساز۔

زمانہ مابعد میں کنشتوں کی جب اہمیت بڑھ گئی تو موسیقی نے بھی ان میں مستقل جگہ پالی اور ۷۰ء میں جب یروشلم فتح ہو گیا تو یہودی جہاں جہاں بھی گئے اپنے کنشت بنانے گئے اور یوں ساری دنیا میں ان کے کنشتوں کے ساتھ ان کی موسیقی بھی پھیلی۔ کنشتوں میں جب یہ حمد و ثنا کرتے ہیں تو کتاب حمد کی کوئی حمد نغمے کے ساتھ گاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ وہی روایتی دھنیں گاتے ہیں جو قدیم سے مروج و مخصوص ہیں۔ لیکن چونکہ رواج میں جو دھنیں ہیں وہ ایک ملک کی دوسرے ملک کی کنشتی دھنوں سے نہیں ملتیں اس لئے یہ روایت بھی صحیح نہیں مانی جا سکتی۔ عبرانی موسیقی کی تاریخی اہمیت اس میں نہیں ہے کہ اصل عبرانی موسیقی کیا تھی بلکہ اس میں ہے کہ عبرانی موسیقی کی مذہبی وابستگی نے عیسائیوں کے خیالات و رسوم کو اس درجہ متاثر کیا کہ عیسائی بھی اپنے کلیساؤں میں انہیں کے پیروکار ہو گئے۔ زمانہ حال میں بعض یہودیوں نے یورپی موسیقی میں مجتہدوں کا درجہ حاصل کیا ہے اور کنشتی موسیقی سے بعض بڑی دل پذیر دھنیں تیار کی گئی ہیں۔

مصری موسیقی

یہ ثابت ہے کہ قدیم مصر میں موسیقی کا بہت چرچا تھا۔ معاشرتی رسوم میں دلچسپی پیدا کرنے کیلئے شاہی درباروں میں تعیش کے لئے اور مذہبی تہواروں اور معبدوں میں موسیقی کو بہت دخل تھا۔ موسیقی کا جوڑ شاعری اور کئی قسم کے ناچوں کے ساتھ ملایا گیا تھا۔ پیشہ ور مغنی، تماشہ گر اور گتھک عام تھے اور ان کی پرداخت بڑی احتیاط سے کی جاتی تھی۔ درباری افسروں میں موسیقاروں کے نام نمایاں طور پر شامل کئے جاتے تھے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ کاہنوں کی تعلیم میں موسیقی بھی شامل تھی۔

قدیم مصریوں کو عمارت سازی کا بڑا شوق تھا اور وہ جو بھی عمارت بناتے تھے اسے کتبوں اور نقشوں سے آراستہ کرتے تھے۔ مصر کی آب و ہوا کچھ ایسی ہے کہ یہ کتبے اور نوشتے ابتک دست برد زمانہ سے محفوظ رہے۔ ان تصویری نوشتوں کی مدد سے قدیم مصر کے باشندوں کی پوری زندگی کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ انہی سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں موسیقی کا عام رواج تھا اور اس فن کو ان کی زندگی میں اتنا دخل تھا کہ کسی اور قدیم قوم میں نہیں تھا۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کی موسیقی کے بارے میں کوئی مستقل تصنیف دریافت نہیں ہوئی اور نہ کوئی خط موسیقی انکے ہاں رائج تھا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے اصول نغمہ کیا تھے۔ ہمارے پاس اس کی کوئی یقینی شہادت نہیں ہے کہ مصری موسیقی کے بنیادی سُر کتنے تھے اور کیا کیا تھے تاہم قدیم سازوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہی سر برتے جاتے ہوں گے جو آجکل مروج ہیں۔ مطلق سروں سے نغمہ پیدا کرنے کے علاوہ ہم آہنگی پیدا کرنے کا رواج بھی مصریوں میں تھا۔ بیان نقش وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے جن میں دکھایا گیا ہے کہ کئی کئی فنکار مل کر گا بجا رہے ہیں اور جو ساز دکھائے گئے ہیں وہ اتنے بڑے بڑے ہیں کہ پورے طائفے کی سنگت میں ہی انہیں بجایا جاتا تھا۔ گانے اور ناچنے میں تالی بجاتے تھے تاکہ سب کے لئے ایک لے قائم ہو جائے۔

مصریوں کی موسیقانہ جد و جہد کی تاریخی اہمیت ظاہر ہے ساتویں صدی قبل مسیح میں یونانیوں کو مصریوں سے ربط تھا اس طرح شمال اور مغرب کا رابطہ بڑھتا گیا یہانتک کہ مصر یونانی ثقافت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔ یونانی موسیقی پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے سب کا سب مصر ہی میں لکھا گیا اور ان میں کسی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یونانی اور مصری موسیقی میں کچھ اختلافات ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یونانی موسیقی کی تمام تر بنیاد مصری موسیقی ہی پر ہے اور ان دونوں کے اصولوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زمانۂ وسطے کے یورپ کی موسیقی کی بنیاد یونانی موسیقی پر ہے تو یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ اس کی اصل مصری موسیقی ہے۔

مصری ساز کئی قسم کے تھے۔ یہ ساز زیادہ آراستہ نہیں ہوتے تھے اور ان کا مقصد دیدہ زیبی سے زیادہ نغمگی پیدا کرنا ہوتا تھا۔ یہ ساز ایک ایک کر کے بھی بجائے جاتے تھے اور کئی کئی اکٹھے بھی۔ گانے کے ساتھ بھی ساز بجتے تھے۔ سب سے زیادہ مقبول تار کے ساز تھے ان میں بربط کی قسم کے تین ساز تھے جیسے کمان، اسے کندھے پر رکھ کر بجایا جاتا تھا۔ دوسرا وسط جو ہوتا تو کمان ہی کی شکل کا تھا لیکن بیٹھ کر اسے سامنے کھڑا کر لیا جاتا تھا اور اسی طرح اسے بجایا جاتا تھا۔ تیسرا نعل کی شکل کا۔ یہ بہت اونچا اور بڑا ہوتا تھا جسے کھڑے ہو کر بجایا جاتا تھا۔ ان سازوں میں تاروں کی تعداد تین سے لیکر بیس یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ ان کے بعد بعض تار کے ساز ایسے ہیں جنہیں گونج پیدا کرنے کے لئے کھوکھلے بکس لگائے گئے ہیں اور ان پر نعل کی شکل کے کنڈے میں متوازی تار لگائے گئے ہیں انہیں ایک بغل میں لیکر یا میز پر رکھکر انگلیوں یا مضراب سے بجایا جاتا تھا۔ ان کے بعد ستار کی شکل کے ساز ہیں جنکی تصویریں نقاشی کے نمونوں میں دکھائی گئی ہیں۔ ان میں ایک سے لیکر پانچ تار تک ہوتے تھے۔ ان کے بجانے کا طریقہ وہی تھا جو ستار کا ہے۔ بعض ساز تکونے ہیں اور ان میں تار آڑے لگے ہوئے ہیں۔ یہ ساز مصر میں باہر سے لائے

گئے۔ گز سے بجائے جانے والے ساز مصری آلاتِ موسیقی میں نہیں پائے گئے ہوا سے بجنے والے سازوں میں سیدھی اور آڑی بانسریاں ہیں۔ سیدھی بانسری کو میں دو دو کے جوڑے بھی بجائے جاتے تھے اور اکثر ناک سے انہیں بجایا جاتا تھا۔ نفیری کی وضع کے ساز بھی تھے جن میں نی لگائی جاتی تھی۔ تانبے اور پیتل کی بڑی بڑی سرنائیں بھی تھیں، جو غالباً جنگ میں کام آتی تھیں۔ تال کے کئی ساز رواج میں تھے۔ ہڈی یا ہاتھی دانت کے مجیرے اور جھانجھ۔ دھات کے بنے ہوئے بوٹے جن میں دھات کی نلیاں آویزاں ہوتی تھیں۔ انہیں ضرب لگا کر بجایا جاتا تھا۔ طنبورا اور دوسری قسم کے ڈھول یا نقارے بھی تھے۔ ان کے علاوہ ناچنے والے چھوٹے چھوٹے گھونگھرو یا جھنکار پیدا کرنے کی چیزیں پہنتے تھے۔ گھڑیال اور گھنٹیاں اس زمانے میں برتی نہیں جاتی تھیں۔

عرب کی موسیقی

وہ موسیقی جو عربی تمدن سے وابستہ ہے اور جسے مسلمانوں کی موسیقی کہا جاتا ہے اتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے کہ شاید ہی کسی اور ملک کی موسیقی اتنی پھیلی ہو اور اس نے دوسرے ملکوں کی موسیقی کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا عربوں کی موسیقی نے۔ عربی موسیقی کو اسی پھیلاؤ کی وجہ سے ایک مجموعۂ موسیقی کہنا چاہیئے کیونکہ جہاں جہاں عرب گئے اپنے ساتھ اپنی موسیقی بھی لے گئے اور ان کی موسیقی نے مقامی موسیقی کو اتنا متاثر کیا کہ شریک غالب بن گئی اور خود بھی مقامی موسیقی سے اثرات قبول کرتی رہی اور انہیں اپنے اندر جذب کر کے اپنے سرمایہ کو بڑھاتی رہی۔ اس طرح عربی موسیقی جگہ جگہ کی موسیقی کا ایک مجموعہ بن گئی اور اس کی اصلی یا مخصوص موسیقی اس طرح مدغم ہو گئی کہ اب اس کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ جنوبی یورپ، جنوبی ایشیا اور وسطی افریقہ میں آٹھویں صدی سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کی موسیقی نے بھی قدم جمائے، اس طرح اس موسیقی میں جو سارا سینی اور ہسپانوی کہلاتی ہے عربی موسیقی کا عنصر ازمنۂ وسطیٰ میں بہت نمایاں تھا۔ مصر، ترکی اور شام کے علاقوں میں بھی عربی موسیقی کا اثر غالب ہے۔ ایران اور قدیم یونان کی موسیقی بھی عربی موسیقی میں گھل مل گئی ہے اور ہر مقام کی موسیقی عربی موسیقی میں شامل ہوتی گئی ہے۔ یوں عربی موسیقی کا وہ معمہ بنا ہے جو کسی طرح حل نہیں ہوتا اور جو کچھ عربی موسیقی کے متعلق کہا جاتا ہے اس کی حیثیت قیاسی ہے اور بس عربی موسیقی کے متعلق عربی میں بے شمار کتابیں ازمنۂ وسطیٰ میں لکھی گئیں لیکن عرب سے زیادہ اس موسیقی کی وضاحت کی گئی ہے جو حقیقت میں عجمی موسیقی ہے۔ موسیقی کے نظریاتی پہلو پر ان کتابوں میں بڑی بڑی طویل اور بیش قیمت بحثیں کی گئی ہیں اور موسیقی کے اثرات کی ہر پہلو سے وضاحت کی گئی ہے۔

عربی سازوں کو اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ انہی کی اختراعات وہ سب ساز ہیں جو یورپ میں رائج ہیں۔ صدیوں پہلے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان عربوں ہی کے دم قدم سے رابطہ قائم تھا اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی یورپ میں آیا عربی کہلایا۔

سازوں میں سب سے پیش پیش عود ہے۔ اس کا نچلا حصہ ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے جس میں ایک چوڑی ڈانڈ لگی ہوتی ہے جو مختصر ہوتی ہے اور اوپر جا کر پیچھے مڑ جاتی ہے اس کے چار یا کچھ زیادہ تار ہوتے ہیں اور مضراب سے اسے بجایا جاتا ہے۔ یورپ میں عود تیرھویں صدی میں آیا اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کی کئی کئی شکلیں بن گئیں اور مینڈولن جو آجکل کا ساز ہے اسی عود کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ انگریزی کا لفظ "لوٹ" "العود" ہی سے بنا ہے۔ اسی سے کچھ ملتا جلتا "طنبور" ہے جس کا تونبا چھوٹا اور ڈانڈ لمبی ہوتی ہے۔ "رباب" اور "کمانگہ" بھی غور طلب ہیں کیونکہ انہی کو آگے رکھکر یورپ نے "وایل" اور "وایولن" بنائے ہیں۔ بعض عربی ساز ایرانی نژاد ہیں۔ ان میں سے ایک قانون کی شکل کا ساز ہے۔ فارس کی پرانی موسیقی بھی مٹ کر عربی موسیقی میں کھپ گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے عربی موسیقی کئی ملکوں کی موسیقی کا مجموعہ ہے اور یہ اتنا وسیع فن ہے کہ کئی جلدوں میں بھی اسے پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھی صدی ہجری میں علامہ ابوالفرج اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب "اغانی" تصنیف کی جس کی اکیس ضخیم جلدیں ہیں۔ افسوس کہ آج اس کتاب کی اصطلاحیں سمجھنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ ہزاروں راگنیوں کا پتہ کتابوں سے چلتا ہے اور ان کی ترتیب وتقسیم علمی و فنی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ لیکن آجکل عرب میں ان کا چلن نہیں ہے۔ یہی حال سازوں کا ہے کہ ہر قسم کے ساز بڑی صحت کے ساتھ بنائے گئے تھے اور جنہیں سوں، فلسفیوں اور علماء نے ایجاد کیا تھا۔ اب وہ پرانے ساز معدوم ہو گئے ہیں اور یورپ کے سازوں اور مغربی موسیقی نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر ایسا غلبہ پایا ہے کہ قدیم موسیقی نیست و نابود ہو گئی اور آلاتِ موسیقی کس مپرسی میں پڑ کر معدوم ہو گئے۔

طلسم خیال

بقیہ صفحہ ۱۰۱

اپنا ہاتھ کھڑکی کے شیشوں پر رکھ دیا اب میں اٹھا اور اپنے کمرہ میں واپس چلا گیا، اس عالم میں کہ میری کمر بدبختی کی گرانباریوں سے دوہری ہوئی جا رہی تھی اور میرے ہاتھ میں انسانیت کے درد و غم کا عصا تھا۔

تین ہفتے دمشق میں اور ٹھہر کر میں لبنان واپس آگیا۔ اس شخص کی طرح جو زمانہ کی گہرائیوں میں ایک ہزار صدیاں گزار کر واپس ہوا ہو، اور ہر اس لبنانی کی طرح جو پردیس سے پردیس کی طرف لوٹتا ہے۔

مجھے معاف کرنا! میرے دوستو! کہ میری داستان بہت طویل ہو گئی۔

(جبران خلیل جبران)

خام اشیا

مختلف ممالک کی معاشی صورت حال کا جائزہ لیجئے تو جو بات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی معاشی حیثیت کا فرق ہے۔ دنیا کی دولت کا بیشتر حصہ چند ممالک کے ہاتھ میں ہے اور آبادی، رقبہ غرض کسی بھی معیار کو سامنے رکھئے ان میں سے بعض کو دولت پیدا کرنے کے جو مواقع حاصل ہیں وہ دوسرے ممالک کو حاصل نہیں۔ قوموں کی امارت اور غربت کے اس فرق کا سبب ڈھونڈھئے تو معلوم ہوگا کہ دولت ان ممالک کے حصہ میں آتی ہے جہاں صنعتوں کو فروغ ہوا ہے۔ غربت و افلاس کے شکار وہ ممالک ہیں جو زراعت اور اس طرح کی معاشیات کی اصطلاح میں، خام صنعتوں سے روزی حاصل کرتے ہیں کسی ملک کی آبادی کا جتنا کم حصہ اس طرح کی صنعتوں میں لگا ہو، وہ ممالک اتنا ہی خوشحال ہوگا۔ موخرالذکر قسم کے ملک جہاں زراعت اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہی ممالک کا خاص پیشہ ہیں عموماً سیاسی حیثیت سے آزاد نہیں۔ نوآبادیاتی ممالک کی تقریباً کل آبادی ابتدائی اشیاء کی پیداوار میں مشغول ملتی ہے۔ زراعت ان کا خاص پیشہ ہے۔ کان کنی دوسرا اہم کاروبار۔ معدنیات میں ٹین، تانبا، پٹرول، سونا، اور زنک وغیرہ ان ممالک کی اہم ترین پیداواریں ہیں۔ دنیا کے ٹین کے مجموعی ذخیرہ میں سے تقریباً نصف نوآبادیاتی ممالک سے ہی حاصل ہوتا ہے، تانبے کی تقریباً ایک تہائی پیداوار انہی ممالک سے حاصل ہوتی ہے۔ زرعی پیداوار میں سب سے زیادہ اہم ربر ہے جو ایک نہایت اہم صنعتی خام پیداوار ہے۔ ایشیا کے نوآبادیاتی علاقے جو انگلستان اور ہالینڈ کے زیر نگیں ہیں دنیا کے لئے اس اہم پیداوار کا تقریباً واحد ذریعہ رسد ہیں۔ نوآبادیات کی زرعی پیداواروں میں دوسری اہم چیزیں شکر، کافی، کوکو، چائے وغیرہ ہیں۔ روئی بھی ان ممالک میں خاصی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

خام اشیا کی یہ دولت بعض مخصوص ممالک کے سیاسی اقتدار کے زیر اثر تھی اور ہے۔ اس حیثیت سے سب سے نمایاں برطانوی سلطنت ہے جس کی نوآبادیات، انتدابی علاقوں اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں اہم تر خام اشیا کا معتدبہ حصہ دستیاب ہوتا ہے، ملایا اور سیلون کے ربر کے باغوں میں برطانیہ کی ضرورت سے زیادہ ربر مل سکتا ہے ملایا اور نائجیریا سے ٹین، گولڈ کوسٹ سے مینگنیز جو فولاد کی صنعت کے لئے ایک اہم دھات ہے۔ گیہوں، تانبہ، کردم، لوہا اور فولاد اور اس طرح کی دوسری بہت سی اہم پیداواریں برطانوی شہنشاہیت کی ضرورت سے فاضل مقدار میں خود سلطنت کے مختلف حصوں میں دستیاب ہوسکتی ہیں، ہالینڈ، فرانس اور پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کے پاس بھی نوآبادیات تھیں جہاں سے مختلف خام اشیا دستیاب ہوسکتی تھیں پہلی جنگ کے بعد جب جرمنی ان نوآبادیات سے محروم کر دیا گیا تھا عام طور پر خام اشیا کیلئے جدوجہد کو جنگ کا نہایت فیصلہ کن سبب سمجھا جانے لگا تھا۔ اور خام اشیا پر برآمد محصولوں یا کنٹرول یا ترجیحی ٹیرف کے خلاف زور و شور سے شکایتیں سننے میں آتی تھیں یہی وجہ ہے کہ خام اشیا کا مسئلہ نوآبادیات کے معاملہ سے اس قدر گہرا تعلق رکھتا ہے۔ نوآبادیات کے مالک ممالک اس الزام کی اتنی ہی پرزور طریقہ سے تردید کرتے ہیں کہ انہوں نے کبھی ان ممالک کی پیداوار کے استعمال پر اجارہ دارانہ اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی ہو۔ اور اس معاملہ میں سچائی کچھ ہی ساتھ ہے ۱۹۳۷ء میں مجلس اقوام کی ایک کمیٹی نے جو خام اشیا کے مسائل کی تحقیقات کے لئے مقرر کی گئی تھیں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ بروقت دنیا کی مجموعی پیداوار میں تجارتی حیثیت سے تمام اہم خام اشیا کی پیداوار کا تین فیصدی سے زیادہ حصہ نوآبادیاتی ممالک میں پیدا نہیں ہوتا" اور اس لئے نوآبادیات کی ملکیت میں خام اشیاء کے حصول کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ دلیل یہ بھی ان ممالک کا کہنا تھا کہ نوآبادیات کی خام اشیا کی خرید و فروخت کے معاملہ میں ان میں سے کوئی بھی ملک اپنے ہم قوموں کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک روا نہیں رکھتا۔ دوسرے ممالک کے لوگ انہیں بالکل انہی شرطوں پر خرید سکتے ہیں جن پر نوآبادیات کے مالک ممالک کے باشندے۔ اور یہ آزاد تجارت کی پالیسی صرف برطانیہ تک ہی محدود نہیں تھی۔ فرانس نے بھی جہاں درآمد محصولوں کا ایک نظام رائج تھا تاکہ نوآبادیات کا بازار فرانس کی اپنی صنعتی پیداوار کے لئے محفوظ رہے خام اشیا کی خرید کے بارے میں دوسرے ممالک پر کوئی پابندی روا نہیں رکھی تھی اسلئے یہ بات تسلیم کرلی جاسکتی ہے کہ جہاں تک خام اشیا کی دستیابی کا سوال ہے نوآبادیات کی ملکیت سے کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ نوآبادیات سے کوئی معاشی فائدے حاصل ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہمیں یہاں صرف خام اشیا کے مسائل سے واسطہ ہے اور اس نقطۂ نظر سے نوآبادیات کی اہمیت غیر فیصلہ کن تھی۔

لیکن خام اشیا کا سوال بہت پرانا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مجلس اقوام کے میثاق کا مسودہ تیار ہو رہا تھا تو اٹلی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ غذا اور خام اشیا کی بین الاقوامی تقسیم پر جن پر زندگی اور صنعت کا دارومدار ہے اس طرح کی نگرانی کی جائے کہ ہر ملک کو وہ تمام چیزیں دستیاب ہوسکیں جو اس کے لئے ضروری ہیں۔ اور اس کے بعد بھی دونوں لڑائیوں کے بیچ کے زمانہ میں یہ مسئلہ منظر عام پر آتا رہا ۱۹۳۷ء میں مجلس اقوام کی ایک کمیٹی نے خام اشیا کی دستیابی کے متعلق دو قسم کی شکایتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ایک طرف تو خام اشیا کی رسد کے متعلق دقتیں محسوس کی جا رہی تھیں یعنی بعض ممالک کو شکایت

ابو سلیم

تھی کہ ایسی صورت میں بھی جبکہ وہ اپنی ضرورت کے لئے تمام خام اشیا کی قیمتیں ادا کر سکتی تھیں وہ انہیں یا تو بالکل ہی حاصل نہیں کر سکتے تھے یا پھر انہیں بہت بھاری قیمتیں ادا کرنی پڑتی تھیں۔ اس کے برخلاف بعض اور ممالک کی اہم ترین دقت ادائگی کا مسئلہ تھا۔ ان کو شکایت یہ تھی کہ جب ان اشیائی رسد ممکن ہوتی تب بھی وہ انہیں حاصل کرنے کے لئے ضروری مبادلہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اور اس معاملہ میں بالکل بے بس اور لاچار تھے" کمیٹی نے ان دونوں سے بحث کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ ادائگی سے متعلق دقتیں اہمیت کے لحاظ سے ان دقتوں سے کہیں نمایاں تھیں جو ان اشیا کی رسد کی بنا پر پیدا ہو سکتی تھیں"

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ان ممالک کو جو خام اشیائی درآمد پر مجبور تھے دو طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کی بدولت بیشتر خام پیداواروں کی قلت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کا سبب یا تو خود ذرائع پیدائش کی کمی تھی یا پھر جہازوں کی کمی جن کی بنا پر یہ چیزیں ضرورت مند ممالک تک پہونچائی نہیں جا سکتی تھیں۔ پھر بہت سارے ممالک کا اندرونی نظام بار برداری درہم برہم ہو گیا تھا اور یہ چیز خام اشیا کے نقل و حمل میں ایک مزید پیچیدگی کا باعث ہوئی تھی۔ یورپی براعظم کے مختلف ممالک میں جن کی ضرورت سب سے زیادہ شدید تھی بیرونی قوت خرید کی بڑی کمی تھی کیونکہ انہیں ہی جنگ کی تباہ کاریوں کا سب سے پہلے اور شاید سب سے زیادہ شکار ہونا پڑا تھا۔ اس طرح یہ ممالک ایک عجیب چکر میں پھنس گئے تھے خوراک خام اشیا سامان اور وسائل بار برداری کی قلت کی بدولت یہ ممالک اپنی پیداوار میں اضافہ کر کے برآمد سے بیرونی قوت خرید حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اور بیرونی قوت خرید کے بغیر ان چیزوں کا حصول دشوار تھا۔ کیونکہ ان غیر یقینی سیاسی حالات میں انفرادی اعتبار حاصل نہ ہو سکتا تھا اور کوئی بین الاقوامی ادارہ موجود نہ تھا اور اس طرح سب سے زیادہ حاجتمند ممالک خام اشیا کی خرید کے بارے میں ٹوٹے گھاٹے میں تھے۔ عام قلت کی وجہ سے قیمتیں بڑھ رہی تھیں اور ان کے پاس اتنی بیرونی قوت خرید بھی نہ تھی کہ وہ نسبتاً سستے داموں میں انہیں خرید سکیں۔ اس بین الاقوامی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بین الاقوامی عمل کی ضرورت تھی۔ اور اس کے نہ ہونے کے نتائج بہت برے ہوتے یورپی براعظم کے بیشتر ممالک میں خام پیداواروں کی بڑی قلت رہی۔ ان ممالک کی دوبارہ تعمیر کے کام میں دقتیں پیدا ہوئیں اور مالی حالات میں ایک ابتری پیدا ہو گئی۔ ہر ملک اپنی حفاظت کی خاطر ایسے اقدامات پر اتر آیا جنہوں نے جنگ کے بعد کے ایام کی تجارتی پالیسی کو غلط راستوں پر لا ڈالا جس میں تحدید (RESTRICTION) سب سے زیادہ نمایاں تھی"

یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ بیشتر وہ ممالک جنہیں خام اشیا کی نایابی یا کمیابی کی شکایت تھی مقروض ممالک تھے۔ جرمنی اور اٹلی ان غیر آسودہ اقوام کے سربرآوردہ نمائندے تھے۔ تاوان جنگ اور اس طرح کی اور ذمہ داریوں نے جرمنی کے سارے بیرونی زر کے ذخیرہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سرمایہ کاری کی قلت نے ان ممالک کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ چھوڑا کہ وہ اشیا اور خدمات برآمد کر کے بیرونی زر حاصل کریں۔

عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کسی بھی ملک کے لئے بیرون ملک سے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کی شکل یہی ہے کہ وہ ایسی چیزیں جو وہ خود پیدا کر سکتا ہو دوسرے ممالک کو برآمد کرے اور اس آمدنی سے بیرون ملک سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدے۔ بین الاقوامی تجارت کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ بعض ملک بعض چیزیں پیدا کر سکتے ہیں اور بعض چیزیں نہیں۔ اسی طرح کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بین الاقوامی لین دین کا سہارا ڈھونڈھا جاتا ہے۔ اس طرح اگر تجارت کی پوری آزادی ہوتی تو ان ممالک کو جو خام اشیا کے معاملہ میں خوش قسمت نہیں ان کے حصول میں کوئی خاص دقت نہ اٹھانی پڑتی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کوئی تین چوتھائی صدی تک دنیا میں اس طرح کی آزاد تجارت رائج تھی۔ جنگ عظیم نے اس نظام کو درہم برہم کر ڈالا۔ اس کے بعد کا زمانہ سیاسی، مالی اور نظام مبادلہ زر کی ابتری کا زمانہ تھا۔ آزاد تجارت کے نظام کو سخت دھچکا لگا۔ ۱۹۲۵ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بار پھر یہ نظام سنبھل جائے گا لیکن یہ سنبھالا عارضی تھا۔ اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک خام اشیا کا مسئلہ وقتاً فوقتاً شدت کے ساتھ بحث کا موضوع بنا رہا۔

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ ان حالات سے صرف خام اشیا کے درآمد کرنے والے ممالک کو ہی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تو تصویر کا ایک ہی رخ ہے اسے زیادہ اہمیت اس لئے حاصل ہو گئی کہ جن ممالک کو اس بنا پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس دور میں وہی سیاسی حیثیت سے توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ایچ ڈی۔ ہنڈرسن نے لکھا ہے "خام اشیا کا اصل سوال یہ نہیں کہ صنعتی ممالک کو مناسب مقداروں اور مناسب قیمتوں پر خام اشیا کس طرح فراہم کی جائیں۔ تاریخ کے کسی پچھلے دور میں انہیں یہ چیزیں اتنی افراط اور اتنے سستے داموں پر مل نہیں سکی تھیں۔ اصل معاملہ تو یہ ہے کہ خام چیزوں کے پیدا کرنے والوں کے ساتھ انصاف کیوں کر کیا جائے"

خام پیداوار کا کام کبھی بھی صنعتی پیداوار کے مقابلہ میں نفع بخش نہ تھا تجارت کی صورت میں ہمیشہ ہی سودے میں گھاٹا ان ممالک کو ہی اٹھانا پڑتا تھا جو زرعی اور دوسری خام چیزوں ...

بھاؤ اور بھروسہ گرتے تھے اس صورت حال کو بیان کرنے کے لئے لارڈ اسٹامپ نے کہا کہ "دنیا کو غذا اس کے صرف سے کم قیمت پر ملتی رہی ہے۔" ادھر پچھلے کچھ سالوں کو چھوڑ کر جب ایک عالمگیر جنگ نے صورت حال کچھ بدل دی ہے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یہ کام اور بھی کم نفع بخش ہو گیا تھا۔ نوآبادیات کی بیشتر پیداوار کی مانگ رسد سے کم ہو چکی تھی۔ یہ صورت حال نوآبادیات کی خام اشیا ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی تقریباً سبھی زرعی اشیا کا یہی حال تھا۔ معدنی خام اشیا بھی اس رجحان کا کچھ کم شکار نہیں تھیں۔ اور اگر اسلحہ بندی کے سلسلہ میں ان کی مانگ میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو گیا ہوتا تو ان کی حالت اول الذکر گروپ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ بہتر نہ ہوتی۔ جب طلب کے مقابلہ میں رسد زیادہ ہو تو اس کا ناگزیر نتیجہ قیمتوں کی تخفیف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہی اس بار ہوا۔ بین الاقوامی تجارت کے سلسلہ میں جن زرعی اشیا کا ذکر کیا جاسکتا ہے تقریباً ان سب کی قیمتیں ۱۹۳۹ء میں ۱۹۱۴ء کی سطح سے کم تھیں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خود سٹرلنگ کی قیمت جس کی شکل میں ان قیمتوں کو ظاہر کیا گیا ہے اس ۱۹۳۹ء میں ۱۹۱۴ء کی صرف دو تہائی ہی رہ گئی تھی۔

لیکن خام اشیا کے پیدا کرنے والے ممالک کے دکھ کی کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ دونوں لڑائیوں کے بیچ کے زمانہ میں انہیں ایک اور مصیبت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے جو کبھی کبھی عارضی اور بعض صورتوں میں زیادہ اہم اثرات کا نتیجہ ہوتا تھا ان کی یہ مختصر سی آمدنی بھی غیر یقینی اور غیر مستحکم بن گئی زراعت میں اچھی اور بری فصل اور موسم کے تغیر و تبدل سے رسد میں بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے اور چونکہ خوراک کی بہت سی چیزوں کی مانگ قیمتوں سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتی اس لئے اس تغیر و تبدل سے قیمتوں پر بہت زیادہ اثر پڑتا تھا۔ صنعتی خام پیداواروں کی مانگ کا تعلق صنعت کی مشغولیت سے ہوتا ہے۔ اور اس لئے قدرتاً جب صنعت کساد بازاری کا شکار ہو تو ان کی مانگ کا کم ہو جانا ناگزیر تھا۔ اور یہ معلوم ہے کہ اس عہد میں دنیا کو سب سے سخت کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

موجودہ غیر معمولی حالات کے سدھر جانے کے بعد جب جنگ کی پیدا کردہ صورت حال بدل چکی ہو گی، دنیا کو ایک بار پھر انہی دو مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ زرعی اور دوسری خام اشیا کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا روکنا، اور مختلف ممالک کو ان کی ضرورت کے حساب سے خام اشیا کی فراہمی، آئندہ پھر دنیا کے امن کے معماروں کو ان دو باتوں کا انتظام کرنا ہو گا۔ جہاں تک ان چیزوں کی قیمتوں کے تغیر و تبدل کا تعلق ہے سب سے اہم ضرورت تو یہ ہے کہ دنیا کو معاشی مدوجزر کے مصائب سے نجات دلائی جائے۔ اگر اس جنگ کے بعد دنیا نے تجارتی چکر سے نجات حاصل کر لی تو یہ مسئلہ بہت بڑی حد تک حل ہو چکا ہو گا۔ اگر کساد بازاری کا اندیشہ باقی رہا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ قومیں اپنی معاشی زندگی کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کریں گی۔ یہ طریقہ دنیا میں اشتراک عمل اور اتحاد کے منافی ہو گا۔ اور اس کے اثرات کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ دنیا کی موجودہ معاشی تنظیم کچھ اس طرح کی ہے کساد بازاری سے بچنے کی بیشتر ذمہ داری اور اس کا انحصار بڑی طاقتوں کی معاشی حکمت عملی پر ہے۔ اگر ان ممالک میں مکمل روزگار اور کساد بازاری سے حفاظت کی دوسری تجویزیں بروئے عمل آ سکیں تو یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں رہ جائے گا۔ لیکن اس کے علاوہ ماضی کے تجربہ سے اس تباہ خیز اتار چڑھاؤ سے بچنے کی ایک اور شکل بھی دریافت ہوئی ہے۔ یہ اشیا کی نگرانی و تنظیم Commodity Regulation کا طریقہ ہے۔ اس طریق کار کے متعلق بہت سی کڑوی باتیں کہی گئی ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اس سے بین الاقوامی تجارت اور خود خام اشیا کے پیدا کرنے والے ممالک کا خاصہ بھلا ہوا ہے۔ یہاں اس طریق کار کی وضاحت کا تو موقع نہیں لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہو گا کہ اس طرح کی تنظیم کے تحت مقاصد کیا ہوں گے۔ ایک ہندوستانی مصنف نے ان مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ طریق کار مستقبل میں معاشی زندگی کا ایک مستقل جز ہونے والا ہے تو اس کے مقاصد دو ہونے چاہئیں۔ (۱) قیمتوں میں چھوٹے عرصے کے اتار چڑھاؤ کو روکنا جو طلب و رسد میں اچانک یا اتفاقی تبدیلیوں کی بدولت پیدا ہو جاتے ہیں (۲) اور مستقل مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ خام اشیا کی طلب و رسد میں توازن پیدا ہو جائے تاکہ ان کے صرف میں توسیع ہو اور ساتھ ہی ان کے پیدا کرنے والوں کی زندگی اور ان کے کام کی حالت ابتر نہ ہو۔ یہ مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب قومیں تعاون اور اشتراک عمل کے لئے آمادہ ہوں اور یہ احساس عام ہو جائے کہ دنیا کے ایک حصہ کا افلاس آخرکار سب کے افلاس کا سبب بن جائے گا۔ ایسا ہو گا یا نہیں، یہ کون بتا سکتا ہے۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر یہ مقصد بھی جسے مغربی مدبروں نے اتنی اہمیت دی تھی کہ اسے میثاق اٹلانٹک میں جگہ ملی جو گویا ایک نئی دنیا کی تعمیر کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کے لئے جاری کیا گیا تھا وہ اصول یہ تھا کہ ہر ملک کو خام اشیا تک رسائی کا یکساں حق ہو۔ کیونکہ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ بین الاقوامی تجارت آزاد ہو اور مختلف ممالک اس مقصد سے مل جل کر کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں کہ یہ دنیا بحیثیت مجموعی ترقی کر سکے۔ اور یہ احساس عام ہو جائے کہ "یہ دنیا اگر ایک ہو کر بن سکی تو مٹ جائے گی"۔ یہ ناممکن الحصول خواہش نہیں۔ لیکن یہ گفتگو نامکمل رہ جائے گی

باقی صفحہ ۱۲۹

۳۔ سلیمان فکری۔ انطالیہ لواسی تاریخ۔ مطبوعہ استنبول ۱۹۲۲ء
۴۔ محمد حجت۔ کستمونی مطبوعہ استنبول ۱۹۲۵ء
۵۔ مبارک غالب۔ انقرہ شہری دو جلد مطبوعہ استنبول ۱۹۲۵-۲۸ء
۶۔ اسمٰعیل حقی۔ کتاہیہ شہری مطبوعہ استنبول ۱۹۳۲ء
۷۔ رضوان نفیس۔ سواس شہری مطبوعہ استنبول ۱۹۲۸ء
۸۔ محمد یوسف۔ کیبا اسری عظیم کا مرپیسے رسری مطبوعہ کونیہ ۱۹۳۰ء
۹۔ علی کمالی۔ ارزندجان شہری مطبوعہ استنبول ۱۹۳۲ء

نوٹ: ترکی کے علوم وفنون کے دور میں اتاترک کی زیر نگرانی تاریخ اور آثار قدیمہ پر یہ کتابیں لکھی گئیں۔ فہرست سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کتابوں میں بیشتر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء تک کے دور میں شائع ہوئیں۔

ایشیائے کوچک یا اناطولیہ کے بعض حصوں میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں جنہیں ترکی میں ہویوق اور بین الاقوامی آثار قدیمہ کی اصطلاحات میں طوملس کہتے ہیں۔ یہ ٹیلے گذشتہ زمانے کے کھنڈرات کے انبار ہیں۔ ان ٹیلوں کی عمودی اور افقی کھدائی کرنے سے مختلف طبقے معلوم ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی الگ اور اہم تاریخ ہے۔

ظاہرا ولین طبقات وہی ہیں جن میں تاریخ سے پہلے کی سطحیں ملتی ہیں۔ تاہم بعض اوقات قدیم طبقات آپس میں مل جل گئے ہیں۔ ون ڈر اوسٹن۔ شنٹ اولف۔ نالمن اور دیگر غیر ملکی علما نے ان ٹیلوں کی کھدائی میں ترکی کے آثار قدیمہ کے محققین کی مدد کی ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ ٹیلہ علی شہر ہویوق ہے۔ اس ٹیلے میں سات طبقے ہیں۔ پہلے طبقے کی سطح میں پیالیتھک کالکولیتھک اور کانسی کے دور کی اناطولی تہذیب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساتویں درجے کی سطح پر سلجوقی اور عثمانی تہذیب کے آثار مل جاتے ہیں۔ درمیانی طبقات میں ملت حطیطی فریجی میڈین۔ یونانی۔ رومن اور بازنطینی تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں۔ کھدائی کا طریقہ بالکل جدید یا فاعدہ اور بہت دلچسپ ہے۔ کسی خاص مقام کی کھدائی کرنے سے پہلے کسی محدود اور مقررہ زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعوں کی کھدائی کی جاتی ہے۔ سال کا رفتہ رفتہ سلسلہ بن جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین پر دست فطرت نے کیا کاری کی ہے۔ اگر کسی کھدائی کی آزمائش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو تحقیق کی غرض سے کسی اور قطعہ زمین میں کھدائی کی جاتی ہے۔ دوسرے دلچسپ ہیونی یا ٹیلے بوغاز کوئی اور الاجا ہیل میں ہیں۔ کھدائی خاص یونان رومن اور بازنطینی مقامات پر ہوئی جیسے انقرہ۔ لاؤڈیسیا اور ایس پنڈوس کے مقامات پر۔ مثلاً ایس پنڈوس میں عہد رومن کی بالائی نہریں اور گول شاندار تماشا گاہیں بھی ہیں جہاں ڈرامے کئے جاتے تھے۔ ایس پنڈوس کی گول تماشا گاہ یونانی تماشا گاہوں سے اور خصوصاً ایپی ڈورس کی تماشا گاہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ انقرہ کے قریب جان کری کے مقام پر عہد رومن کے ستونوں کی کرسیاں اور اسی عہد کی ایک نہر کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ عہد رومن کے کتبوں کے اعتبار سے جان کری بھی بہت دلچسپ ہے۔ دیاربکر طلیس ساہات۔ برصہ خارپوت۔ ملاطیہ اور سواس کی عہد اسلامیہ کی یادگاروں کا بھی جائزہ لیا جا چکا ہے اور ان کے کتبوں کا ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ ترکی حکومت تاریخ اور آثار قدیمہ پر بہت عمدہ عمدہ رسالے نکالتی ہے۔ آثار قدیمہ سے متعلق جو معیاری رسالہ ترکی کے محکمہ تعلیم سے نکلتا ہے آرکولوجیا وے اتھنوگرافیہ درگیسی یعنی تاریخ ترکیت ہے۔ اس رسالے میں بہت اہم مقالے۔ کھدائیوں کی اطلاعات اور آثار قدیمہ کی تحقیقات سے متعلق عمدہ عمدہ خاکے اور نقشے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان رسالوں کے علاوہ ترکی حکومت آثار قدیمہ سے متعلقہ عجائب خانوں اور مقامات کی تعریف وار فہرست شائع کرتی ہے۔ عجائب خانوں اور دیگر تمدنی دلچسپی کے مقامات پر افسرانہ تمکنت کو علاقہ نہیں۔ عجائب خانے ترک لوگوں کے لئے ہیں کیونکہ یہ تو انہیں کے آبا و اجداد کے موروثہ گودام ہیں۔ ترکی میں تاریخ اور آثار قدیمہ صرف علمی دلچسپی کے مضامین نہیں۔ بلکہ زندگی کی ایسی قوتیں ہیں۔ جو ترک قوم کی نظامی خصوصیات میں خودداری اور قومی افتخار کے احساس کو پیدا کرتی ہیں۔

اجینٹا کے فرسکو

بقیہ صفحہ ۱۳۹

چینیوں کی سی آنکھیں، غیر ملک کی پوشاک یا بال بنانے کے طریقے نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں وسط ایشیا کے نسلی عناصر خاصی تعداد میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ بعض تصویروں کے خطوط اس طرز کے ہیں جس نے چین میں رواج پایا یا جاپان میں بدھ مذہب کے ابتدائی دور میں بدھ کی شبیہیں بنیں جن کے اجینٹا کے طرز سے بدیہی تعلق ہے، اور وسط ایشیا میں ایسے آثار ملے ہیں جو ہندوستانی اور جاپانی مصوری کے اس تعلق کے خیال کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ اجینٹا میں صرف فرسکو مصوری کا بے مثل کام نہیں کیا گیا، یہ فن کا ایک بڑا اور شاید بین الاقوامی مرکز ہوگا، جیسے کہ ایک زمانے میں گندھارا تھا۔ یہاں کا کام خالص ہندوستانی فن اور معیار کا نمونہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی مصوری کا طرز پہلے کچھ اور ہوگا، ایلورا میں فرسکو کے جو ہلکے نقش ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں مصوری کا طرز بہت جلد بدل گیا۔ قرون وسطیٰ کے گجراتی اور راجپوت طرز کا اجینٹا سے رشتہ جوڑنا کچھ آسان نہیں یہ البتہ ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ علمی اور فنی تحقیق ثابت کر دے کہ قرون وسطیٰ اور مغل دور کی ہندوستانی اور اسی زمانے کی ایرانی، وسط ایشیائی چینی اور جاپانی مصوری کا نقطہ اتصال اجینٹا کے فرسکو ہیں۔

لوہسون

چینی ادب کی نئی تحریک کا رہنما

فضل حق قریشی دہلوی

"قدیم روس کے ان ذہین افسراد کی طرح جن کو چیخوف نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے یا انیسویں صدی کے انگلستان کے ان با وضع لوگوں کی مانند جن کو چارلس ڈکنز نے اپنے ناولوں میں کھینچا ہے، لوہسون کے افسانوی کردار بھی اپنی بنیادی صحت و معقولیت کے باعث دنیا کے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس کے انداز بیان میں اتنی گہرائی ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کے ہر جملے کی داد دینے کے ساتھ ساتھ ہم نہ صرف اسکے افسانوں کو سچی کہانیاں تسلیم کرنے لگتے ہیں بلکہ وہ ہمیں ہمارے سماجی ماحول کی صحیح قدروں کو ایک نرالے انداز میں محسوس کراتا ہے اور اس طرح مطالعے کے وقت ہماری دلچسپیاں سطحی اور عارضی ہونے کی بجائے کسی قدر گہری اور دیرپا اور بسا اوقات پیچیدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مضحکہ خیز باتوں پر بے تحاشہ ہنسنے کے دوران میں یکا یک ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے جاگیردارانہ نظام کا وہ ماحول جس میں اس کے افسانوی کردار سانس لیتے ہیں، ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کے لائق ہے۔ لوہسون حقیقتاً ایک بلند پایہ فنکار ہے۔"

یہ ہیں چین کے مشہور ادیب لوہسون کی بابت وہ الفاظ جو آج سے تقریباً تیرہ سال پہلے چین کے ایک موجودہ زبردست نقاد لِن یوتانگ نے لکھے اور اپنے رسالے "لن یو" کے یکم اگست ۱۹۳۳ء والے شمارے میں شائع کئے۔

لوہسون قلمی نام تھا چوشوجن کا جو ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ مانچو خاندان کے عہد حکومت میں چین کے صوبہ چیکیانگ کے شہر شاؤ ہسنگ میں پیدا ہوا۔ اس وقت ملک کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف وہ نئے رجحانات جو ۱۹۱۱ء والے انقلاب کا پیش خیمہ تھے، بہت آہستہ آہستہ نشوونما پا رہے تھے۔ کچھ وقت کی پکار اور کچھ خاندانی حالات نے مل جل کر اس کے خیالات پر اثر کیا اور وہ اسی رنگ میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے علم کی دولت ورثے میں ملی تھی کیونکہ خاندان کے بیشتر افراد عالم و فاضل تھے۔ اس کے دادا کو "ہان لِن" کی سند ملی تھی۔ یہ اس زمانے میں سب سے بڑا علمی اعزاز تھا۔ اسکا باپ بھی "ہسیو تس آئی" تھا۔ یہ ڈگری شاہی امتحانات میں شامل ہونے والے کامیاب طلبا کو ملتی اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ لیکن علم اور دولت کے ازلی بیر کے باعث اسکا گھرانہ ہمیشہ مفلوک الحال رہا۔ یہاں تک کہ باپ کی وفات کے بعد لوہسون کے لئے زندہ رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ماں نے کنبے اور جان پہچان کے چند امیروں کے سامنے دست سوال پھیلایا لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ ماں بیٹے سر بازار بھیک مانگنے لگے تھے۔ عزت نفس کا وہ احساس جو دولت علم نے ان غریبوں میں پیدا کیا تھا۔ اس امر کی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

اپنے وطن میں کان کنی اور انجینیری کی تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ حسب دستور جاپان چلا گیا۔ ان دنوں سبھی چینی اعلیٰ تعلیم کے لئے طلوع آفتاب کی اس ہمسایہ سرزمین کا رخ کرتے تھے۔ وہاں اس نے علم طب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ روسی مصنفوں، خصوصاً طولسطائی کی کہانیوں کو پڑھا اور اس طرح انقلاب کا وہ مادہ جو چھپے ہوئے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا، اس کی رگ رگ میں تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اس کی آنکھیں جو یوں بھی زیادہ بند نہیں تھیں، بالکل کھل گئیں۔

۱۹۰۹ء میں وطن واپس آتے وقت اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ وہ اور بھی اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے یورپ جانے کی استطاعت کیوں نہیں رکھتا۔ چین آ کر اس نے کوئی مطلب نہیں کھولا بلکہ اس فن سے بالکل منہ موڑ لیا۔ وہ کہتا تھا کہ اسکا رسے بڑا ماہر بھی "خطرۂ جان" بننے کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے صوبے کے ایک اسکول میں مدرس ہو گیا اور دو سال بعد جب بغاوت و انقلاب نے اپنا رنگ جمایا تو وہ ہر چیز کو خیرباد کہہ کر پیکنگ پہنچا اور زندگی میں وہ نئی روح پھونکنے لگا جس نے ہر چینی میں ایک بے پناہ تڑپ پیدا کر دی۔

پندرہ سال تک وہ زندگی کی مختلف النوع ہنگامہ آرائیوں میں گھرا رہا۔ اس نے وزارت تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ قبول کیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پیکنگ کی اس مشہور جامعہ ملیہ میں پروفیسر ہو گیا جسے چینی ادب کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارا کہا جا سکتا ہے۔ اسی دوران میں اس نے دو ادبی رسالے "یان یو آن" اور "یوشیہ" نکالے جو بہت جلد ملک بھر میں مقبول ہو گئے۔ اس نے بہت سی جرمن، روسی، اور جاپانی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

اگرچہ لوہسون پر بعض روسی مصنفین خصوصاً طولسطائی، تورگنیف، آرتزی باشیف اور گورکی کا زبردست اثر تھا اور اس نے انکی تحریروں کے بہت سے ترجمے بھی کئے مگر ذاتی طبعزاد تحریروں میں ان کے انداز فکر یا اسلوب بیان کی نقالی نہیں کی۔ اسکا طرز تحریر پھر بھی خالص چینی رنگ میں ڈوبا رہا۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی ناقدین ادب اسکی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

اپنے ذاتی رسالوں کے علاوہ اس نے دوسرے جرائد کو بھی نوازنا شروع کیا چنانچہ "شباب نو" نامی ماہنامے کے قلمی معاونین میں اسے امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور جب ۱۹۱۸ء میں اسی رسالے نے قدیم کلاسیکل زبان "وین لی" پر عوام کی بولی "بائی ہوا" کو ترجیح دیتے ہوئے لسانی انقلاب کی زبردست تحریک شروع کی تو اس کے حامیوں میں لوہسون ہی سب سے آگے تھا۔ یہ انقلاب صرف لسانی انقلاب تک محدود نہ رہا بلکہ چینی سماج کی جملہ خرابیاں بھی زیر بحث ہو گئیں۔ اس تحریک کے دوش بدوش حکومت کے ہر سیاسی اور سماجی نظام پر حملے ہونے لگے اور اس طرح وہ باغیوں کی صف اول میں گنا جانے لگا۔

اسی رسالے میں اس کی مشہور کہانی "دوا" شائع ہوئی جس نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ اس میں چینی طب کے غیر سائنسی اصولوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔ قدیم و جدید افکار اور طریقۂ کار کی باہمی کشمکش جو لوہسون کی تحریروں میں اکثر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے، اس کہانی میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں کھلم کھلا حکومت وقت پر حملے کئے گئے ہیں کہ آخر قدیم غیر سائنسی طریقۂ علاج کو روکنے کے لئے قدم کیوں نہیں اٹھایا جاتا۔ مختصر کہانیوں کے علاوہ اس کے تنقیدی مضامین بعنوان "تسا کان" (خیالات پریشاں) بہت جاذب نظر ہوتے تھے۔ اس قسم کی تحریروں کے سب سے اچھے نمونے اس کی دو کتابوں "گرم ہوا" اور "جنگلی گھاس" میں شامل ہیں۔ بقول لن یوتانگ اس کے افسانوں میں افراد حقہ بالکل سچے اور جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی کردارنویسی کی زبردست صلاحیت "کنگ آئی جی" جیسے مختصر افسانے میں بھی اپنا رنگ جما رہی ہے۔ اس کی ایک دلچسپ طنزیہ کتاب "آہ قی کی سچی کہانی" نے جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی، سارے ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ خصوصاً علماء کی جماعت نے پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور اسے ایک مستقل خطرۂ امن قرار دیا۔ کچھ ہی دن بعد "نعرۂ جنگ" کی اشاعت عمل میں آئی جس نے نہ صرف چین بلکہ بیشتر ممالک مغرب میں شہرت پائی۔ فوراً ہی فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے۔ فرانس کے شہرۂ آفاق ادیب روماں رولاں نے جو لوہسون کا بڑا مداح تھا، اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ موضوع اور طرز دونوں اعتبار سے وہ اتنی موثر ہے کہ میں اسے پڑھ کر روئے بغیر نہ رہ سکا لیکن طنز و ظرافت کے ان تیر و نشتر کو جو اوراق کتاب میں پھیلے پڑے ہیں، ارباب حکومت کسی عنوان برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ کتاب کی ضبطی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مصنف کو بھی قید کر لینا چاہا۔ بہت ہی خفیہ طور پر اس کی گرفتاری کا پروانہ جاری ہوا لیکن بروقت مخلص احباب نے مخبری کی اور اس طرح وہ پیکنگ سے اور شاید موت کے بھیانک چنگل سے بچ نکلا۔

عارضی طور پر اس نے ایموئے میں اقامت اختیار کی لیکن جب سن یات سین نے کیولنسٹوں کو منتانگ میں داخل کر لیا تو وہ کینٹن چلا آیا کیونکہ اس کے کئی دوست کومنتانگ کی مخالف پارٹی میں شامل تھے اور تب اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی تاہم سکون و اطمینان کی یہ فضا زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ ۱۹۲۷ء میں چیانگ کائی شیک نے برسر اقتدار ہوتے ہی کیمونسٹوں کے استیصال کے لئے جارحانہ تنظیم شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں طلباء مزدور اور کسان جو اشتراکی عقیدے کے حامی تھے بھیڑ بکریوں کی طرح سر عام ذبح کئے جانے لگے۔ لوہسون ایک بار پھر موت کے منہ سے بچ نکلا۔ اور اس نے گوشۂ گمنامی میں رہنے کے لئے شنگھائی چلا گیا۔ کینٹن والے قتل عام کے ہولناک نظاروں نے اسے اتنا شدید صدمہ پہنچایا کہ وہ کچھ عرصے تک ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔

۱۹۳۰ء میں اس نے انقلابی مصنفین کی ایک انجمن بنائی جو زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ ایک ہی سال بعد جاپان نے منچوریا پر حملہ کر دیا اور چینی حکومت کو ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خطروں کو مٹانے کے لئے زیادہ سختی برتنی پڑی۔ چنانچہ مذکورہ بالا انجمن کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے اس کے بہت سے اراکین کو گرفتار کر لیا گیا جن میں چین کے چھ مشہور ادیب لی وئی، ہسن، ہو یہ پنگ، جو شیہ، تسنگ ہوئی، تین لو اور ایک خاتون فینگ کنگ شامل تھے۔ ۷ فروری ۱۹۳۱ء کو چینی دستور کے مطابق ان قیدیوں کو مجبور کیا گیا کہ تم اپنے لئے قبریں کھودو۔ اور جب وہ یہ کام کر چکے تو انہیں مار کر ان میں دفن کر دیا گیا۔ اس افسوسناک واقعے نے ساری دنیا میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ لیکن ارباب حکومت پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے ہر اس تحریر پر پابندی عائد کر دی جس میں سرمایہ دار اور مزدور کا ذکر ہو۔

ایسی صورت میں لوہسون کے لئے زندہ رہنا اور جیل کی سختیوں سے بچے رہنا ہی غنیمت تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ کئی فرضی ناموں سے لکھنا شروع کر دیا۔ اسے نام و نمود کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا اور اس طرح ایک حد تک کامیاب رہا۔ لیکن حقیقتاً اس کی فطری صلاحیتیں اور دل کا صحیح جوش مٹ گیا تھا۔ اسی لئے آخر عمر میں اسے زیادہ تر گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ تنہائی کا یہ زمانہ زیادہ تر نقاشی، مصوری اور خوشنویسی کے کمالات پیش کرنے یا قدیم نوادر جمع کرنے میں گذرنے لگا کیونکہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کا بھی دلدادہ تھا۔ اس سلسلے میں اس نے مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھ دیں، مگر اسکا وہ زبردست انقلابی ناول جو اس نے ۷ فروری ۱۹۳۱ء والے ہولناک واقعے سے قبل لکھنا شروع کیا تھا، ادھورا رہ گیا اور احباب کے شدید اصرار کے باوجود مکمل نہ ہو سکا۔

غرض یہ کہ اہل چین کو ترقی کی ایک نئی راہ دکھا کر وہ ۱۹۳۶ء میں اس جہان سے کوچ کر گیا۔

نقد و نظر

سدرۃ المنتہیٰ

سیماب اکبرآبادی، شائع کردہ مکتبہ قصر الادب، آگرہ۔ قیمت مجلد للعہ

بانگ درا کے سائز پر ۔ چھپے ہوئے کی یہ کتاب سیماب صاحب کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے مجموعہ میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کی غزلیں ترتیب وار شامل ہیں، ردیف وار نہیں۔ سیماب صاحب اُردو کے ان چند گنے چنے نامور شعرا میں سے ہیں جن کی نظمیں اور غزلیں یکساں طور پر فکر و مشاہدہ کے ایک خاص انداز کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو سیماب صاحب کی حیثیت منفرد ہے جس طرح ان کی نظمیں بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کی ہم نوا بھی ہیں اور شاعرانہ نغز گوئی کی لطیف اور رنگین خصوصیات کی حامل بھی، بالکل اسی طرح اُن کی غزلوں میں جہاں ایک طرف دنیائے حسن و الفت کے دلکش فسانے ہیں، دوسری طرف انقلاب کا ایک نعرہ بھی ہے مجموعہ کے بالکل شروع میں سیماب صاحب کی ایک نظم شامل ہے جس کا عنوان ہے "میر نصب العین"۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے ؎

میں غفلت میں سونے والوں کی نیند اُڑانے آیا ہوں

دُنیا کو جگا کر چھوڑوں گا، دنیا کو جگانے آیا ہوں

یہ شعر شاعری کے اس بلند نصب العین کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہر زمانہ میں اس کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ شاعری کسی نہ کسی منزل پر آکر بھولے بھٹکے انسان کی رہنمائی کا منصب اپنے ذمہ لیتی ہے۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ وہ اس منصب کو شاعری کی طرح پورا کرتی ہے یا نہیں۔ اسی سوال کے جواب سے اچھی اور بُری شاعری میں امتیاز ہوتا ہے۔ شاعری اگر غفلت میں سونے والوں کی نیند اُڑانے کی فکر میں خود اپنی حیثیت کو بھول کر محض تلقین و وعظ بن جائے تو وہ شاعری نہیں رہتی۔ شاعری بلند نصب العین اور شاعرانہ انداز بیان کے شیریں امتزاج کا نام ہے۔ سیماب صاحب کی غزلوں کے اس مجموعہ کو اگر اس کسوٹی پر کسا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سیماب صاحب نے باوجودیکہ اپنی غزلوں کے بہت سے شعروں کو ذہنی، اخلاقی اور کبھی کبھی قومی اور سیاسی اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے، لیکن کبھی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا کہ یہ اصلاح کا اہم کام محراب کے سایے یا منبر کی بلندی سے نہیں بلکہ شاعری کی بزم سے کر رہے ہیں اس لئے ان کی انقلابی آواز میں ہر جگہ شاعری کی لچک بھی ہے۔ سیماب صاحب کی غزلوں کی یہ خصوصیت، اُن کی شاعری کے ہر دور میں ان کی ہم عناں رہی ہے۔ اس مجموعہ میں بھی تڑپ اس کی کمی نہیں بلکہ جو رنگ مدتوں پہلے پختہ ہو چکا ہے وہ یہاں پختہ تر نظر آتا ہے۔

کتاب کا سرورق رنگین ہے لیکن اندر کا کاغذ "اخباری" ہے اسی لئے کتابت اور طباعت میں بھی وہ صفائی نہیں جو عموماً سیماب صاحب کی کتابوں میں ہوتی ہے۔ ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے مجموعہ کی قیمت للعہ ذرا زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

شاہجہاں

مصنف عشرت رحمانی، ناشر ساقی بکڈپو دہلی، قیمت ۱۲؍

"شاہجہاں" ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جسے عشرت صاحب نے محض پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ اسٹیج کرنے کے لئے لکھا ہے اور اسلئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زیادہ ساز و سامان کے بغیر اسے اسٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے۔ ڈرامہ کی دوسری خصوصیت اس کی بہت آسان زبان ہے۔ کرداروں کی زبان سے جو باتیں نکلی ہیں ان میں بلا وجہ خطابت کا زور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لکھنے والوں نے اپنے دل کی باتیں موقع اور محل کے مطابق بالکل اسی زبان میں کہی ہیں جو ہماری آپ کی روزمرہ زبان ہے۔ ایک تیسری خصوصیت جو اس چھوٹے سے ڈرامہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول بناتی ہے یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے ایک ایسے پہلو کو جس کی صداقت پر سیاسی مصلحتوں نے مدتوں تک پردہ ڈالے رکھا، زندگی کی شکل دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ شاہجہاں، دارا، جہاں آرا، اور اورنگ زیب کے کردار ایک مختصر سے پس منظر میں ہمارے سامنے بالکل اسی طرح آتے ہیں، جیسا تحقیق اور جستجو نے انہیں پیش کیا ہے۔ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ کتابت اور طباعت بھی بہت اچھی ہے اس لئے جہاں ایک طرف یہ ڈرامہ اسٹیج پر دکھا کر ایک مفید تفریحی اور اخلاقی مقصد پورا کر سکتا ہے۔ اچھے کتابوں کے ذخیرہ میں بھی ایک اچھا اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

لندنی دوست کے نام خطوط

مصنفہ ڈاکٹر محمد باقر، ناشر مکتبہ علم و ادب ۲۱ کچہری روڈ۔ لاہور۔ قیمت ۱؍

یہ کتاب ان چھ خطوط کا مجموعہ ہے جو باقر صاحب نے انگلستان سے واپس آنے کے بعد اپنے کسی ایسے دوست کو لکھے ہیں جو خط لکھتے وقت لندن میں ہے — جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے خطوط کا پیرایہ اختیار کرنے کا رواج ہندوستان میں بہت کم ہے۔ حالانکہ اس انداز نگارش میں لکھنے اور پڑھنے والے کے درمیان جو قریبی اور گہرا ربط پیدا ہو جاتا ہے وہ کسی اور انداز میں ممکن نہیں۔ اس لئے ان خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ انہیں پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ساری باتیں خود ہم سے کی جا رہی ہیں — لیکن اس مجموعہ کی دلچسپی یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ یہ خطوط حقیقت میں اپنے وطن سے محبت کرنے والے ایک حساس اور خوددار انسان کے سچے جذبات و احساسات کا آئینہ ہیں۔ ہر وہ آدمی جو اپنے آپ کو اس فریب سے نکال سکے جس میں نفسیاتی الجھنوں نے ہمیں مبتلا کر رکھا ہے تو اپنے گرد و پیش کی زندگی کی ایسی بھیانک حقیقتیں دیکھے گا کہ اسے زندگی سے نفرت ہو جائے۔ ہندوستانی کی زندگی میں ان بھیانک حقیقتوں کی کمی نہیں ہے — ہماری سیاست، تعلیم، معاشی و معاشرتی زندگی، تجسس، فکر اور ان سب سے بڑھ کر ہماری ذہنیت جن عوارض میں مبتلا ہے، اس کتاب میں اس کی نقاب کشائی بھی ہے اور اس پر نشتر زنی بھی۔

حسنِ تضمین

مصنفہ اختر انصاری اکبرآبادی۔ ناشر لٹریری بیگ تاج گنج، آگرہ —— قیمت ۲ روپیہ

تضمین کرنے کے فن کو اردو شاعری کی ادبی روایتوں میں ہر زمانہ میں ایک اہم چیز سمجھا گیا ہے۔ غزل کے شعر میں شاعر اپنے کسی خیال یا جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے اور اکثر اس خیال یا جذبہ کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے کہ خیال کی جو کڑیاں اس نے چھپی رکھی ہیں وہ خود بخود پڑھنے والے کے تصور کے سامنے آجاتی ہیں۔ مختلف پڑھنے والے اسے اپنے تصور کے مطابق ان چھوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر ایک مکمل تصویر بنا لیتے ہیں۔ تضمین غزل کے شعر کی مکمل تصویر کا دوسرا نام ہے۔ ایک شاعر نے جو کڑیاں سامع کے تصور کے لئے چھوڑ دی تھیں تضمین انھیں پورا کرتی ہے۔ اس لئے تضمین کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ اصل شعر پر جو مصرعے لگائے جائیں وہ ایسے ہوں کہ زبان و بیان کے علاوہ طرزِ تخیل میں بھی شعر کا ایک جزو معلوم ہوں اور پڑھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ اس شاعر نے اپنے شعر میں جو کڑیاں چھوڑ دی تھیں، انھیں اس سے بہتر طریقے سے پر نہیں کیا جا سکتا تھا جیسے کہ تضمین میں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے شعر پر تضمین کرنے کیلئے تضمین کرنے والے شاعر میں دو خصوصیتیں ہونی چاہئیں —— پہلی تو یہ کہ وہ جس شاعر کے شعر کا انتخاب تضمین کے لئے کرے اس کے شاعرانہ انداز اور خصوصیتوں سے پوری طرح واقف ہو، دوسرے اپنے طرزِ بیان پر اتنی قدرت ہو کہ وہ تضمین کے ابتدائی مصرعوں کو اسی سانچے میں ڈھال سکے جس میں اصل شعر ڈھلا ہوا ہے۔

حسنِ تضمین کے مصنف میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں۔ انھوں نے ندرت میرٹھی، حسرت موہانی، نوح ناروی، جگر مرادآبادی، بہزاد لکھنوی، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی اور بعض دوسرے شعرا کی شگفتہ غزلیں چن کر ان غزلوں کے مخصوص رنگ کے مطابق ان پر تضمین کی ہے۔ اور اس کام کو ان سارے آداب کے ساتھ پورا کیا ہے جو اس فن کا لازمہ ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کو شروع کرنے کے بعد یہی جی چاہتا ہے کہ ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

نورِ مشرق

ضیا فتح آبادی، ایم اے۔ ناشر گپتا پرنٹنگ ورکس، ۱۰ اسپلانڈ روڈ، دہلی۔

مہرلال صاحب ضیا فتح آبادی ان چند نوجوان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے شاعری میں ذوقِ نظر کے سوا اور کسی چیز کو اپنا رہبر نہیں بنایا۔ غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی انھوں نے کبھی زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ان کی نظموں کے اس مجموعے کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ ان کے ذاتی مشاہدات و محسوسات کا ترجمان ہے۔ اس میں نہ شاعری کے نئے تجربے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ قدامت کی کورانہ تقلید ہے۔ شروع سے آخر تک بس ایک چیز ہے —— اپنی ذات اور زندگی کے ساتھ خلوص۔ خارجی زندگی اور داخلی کیفیتوں کو سمو کر جو شاعری کی جائے وہ اپنے ساتھ بھی انصاف ہے اور دوسروں کے ساتھ بھی۔ نورِ مشرق اسی انصاف اور خلوص کا نمونہ ہے۔

ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسائل

مرتبہ سعید انصاری، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ صفحات ۲۲۲، قیمت ۳ روپیہ

قومی زندگی کو بہتر بنانے کا احساس جوں جوں چنگاری سے شعلہ بنتا جا رہا ہے، تعلیم اور اس کے مسائل کی طرف بھی توجہ برابر بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب ہندوستان کی تعلیم کا مسئلہ پیشِ نظر ہو تو اس بے حد اہم اور پھیلے ہوئے مسئلہ کے ان گنت شاخسانے پیدا ہوتے ہیں، ایک سے زیادہ ایک پیچیدہ اور دشوار۔ ہمارے تعلیمی مفکر ان پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرکے انھیں عمل کی کسوٹی پر کس رہے ہیں اور جو چیز کچھ دن پہلے تک واقعی دشوار تھی، وہ اب آسان ہوتی جا رہی ہے۔ سعید انصاری صاحب کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب بھی ایک دشوار سفر اور اس کی دشوار تر منزلوں کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں جن اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کے عنوان یہ ہیں:- ہندوستانی تعلیم عالمی نقطۂ نظر سے، جنگ کے بعد تعلیم کی تنظیم، بنیادی تعلیم اور اس کا فلسفہ، کل کے ہندوستان میں بالغوں کی تعلیم، ہندوستان میں استادوں کی تعلیم کا مسئلہ، استاد بننے کے لئے کیا ضروری ہے، ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور تعلیم کا تسلط، تعلیم اور جماعتی نظام، چھوٹے بچوں کی تعلیم، میونسپل تعلیم اور اس کے مسائل، مشکل بچے اور ان کی اصلاح، ذہنی جانچ اور انتخاب کا طریقہ، تعلیم میں تخلیقی نقطۂ نظر، بیسک ایجوکیشن کیا ہے —— ان مسائل پر اور ان کے علاوہ بعض دوسرے مسائل پر تعلیمی دنیا کے ان مفکروں نے لکھا ہے جن کے ہاتھوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے ہماری ملکی اور قومی تعلیم کی باگ ڈور ہے۔ اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی حیثیت سند کی سی ہے۔ ایک ایسی سند جس میں فکر، عمل اور تجربہ کا برابر کا حصہ ہے۔ اردو میں یہ اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے جو نہ صرف ہر طرح کے پڑھنے والوں کے لئے مفید ہے بلکہ بھٹکے ہوئے ذہن کو صحیح راہوں پر لگاتی ہے، اور ہندوستانی تعلیم کے تقریباً ہر اہم مسئلہ کے متعلق ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جو ہمارے ماہرینِ تعلیم کے غور و فکر اور عمل اور تجربہ کا نچوڑ ہیں۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین دہلی پرنٹنگ ورکس میں اور تصاویر بیگلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا

لال قلعہ، دہلی کا ایک منظر

Published by United Publications, Post Box 166, Delhi, India. *Reg. No. L. 4785*